سولھویں صدی کا معمارِ سلطنت

ظہیر الدین محمد بابر

ال۔ ایف۔ رش بروک ولیمز

سولہویں صدی کا معمارِ سلطنت

ظہیر الدین محمد بابر

مصنف

ال۔ ایف۔ رش بروک ولیمز

مترجم

ڈاکٹر رفعت بلگرامی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

ZAHIR-UDDIN MOHD. BABAR

An Empire Builder of the Sixteenth—Century.

By L. F. RASHBROKE WILLIAMS

پہلا اڈیشن، 1000 سنہ اشاعت : 1976 — شک 1898

دوسرا اڈیشن : 1000 1982 1904

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 22 110 0

طابع : جے کے آفسٹ پرنٹرز جامع مسجد دہلی ٦

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقاء کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقاء کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیش نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شائع کرچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اُردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائریکٹر ترقی اُردو بیورو

فہرست نقشہ جات و خاکہ جات

مندرجات

صفحہ

ابواب :

حیاتِ بابر سے متعلق مستند ماخذ کی اجمالی فہرست

(الف) ماخذِ خصوصی:

۱۔ بابر کی تصنیف "تزکِ بابری" —— ایک ترکی متن النسکی نے ۱۸۵۷ء میں، دوسرا (جو حیدرآبادی قلمی نسخے کا عکس ہے) مسز بیورج نے ۱۹۰۵ء میں شایع کیا۔ موخرالذکر غالبًا بابر کے خود نوشت متن کی براہِ راست نقل ہے۔ (ملاحظہ ہو رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا جرنل ۱۹۰۷ء، ص ۸۷)
ترکی متن کے دو خاص فارسی تراجم ہیں۔ پہلا پائندہ حسن نے کیا ہے اور دوسرا مرزا عبدالرحیم کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔
عمدہ ترین (انگریزی) تراجم تعداد میں تین ہیں۔ ارسکن اور لیڈن کا ترجمہ (۱۸۲۶ء)، جو اب کمیاب ہے، دوسرے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔ یہ پڑھنے میں نہایت عمدہ ہے —— رواں اور واضح —— لیکن تمام مقامات پر اصل متن کا دیانت دارانہ ترجمہ نہیں۔ پادے، ڈی کورٹیل کا ترجمہ (۱۸۷۱ء) النسکی کے ترکی متن پر مبنی ہے اور یہ ترجمہ جو یوروپین زبانوں کے قارئین کے لیے قابلِ حصول تھا کچھ ہی عرصہ قبل تک وہ واحد ترجمہ رہا ہے جو خود بابر کی تصنیف کردہ "تزکِ بابری" کے مطالب و اسالیب سے قریب ترین تھا۔
تیسرا اور تازہ ترین ترجمہ جو ابھی مکمل نہیں ہوا، سب سے زیادہ دیانت دارانہ ہے اور یہ ترجمہ اہم حیدرآبادی قلمی نسخے پر مبنی ہے (عرصہ ہوا یہ مکمل ہوکر شایع ہوچکا ہے۔ مترجم)۔ یہ مسز اے۔ ایس۔ بیورج کی تصنیف ہے۔ اس سے استفادہ کے لیے میں بہت

زیادہ ممنون ہوں۔

اگر "تصور بشریت" (Personal equation) کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے تب بھی "تزکِ بابری" وہ تمام تفصیلات فراہم نہیں کرتی جو بابر کی زندگی کے متعلق ضروری ہیں۔ اس میں تین اہم 'خلا' ہیں۔ پہلے میں ۱۵۰۳ء سے ۱۵۰۴ء تک، دوسرے میں ۱۵۰۸ء سے ۱۵۱۹ء تک، اور تیسرے میں ۱۵۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ شامل نہیں ہے۔ اس وجہ سے دوسری اسناد سے رجوع کرنا ہی پڑتا ہے۔

۲۔ "تاریخِ رشیدی" مولفہ مرزا حیدر دوغلت ——— اس کا صرف ایک ترجمہ ہے جو این۔ ایلیاس (الیاس Elias) اور ڈینسن راس نے کیا ہے۔ مصنف بابر کا خالہ زاد بھائی تھا اور اس کی زندگی کے 'دورِ کابل' میں بابر سے اس کا بہت قریبی تعلق رہا تھا۔ مرزا حیدر کی تصنیف "تزکِ بابری" کے خلاؤں کو پُر کرنے کے سلسلے میں خاص طور پر قیمتی ہے۔ لیکن چونکہ مصنف کٹر سُنّی تھا، اور شاہ اسماعیل اور اس کے تمام کارناموں سے سخت متنفر تھا۔ اس لیے ۱۵۱۰ء اور اس کے بعد والے سالوں میں وہ ازبکوں کی حمایت پر مائل ہے۔ یہاں اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ "حبیب السیر" مولفہ خواند میر ——— اس کے سنگی طباعت کے ایڈیشن بمبئی اور تہران میں شایع کیے گئے ہیں۔ یہ ایک عالم گیر تاریخ ہے، لیکن جلد سویم کے ابواب سویم و چہارم بابر اور شاہ اسماعیل کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں خصوصی طور پر اہم ہیں۔ اس کا مصنف ایک وسیع المعلومات معاصر تھا، جس نے بابر سے ہندوستان میں ملاقات کی تھی؛ لیکن اس نے اپنا غیر وابستہ و غیر جانب دارانہ رویّہ قایم رکھا۔ اس تصنیف کا کام ۹۲۷ھ میں شروع کیا گیا تھا اور شاید ۹۳۵ھ تک جاری رہا۔ اس کتاب سے بہت کم کام لیا گیا ہے جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ اس کا کبھی کوئی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اس کے وجود کا ارسکن کو کوئی علم نہ تھا۔

۴۔ "احسن السیر" مصنفہ مرزا برخوردار ترکمان ——— اس کا میرے علم میں صرف ایک وہ نامکمل نسخہ ہے جو رامپور (یو۔پی) کے نواب عبدالسلام خاں کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بابر اور شاہ اسماعیل کے باہمی تعلقات کا

تذکرہ کیا گیا ہے (شاہ اسماعیل کے نام ہی سے یہ کتاب معنون کی گئی تھی)۔ یہ تاریخی تصنیف قابلِ توجہ ہے کیوں کہ اس کا مصنف جو شیعہ تھا اور جس نے یہ کتاب بقول خود 'حبیب السیر' کے اغلاط کو درست کرنے کی غرض سے لکھی تھی، تمام اہم امور میں اس کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔ یہ تصنیف ۹۳۰ھ میں تمام ہوئی۔

۵۔ "شیبانی نامہ" ـــــ یہ مرزا محمد صالح کی تخلیق ہے جو بابر کے حریفِ اعظم کی منظوم تاریخ ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین اور ترجمے کا کام اے۔ ویمبری نے انجام دیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ بابر اور شیبانی کی باہمی کش مکش کا ازبیگی پہلو اس میں پیش کیا گیا ہے۔

۶۔ "عالم آرائے عباسی" مصنفہ مرزا سکندر منشی ـــــ اصلاً یہ کتاب صفوی حکمراں شاہ عباس (۱۵۸۸ ـــــ ۱۶۲۸ء) کی تاریخ ہے اور ۱۶۱۶ء میں مرتب کی گئی تھی لیکن اس میں صفوی خاندان شاہی کی ابتدا اور بابر اور شاہ اسماعیل کے باہمی تعلقات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میں نے باڈلین فریزر کے مسودات ۴۴، ۱۴۵ا، ۱۴۷ سے استفادہ کیا ہے۔

۷۔ "ہمایوں نامہ" از گلبدن بیگم بنت بابر ـــــ اس میں اپنے والد کے متعلق خاتون مصنفہ کی چند ذاتی اور گہری یادوں کے نقوش شامل ہیں۔ لیکن یہ پورا تذکرہ انتہائی جانب دارانہ ہے اور ان مقامات پر ناقابلِ اعتماد بھی ہے جہاں بابر اور اس کے لڑکوں کے باہمی تعلقات کو ایک بہترین ممکن شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تہذیب و ترتیب مسز بیورج نے نہایت خوش اسلوبی سے کی ہے۔

(ب) معمولی ماخذ:

۸۔ "تاریخ حقی" مصنفہ شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی ـــــ لودی خاندان شاہی کے دورِ حکومت کے سلسلے میں مفید ہے۔ شاہ بہلول اور اس کے جانشینوں کے عہدِ سلطنت کا جو حال اس میں مصنف پیش کرتا ہے اس کا علم اس کو یا تو خود عینی شاہدوں سے ہوا ہے یا سماعی روایات سے ـــــ میں نے جس متن سے کام لیا ہے وہ باڈلین فریزر کا مسودہ ۱۶۲ ہے۔

۹۔ "احسن التواریخ" مصنفہ حسن ـــــ یہ کتاب شاہ اسماعیل اور شاہ طہماسپ کے

عہد حکمرانی کا ایک تاریخی تذکرہ ہے اور ۹۰۰ھ سے ۹۸۵ھ تک کے زمانے پر محیط ہے۔ لیکن میری نظر سے جو نسخے گزرے ہیں اُن میں (۹۱۳ھ سے ۹۳۱ھ تک) ایک افسوس ناک خلا موجود ہے جس کے باعث تاریخ بابر کے ایک ماخذ کی حیثیت سے یہ کتاب اپنی بہت کچھ قیمت سے محروم ہوگئی ہے۔ میں نے باڈلین اوسلے کا مسودہ ۲۳۲ استعمال کیا ہے۔

۱۰۔ "تاریخ فرشتہ" مصنفہ محمد بن قاسم ——— تزک بابری کے خلاؤں کو پُر کرنے کے سلسلے میں یہ کتاب کارآمد ہے۔ اس میں بابر کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ کتاب کے باقی حصے کی طرح معقول و متوازن اور واضح جزئیات کا حامل ہے۔ اس کا سب سے زیادہ قابلِ حصول نسخہ برگس کا ترجمہ ہے جس کی طباعت ثانی کلکتہ میں ہوئی ہے لیکن یہ شروع سے آخر تک دیانت دارانہ ترجمہ نہیں ہے۔

۱۱۔ "طبقاتِ اکبری" مصنفہ نظام الدین احمد ——— یہ کتاب مسلمانوں کے حملوں سے لے کر سولھویں صدی کے اواخر تک کے زمانے سے متعلق ہندوستان کی ایک اچھی عمومی تاریخ ہے۔ اس میں بابر کا ایک مختصر مگر عمدہ تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ میں نے باڈلین ایلیٹ کے مسودہ ۳۸۱ سے استفادہ کیا ہے۔

۱۲۔ "اکبرنامہ" مصنفہ ابوالفضل ——— اس میں بابر سے متعلق ایک تمہیدی باب شامل ہے جو خاص طور پر تزکِ بابری پر مبنی ہے لیکن مدح و ستائش سے اس قدر لبریز ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال یہ کتاب اس قابل ہے کہ موقع بہ موقع اس سے رجوع کیا جاسکے اور اس کا ببلیوتھیکا انڈیکا ایڈیشن آسانی سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ اس کا ترجمہ مسٹر ایچ۔ بیوریج کر رہے ہیں۔

(ج) جدید تصانیف:

۱۳۔ "اے ہسٹری آف انڈیا اِن دی ٹائم آف بابر اینڈ ہمایوں" ——— (۱۸۵۴ء) ——— مصنفہ ارسکن ——— یہ ایک نفیس اور عالمانہ تصنیف ہے ——— ہندوستانی اور ایرانی نقطہ نظر سے یکساں طور پر بہت عمدہ ہے ——— اس میں جس ٹھوس علمیت اور صحیح وصحت مند قوت فیصلہ کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اس کی وجہ سے آیندہ کسی بھی

تصنیف کا اس پر سبقت لے جانا ہمیشہ دشوار ہی رہے گا۔ لیکن مصنف نے چند اہم ماخذ خصوصاً نمبر ۳، ۴، ۵، ۷ اور ۹ سے کوئی فایدہ نہیں اٹھایا جس کے باعث بعض معاملات میں اس کے نتائج نظرِثانی کے محتاج ہیں۔

۱۴۔ "بابر" (رولرس آف انڈیا) مصنفہ لین پول ـــــ یہ بابر کی زندگی کا بہترین مختصر تذکرہ ہے جو آج کل دستیاب ہے۔ لیکن اس کی تشکیل کلی طور پر مترجم ماخذ کی بنیاد پر ہوئی ہے اور مصنف نے ماخذ نمبر ۱۳، ۲ اور ۱ (پاوے ڈی کورٹ لیز کے ترجمہ) پر تکیہ کیا ہے۔

۱۵۔ "لائف آف بابر" مصنفہ کیلڈی کاٹ ـــــ یہ بابر کے حالات زندگی کا ایک خلاصہ ہے۔ قابلِ مطالعہ ہے اور بیشتر "تزک بابری" پر مبنی ہے۔

دیگر تصانیف کے لیے قارئین اُن حوالہ جات کی طرف توجہ فرمائیں جو صفحات کے ذیل میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں پوری تفصیلات مل جائیں گی۔

تعارف

ہندوستان کی تاریخ میں بابر کا مقام ــــــ مغلیہ حملے سے عین پہلے ہندوستانی سیاسیات کا ایک مختصر جائزہ۔

تاریخ قرون وسطیٰ کے پورے عہد میں شاید کوئی دور ایسا نہیں جس سے ہمارے سیاسی آداب و شایستگی کے جدید احساس کو اتنا شدید صدمہ پہنچے جتنا پندرھویں صدی عیسوی کے سو سال سے لگتا ہے۔ مشرق اور مغرب میں یکساں طور پر چودھویں صدی کا زمانہ ایک قبل از وقت لیکن امید افزا نشو و نما کا دور تھا۔ ہر طرف پختہ مرتکز بادشاہتیں ابھر آئی تھیں جو اپنی پوری خارجی ہیبت میں طاقتور معلوم ہوتی تھیں اور ایسا نظر آتا تھا کہ معاشرتی و سیاسی حالات کی اصلاح میں وہ ایک اہم حصّہ لینے کو تیار ہیں۔ مغرب کی تہذیب میں عوام کے وسطی طبقات اقتدار میں ایک حصّہ طلب کرنے اور حاصل کرنے لگے تھے ــــــ مشرق میں طاقتور مطلق العنان بادشاہ پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے تجارت کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ تمام اطراف میں اپنی مملکتوں کی توسیع کی تھی۔ امن و امان قایم رکھا تھا اور شورش کو جابرانہ ہاتھوں سے دبا دیا تھا ــــــ لیکن اس اچانک اور قبل از وقت بالیدگی کے بعد ایک دور انحطاط شروع ہو گیا جو اور بھی زیادہ وحشت ناک حد تک تیز رفتار تھا۔ وہ سیاسی وحدتیں جو پہلے اس درجہ محکم نظر آتی تھیں اب وحدت کے تمام لوازم سے عاری ثابت ہوتی ہیں۔ وہ مطلق العنان مرتکز بادشاہتیں جو پہلے اس قدر طاقتور معلوم ہوتی تھیں اب درہم برہم ہو کر

متغایر اجزا کے معذور انبار بن جاتی ہیں۔ اور جو شورش پسند عناصر بظاہر ملک بدر کر دیے گئے تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ مہیب قوتوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ مشرق اور مغرب میں یکساں طور پر پندرھویں صدی ایک بے مثال انتشار کا زمانہ ہے ——— ایک عصرِ غیر معقول و بے ہست ——— یک جہتی و استحکام کے عناصر سے یکساں طور پر محروم ——— سیاسی معاشرے کی کایا پلٹ ہوتی نظر آتی ہے ——— تاریخ پہلی نظر میں " جنگ زاغ و زغن، کے پست و حقیر روپ میں نظر آتی ہے۔ اور ایک سرسری مبصّر کو جماعتوں، فرقوں اور ریاستوں کی اس حیران کن ابتری کے اسباب کا کوئی سراغ دریافت کرنے سے مایوسی ہو جاتی ہے۔

لیکن ایک زیادہ گہرا مشاہدہ ایسے تاثر کے بطلان کا بڑی تفصیل سے انکشاف دیتا ہے۔ یہ انتشار بظاہر حیران کن ہونے کے باوجود در حقیقت حالات کا محض ایک سطحی تموج ہے جو اُن بعید تر گہرائیوں کو تقریباً غیر متاثر چھوڑ کر گزر جاتا ہے جہاں معاشرے کے اہم ترین حیاتی اجزائے ترکیبی پوشیدہ پڑے رہتے ہیں۔ اس تمام ظاہری امثال کی تہہ میں وہ عناصر جن سے مستقبل کے جدید سیاسی معاشرے کو تعمیر ہونا ہے آہستہ آہستہ تشکیل پلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لمحہ آجاتا ہے جب وہ غالب و ناقابلِ تردید بن کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ سولھویں صدی عیسوی کی امتیازی خصوصیت ہے کہ مشرق اور مغرب میں یکساں طور پر تشکیلِ نو کا عمل شروع ہوا۔ لیکن یہ تبدیلی ایک رحمتِ بے زحمت نہ تھی ——— پندرھویں صدی، اپنی تمام تر ابتری و فرومائیگی کے باوجود ایک ایسا عہد رہی تھی جس میں تمام فنونِ حیات کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کے چھوٹے درباروں میں ——— خواہ وہ یورپ کے ہوں یا ہندوستان کے ——— فنِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ بعض خاص سمتوں میں ترقی پاکر اس منتہائے کمال کو پہنچ گئے تھے کہ بعد کا کوئی بھی عہد اس سے برتری تو کیا اس کی ہمسری بھی حاصل نہیں کرسکا ہے۔ سولھویں صدی، جو جامع منصوبوں اور دور رس عزایم کا دور تھی، متعدد لحاظ سے سخت تر اور کم انسان دوست تھی۔ اس کے خطوط زیادہ پُرقوت و جلی ہیں اور اس لیے یہ نقش بہ یک وقت اس نزاکت اور جزئیات کی باریکی سے محروم ہے جو اس سے قبل کے عہد کی زیادہ تفصیلی اور کم واضح تصویر کا طرۂ امتیاز ہیں۔

اس طرح سولھویں صدی کا ابتدائی زمانہ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک عبوری دور ہے اور اس مقصد کے لیے کہ یہ قابلِ فہم بن سکے یہ ضروری ہے کہ اس پر

اُن حالات کی روشنی میں نظر ڈالی جائے جن کے خمیر سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔

چودھویں صدی کے ابتدائی نصف میں خلجیوں اور تغلقوں کی فوجیں سلطنتِ دہلی کے پرچم دور دور تک پہونچا چکی تھیں۔ سندھ سے خلیج بنگال تک اور ہمالیہ سے کرشنا تک خاندانِ سلاطینِ دہلی کی حکمرانی تھی۔ مستند حقایق کے علی الرغم یہ دعوا نہیں کیا جاسکتا کہ ہر زمانے میں یہ اقتدار موثر تھا۔ دُور افتادہ اضلاع میں متواتر رونما ہونے والی بغاوتیں جو ایک بادشاہ کے دورِ حکومت کو اکثر و بیشتر ایک لامتناہی و مسلسل لشکرکشی کی شکل میں تبدیل کردیتی ہیں، اس امر کی مظہر ہیں، کہ یہ مطلق العنان حکمران خود اپنے گھر کے بھی مالک نہ تھے۔ تاہم اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ علاوالدین اور محمد بن تغلق اپنی مملکتوں پر ایسا اقتدار رکھتے تھے جو عمومی طور پر موثر تھا۔

چودھویں صدی کے نصف آخر میں تصویر رفتہ رفتہ بدلتی ہے۔ جیسے جیسے بار سلطنت کے تناسب سے مرکزی قوت میں ضعف پیدا ہوتا جاتا ہے، دُور افتادہ صوبے ایک ایک کر کے پریشان کن بنتے جاتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں واقعات ایک ہی راہ اختیار کرتے ہیں۔ بادشاہِ وقت کا کوئی معتمد ملازم شورش کو دبانے کے لیے بھیجا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ خود کو ایک مکمل صوبے کا مالک پاتا ہے —— مقامی مفادات سے وابستہ —— دربار دہلی سے منقطع —— بعض اوقات اس کو دوبارہ زیرِ اطاعت لانے کی کوشش کی جاتی ہے جو ناکام ہوجاتی ہے لیکن بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ موت یا سازش اس کے قدیم آقا کو راہ سے ہٹادیتی ہے اور تختِ دہلی پر ایک ایسے "عزیزِ مصر" کو بٹھادیتی ہے جو "یوسف کنعاں" کو نہیں جانتا، جس کے بعد بہرصورت نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سردار غیر محسوس طور پر ایک آزاد مطلق العنان حکمران بن جاتا ہے —— اور اس طرح یہ ہوا کہ دہلی اپنے سابقہ وجود کا محض ایک سایہ بن کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ ۱۳۹۸ء میں تیمور کے حملے نے اس بوسیدہ عمارت کو زمیں بوس کر ڈالا اور اس کے خاتمے کو بالکل ہی غیر مستحق طور پر ایک المیہ کا وقار عطا کردیا۔ اس طرح پندرھویں صدی میں ہندوستان کی کوئی تاریخ ہے ہی نہیں، کیوں کہ ہندوستان جداگانہ ریاستوں کا ایک انبار بن چکا ہے۔ بایں ہمہ ان ریاستوں کی تاریخ بجا طور پر توجہ کی مستحق ہے، کیوں کہ یہی اس ملبے کے ڈھانچے تھے جس سے اگلی صدی کا تعمیری کام جاری رہنا تھا۔

اگر ہم پندرھویں صدی کے وسطی دس سال میں کھڑے ہو کر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے

ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں چار واضح زمروں میں منقسم ہیں۔ سب سے اوّل وہ علاقہ ہے جسے "مسلم طاقتوں کا شمالی حلقہ" کہا جاسکتا ہے جو ایک عظیم نیم دائرے کی شکل میں سندھ کے دہانے سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ جنوبی سرے سے ہمیں سندھ کی سلطنت ملتی ہے، اس سے ذرا شمال میں ملتان کی سلطنت اور بعدہٗ پنجاب جو کہ برائے نام دہلی کی ایک نائب شاہی ہے مگر درحقیقت تین طاقتور افغان خاندانوں کا مامن ہے۔ اس کے بعد خود دہلی اور اس کا مین نواحی علاقہ آتا ہے جس کے حکمراں اپنے دعووں کی بنا پر دور دور تک تضحیک کا نشانہ بننے کے باوجود ابھی تک شہنشاہانِ ہندوستان ہونے کے مدعی ہیں[1]۔ جنوب اور مشرق کی سمت شرقی شاہی خاندان کا دارالخلافہ جونپور واقع ہے جس کی حکومت اُس علاقے کے بیشتر حصّے پر ہے جو آگرہ و اودھ کے موجودہ صوبہ جات پر مشتمل ہے۔ اس کے بھی آگے مشرق میں بنگال کی سلطنت ہے جو کہ اپنی زندگی الگ تھلگ گزار رہی ہے اور ہندوستان کی سریع الزوال سیاسیات میں محض تھوڑا سا حصّہ لے رہی ہے۔ دوسرے زمرے کو "جنوبی مسلم حلقہ" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے مغرب کی سمت گجرات ہے جو کہ ایک بہت واضح جغرافیائی وحدت ہے۔ مشرق میں اور آگے مالوہ ہے جس کی راجدھانی مانڈو ہے۔ مالوہ کے جنوب میں خاندیش کی چھوٹی سی سلطنت ہے اور خاندیش کے جنوب میں دکن کی عظیم مملکت ہے جس پر بہمنی خاندان کی حکومت ہے۔ مسلم ریاستوں کے شمالی وجنوبی حلقوں کے درمیان پھنسا ہوا راجپوتانہ ہے جو صدیوں کی استیصالی جنگ و جدل کے بعد بھی لافانی و ناقابلِ تسخیر نظر آتا ہے اور اسلام کی سیاسیات میں پیدا ہونے والے تفرقات سے فائدہ اُٹھا کر اپنی قدیم طاقت کا کچھ حصّہ سرعت کے ساتھ دوبارہ حاصل کر رہا ہے۔ اس کی زیادہ قابلِ توجہ ریاستیں ہیں مارواڑ اور میواڑ اور ان میں میواڑ سب سے برتر ہے جو کہ اب بہت سرعت سے ایک صفِ اول کی طاقت بنتا جارہا ہے۔ جنوبی مسلم حلقے کے جنوب میں ایک اور عظیم ہندو طاقت سلطنت وجے نگر واقع ہے۔ اور پندرھویں صدی کے دوران جنوبی ہندوستان کی بیشتر تاریخ اس سلطنت کے اپنے شمالی ہمسایوں کے خلاف

---

[1] یہ ایک معاصرانہ فارسی مقولہ تھا کہ "پادشاہیِ شاہ عالم، از دہلی تا پالم" یعنی شاہ عالم کی سلطنت دہلی سے پالم تک پھیلی ہوئی ہے۔ پالم دہلی سے نزدیک ہی ایک گاؤں ہے۔

ہندوستان — پندرھویں صدی میں

انگریزی میل

0 50 100 200 300 400

بنگال

خلیج بنگال

بحر عرب

طول البلد مشرقی 80 گرین وچ
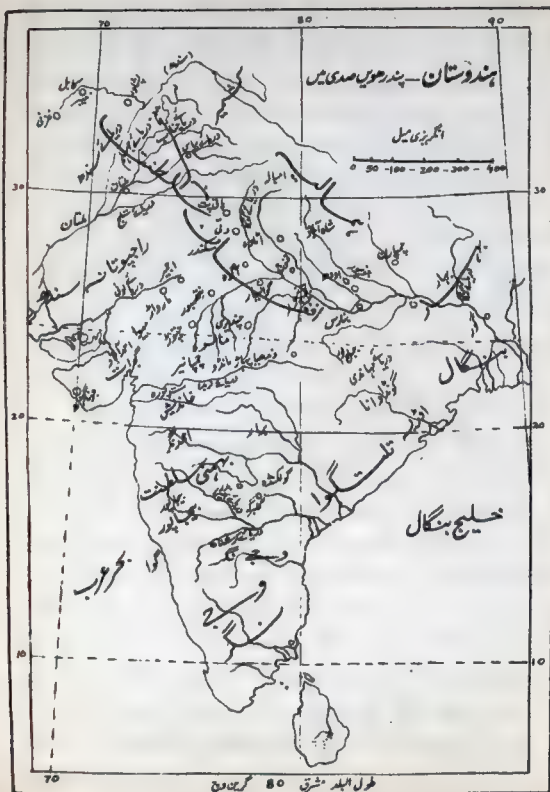
جنگ و جدل پر مشتمل ہے۔ مشرق کی طرف اڑیسہ کی ہندو سلطنت واقع ہے جو سیاسی طور سے توغیراہم ہے لیکن جنوب کی طرف بنگال کی توسیع میں کم و بیش موثر طور پر سدِ راہ ہے۔ جنوب بعید کی ریاستوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ ہندوستان خاص سے اتنی دور ہیں کہ اس علاقے کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے میں ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا بطور اختصار پندرھویں صدی کے وسط میں سیاسی طاقتوں کی تقسیم اس طرح پر ہے۔ مسلمان طاقتوں کے دو گروہ ہیں اور ہر گروہ جنوب کی طرف سے ایک زبردست ہندو ریاست سے خطرے میں ہے۔ میرا ارادہ ممکنہ اختصار کے ساتھ ہر ریاست کی نشو و نما کا خاکہ پیش کرنا ہے تاکہ ہم اپنے جائزے کے اختتام پر ان سیاسی قوتوں کا کچھ اندازہ کرسکیں جن کی سولھویں صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان میں اہمیت تھی۔ میرے خیال میں ہمارے لیے اس میں سب سے زیادہ سہولت ہوگی کہ اپنا کام جنوب سے شروع کرکے اوپر شمال کی طرف بڑھتے چلے جائیں اور آخرکار اپنی حاصل کردہ معلومات کو ایک واحد مرکزی نقطہ یعنی دہلی کی افغان سلطنت پر مرکوز کریں۔

وجے نگر کی عظیم ہندو سلطنت کا آغاز بڑی تاریکی میں ہے۔ یقیناً یہ اسی انتشار کا پیدا وار ہے جس میں محمد بن تغلق کے ہیبت ناک حملوں نے جنوب کی قدرے انحطاط پذیر ہندو ریاستوں کو مبتلا کردیا تھا۔ اسلامی قوتوں کے مقابلے میں کوئی جدید سیاسی اتحاد قایم کرنے کی ضرورت اچانک محسوس کرتے ہوئے بکّا اور ہری ہر نے جو حالیہ تباہ شدہ ہوئیسل راجیہ کے دو کناری جاگیردار تھے، متعدد قدیم سلطنتوں کے کھنڈروں پر ایک نئی سلطنت تعمیر کرلی۔ ان دو حکمرانوں کی شخصیت کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ یہ لازمی ہے کہ دونوں ہی سیاسی بصیرت کے مالک طاقتور انسان ہوں گے، کیوں کہ ان کی سلطنت حیرت انگیز سرعت سے ترقی پذیر ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ بکّا نے ۱۳۴۳ء سے ۱۳۶۷ء تک اور اس کے بھائی نے ۱۳۶۷ء سے ۱۳۹۱ء تک حکومت کی۔ ہری ہر کی موت کے نصف صدی بعد، ایک عرب سفیر مسمّی عبدالرزّاق اس سلطنت میں آیا جس نے اپنی کتاب "مطلع السعدین" میں اس (سلطنت) کی طاقت و خوش حالی کا ایک موثر تذکرہ چھوڑا ہے۔ اسی کے تذکرے سے مندرجہ ذیل اقتباسات لیے گئے ہیں:

"ہمارے بیان سابقہ اور تذکرہ خوش اسلوب سے قارئین باوقوف کو معلوم ہوگیا

ہوگا کہ مصنف عبدالرزاق شہر وجے نگر میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک نہایت بڑا اور گنجان آباد شہر اور ایک عظیم طاقت و مملکت کا فرمانروا دیکھا، جس کی سلطنت سرندیپ کی سرحدوں سے گلبرگہ تک اور بنگال سے مالابار تک ایک ہزار فرسنگ سے زیادہ علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ملک کا بیشتر حصہ زرخیز ہے۔ کھیتی خوب ہوتی ہے اور تقریباً تین سو عمدہ بندرگاہیں اُس کی ملکیت ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ ہاتھی ہیں، پہاڑوں کی طرح اونچے اور عفریتوں کی طرح عظیم الجثہ ـــــ فوج گیارہ لاکھ آدمیوں پر مشتمل ہے۔ تمام ہندوستان میں کوئی 'رائے' اس سے زیادہ مطلق العنان نہیں۔ رائے وہ لقب ہے جس سے اُس ملک کے راجہ متصف کیے جاتے ہیں۔

"وجے نگر کا شہر ایسا ہے کہ نہ تو آنکھوں نے اس طرح کا کوئی مقام پورے روئے زمین پر دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا۔ یہ اس طرح تعمیر ہوا ہے کہ یکے بعد دیگرے اس میں سات مضبوط حصار ہیں۔ بیرونی حصار کے حلقے کے بعد پچاس گز تک ایک مسطح میدان چلا گیا ہے، جس میں قدِ آدم اونچائی تک نزدیک نزدیک پتھر نصب ہیں۔ نصف حصہ زمین کے اندر مضبوطی سے گڑا ہوا ہے اور باقی نصف زمین کے اوپر اُٹھا ہوا ہے۔ اس وجہ سے کوئی پیدل یا سوار خواہ وہ کتنا ہی نڈر کیوں نہ ہو، بیرونی فصیل کے قریب آسانی سے قدم نہیں بڑھا سکتا۔"

"قلعہ ایک دائرے کی شکل میں ہے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے پتھر اور چونا مٹی کا بنا ہے۔ اس میں مضبوط پھاٹک ہیں۔ جہاں ہمیشہ پہرے دار مامور رہتے ہیں اور محاصل (جزیات) کی وصول یابی میں بڑی سرگرمی و محنت سے کام لیتے ہیں۔

"ساتواں قلعہ دیگر قلعہ جات کے مرکز میں ہے اور ہرات کے خاص بازار سے دس گنا رقبے پر محیط ہے۔ اسی کے اندر راجہ کا محل واقع ہے۔ بیرونی قلعہ کے شمالی پھاٹک سے جنوبی پھاٹک تک دو آئینی فرسنگ کا فاصلہ ہے اور اتنا ہی فاصلہ مشرقی و مغربی پھاٹکوں کے درمیان ہے۔ پہلی، دوسری اور تیسری فصیلوں کے درمیان مزروعہ کھیت، باغات اور مکانات ہیں۔ تیسرے سے ساتویں قلعے تک

بہت گنجان دکانیں اور بازار ہیں۔ شاہی محل کے نزدیک ایک دوسرے کے مقابل
چار بازار واقع ہیں۔ شمال کی طرف (والا) قصرِ شاہی یا رائے کی رہائش گاہ ہے۔ ہر
بازار کے اوپر ایک بلند محرابی چھت اور شاندار غلام گردش ہے لیکن قصرِ شاہی سب
سے بلند و بالا ہے۔ بازار بہت کشادہ و طویل ہیں، جس کی بدولت گل فروش اپنی
دکانوں کے سامنے اونچی اونچی چوکیاں رکھنے کے باوجود دونوں جانب سے پھول
بیچ سکتے ہیں۔ اس شہر میں خوشبودار پھول ہمیشہ تازہ دستیاب رہتے ہیں اور
بقائے حیات کی ایک ضرورت سمجھے جاتے ہیں، کیوں کہ یہ مشاہدہ ہے کہ لوگ ان
کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ ہر جداگانہ برادری یا پیشے کے تاجرین اپنی دکانیں
قریب قریب رکھتے ہیں۔ جوہری اپنے یاقوت، ہیرے، موتی اور زمرّد کھلے بازار
میں بیچتے ہیں۔

یہ ملک اتنا اچھا آباد ہے کہ ایک معقول وسعت میں اس کا کوئی تصور پیش کرنا
ناممکن ہے۔ شاہی خزانے میں تہہ خانہ دار بڑے کمرے ہیں جو پگھلے ہوئے سونے
کے ڈھیروں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس ملک کے تمام باشندے ——— خواہ
اعلا ہوں یا ادنا ——— حتیٰ کہ بازاری دست کار بھی جواہرات اور ملمع کے زیورات
کانوں، گلوں، بازوؤں، کلائیوں اور انگلیوں میں پہنتے ہیں۔[46]

لیکن سوال یہ ہوسکتا ہے کہ پندرھویں صدی میں ہندوستان کے لیے ایک اتنی دور افتادہ
سلطنت کی سیاسی اہمیت کیا ہوسکتی ہے؟ مختصر طور پر اس کا جواب یہ ہے ——— رایانِ وجے نگر
اُن ریاستوں کے ساتھ جن کو مجموعی طور پر میں نے "جنوبی مسلم حلقہ" قرار دیا ہے ایک مستقل کش مکش
میں مصروف تھے۔ اُن کے وسایل کو کمزور کر رہے تھے، ان کے اتحادات میں خلل انداز ہو رہے
تھے، اُن کی سلامتی کے لیے خطرات پیدا کر رہے تھے اور اس طرح اُن میں سے کسی ایک کو دوسروں
پر ایسی برتری و بالادستی حاصل کرنے سے موثر طریقے پر روک رہے تھے جس کے باعث راجپوتانہ
پر اس کے جنوبی دشمنوں کے ایک متحدہ حملے کا راستہ کھل جاتا۔ یہی ہے پندرھویں صدی کے
دوران وجے نگر کا سیاسی اثر ——— اور یہی کچھ ایک کمتر درجے میں اس سے بہت کم اہمیت والی

---

[46] ایلیٹ و ڈاؤسن، چہارم، ص ۱۰۶-۱۰۷

ہمشیر ریاست اڑیسہ کے لیے کہا جاسکتا ہے۔

یہاں سے ہم مسلم طاقتوں کے جنوبی حلقے پر پہنچ جاتے ہیں اور اس میں سب سے پہلے دکن کی عظیم بہمنی سلطنت ملتی ہے۔ اس زمانے کی تمام مسلم سلطنتوں کی طرح یہ بھی دہلی کے خلاف ایک کامیاب بغاوت سے وجود میں آئی۔ دکنی صوبے جب پریشان کن ہو گئے تو ایک درباری مقرب مسمیّ ظفر خاں بہمنی کو ان کو قابو میں لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اپنا یہ کام حسب منشا پا کر اس نے علاءالدین کے لقب کے تحت ۱۳۴۷ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ۱۳۵۸ء میں اپنی وفات کے وقت تک وہ خوش حالی کے ساتھ ایک وسیع مملکت پر حکمرانی کرتا رہا جو کہ شمال میں برار سے، جنوب میں دریائے کرشنا تک اور مغرب میں سمندر سے، مشرق میں اندور تک پھیلی ہوئی تھی[1]۔ اس کا بیٹا محمد جو اس کا جانشین ہوا، ایک زبردست شجاع انسان تھا، جس کو اپنے طاقتور ہمسایہ وجے نگر کے ساتھ زور آزمائیوں میں اپنے فطری جنگی رجحانات کے لیے کافی وسیع میدان مل گیا۔ کچھ عرصے تک دونوں سلطنتوں میں برابر کا مقابلہ رہا لیکن مسلمان مورّخین کی جانب داری کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ بہمنی سلطنت کی توسیع موثر طور پر روک دی گئی جس کے باعث بعد والے حکمرانوں نے خود کو زیادہ خصوصیت کے ساتھ فنونِ امن کے لیے طوعاً کرہاً وقف کر دیا۔ ان حکمرانوں میں سب سے نمایاں فیروز شاہ (۱۳۹۷ء - ۱۴۲۲ء) تھا جس کو "اکبرِ دکن" کہا جا سکتا ہے۔ وہ اعلا صلاحیتوں کا مالک،

---

[1] اگر ظفر خاں کے متعلق اُن روایات کی تعداد سے اندازہ لگایا جائے جو گمنامی سے لے کر ناموری تک اس کے عروج کا حال بتاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے زمانے کے لوگوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ سب سے مقبول کہانی یہ ہے: نوجوانی میں وہ ایک برہمن مسمیّ گنگا کا ملازم تھا، اپنے آقا کا کھیت جوتتے ہوئے اس نوجوان کو سونے کے سکوں سے بھرا گھڑا ملا جو اُس نے فوراً اپنے مالک کے حوالے کر دیا۔ ملازم کی ایمان داری سے متاثر ہو کر گنگا نے اُس کا جنم پترا بنایا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بڑے بڑے کام انجام دے گا اُسے اپنے بیٹوں کے ساتھ تعلیم دلوائی۔ جب مناسب موقعہ آیا تو اس نوجوان کو دہلی لے جایا گیا، جہاں اس نے تیزی سے مقبولیت و سرفرازی حاصل کر لی۔ کہانی کے مطابق ظفر خاں نے اپنے بوڑھے آقا کا ممنون احسان ہو کر 'بہمنی' کو اپنے نام کا جزو بنا لیا۔

اپنے مذہب میں آزاد خیال اور ایک عظیم معمار تھا جس کی شہادت اس کے دار السلطنت گلبرگہ کے کھنڈر اب تک دیتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کے عہد زریں کا ایک مخیّر فرمانروا تھا[1]
لیکن بہمنی سلطنت کی شاید سب سے نمایاں چیز وہ عدم تناسب ہے جو اس کے وسیع حدود و وسائل اور اس کی معمولی سیاسی اہمیت کے درمیان موجود تھا۔ اس کی وضاحت پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔ اگر وجے نگر کے متعارض اثرات کارفرما نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ بہمنی سلطنت تمام تر ہندوستان پر مشتمل ایک جدید مسلم مملکت کا مرکز ثابت ہوتی۔ لیکن جیسا کہ ہونا ہی تھا اس کی قوت کا تیزی سے زوال شروع ہوگیا۔ خانوادہ شاہی انحطاط پذیر ہونے لگا۔ ۱۴۵۰ء کے بعد سے اس وسیع سلطنت کا شیرازہ صرف نامور محمود گاواں کی قابلیت و توانائی کی وجہ سے قایم رہا، جس کی ہمت، دیانت اور روشن دماغی ایک ضرب المثل بن گئی۔ ۱۴۸۱ء میں اس کی غیر منصفانہ سزائے موت کے بعد[2] سلطنت رفتہ رفتہ متعدد خود مختار ریاستوں میں بٹ گئی، جن میں سب سے زیادہ اہم برار (۱۴۸۴ء — ۱۵۲۷ء)، احمد نگر (۱۴۸۹ء — ۱۶۳۳ء)، بیجا پور (۱۴۸۹ — ۱۶۸۶) اور گول کنڈہ (۱۵۱۲ — ۱۶۸۷) تھیں۔ سلطنتوں کے اس عددی اضافے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی کے آغاز پر وسطی ہندوستان میں مسلم اقتدار میں ایک سنگین تخفیف پیدا ہوگئی۔

بہمنی قلمرو کے شمال میں خاندیش کی چھوٹی سی نسبتاً غیر اہم سلطنت واقع تھی جس کا

---

[1] کہا جاتا ہے کہ شراب و عورت کے معاملے میں اس کا ذوق حد درجہ بڑھا ہوا تھا۔ خاص طور سے موخر الذکر معاملے میں — مشہور تھا کہ اس کے حرم میں ہر معلوم قوم کی خواتین شامل تھیں — مشرقی بھی اور مغربی بھی — اور بادشاہ کا فخریہ دعوا تھا کہ وہ ہر ایک حسینہ سے اس کی ہی زبان میں بات چیت کر سکتا ہے۔

[2] اس راست باز وزیر کے خلاف جھوٹا الزام اور اس کی غیر طبعی موت ہندوستان کے دور وسطیٰ کا ایک المیہ ہے، اس کے دشمنوں نے اس کی مہر کے ساتھ ایک جعلی خط تیار کیا، جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ اڑیسہ کے راجہ کو سلطنت پر حملے کی دعوت دی جا رہی ہے — اس عدالتی قتل کی یادگار قایم کرنے کے لیے دو مشہور تاریخیں کہی گئی ہیں — "قتل ناحق" اور "بے گناہ، محمود شہید شد"۔

وجود اس دن سے ہوا جب فیروز بن تغلق نے ملک راجہ فرقی کو[ط] کہسارِ ست پڑا اور حدب دکن کے درمیانی علاقے کا حاکم مقرر کیا۔ ملک راجہ نے کچھ ہی عرصے بعد اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور اپنی موت کے وقت تک (۱۳۹۹ء) اپنی چھوٹی سی قلمرو پر دانش مندی و خوش اسلوبی سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے جانشین ملک ناصر نے دکن کی لڑائیوں میں مداخلت کی کوشش کی لیکن جیسا کہ اس کے وسائل کی قلت سے توقع کی جاسکتی تھی، اس کی کامیابی غیر اہم اور فضول قسم کی ثابت ہوئی۔ آخری قابلِ نظر فرمانروا عادل خاں فرقی (۱۴۵۷-۱۵۰۳) کے تحت ملکی تہذیب و تمدن میں بہت ترقی ہوئی۔ کمخواب و زربفت اور عمدہ ململ کی تیاری جو کہ آج بھی وہاں کی خاص صنعتیں ہیں، سرکاری حوصلہ افزائی کے تحت ملک میں شروع کی گئی۔ کچھ عرصے تک یہ چھوٹی سی سلطنت خود اپنی عدمِ اہمیت کے زیرِ حفاظت ایک سیاسی وجود کی حیثیت سے لشتم پشتم زندگی گزارتی رہی، یہاں تک کہ آخر کار اکبر کے زمانے میں اس کا اختتام ہوگیا۔ پندرھویں صدی کے اٹلی کی چھوٹی ریاستوں کی طرح یہ بہت کچھ ایک پُرسکوت خوش حالی کا گھر تھی۔ اس کی سیاسی اہمیت بہت کم ہے، لیکن یہ اس امر کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے کہ اُن حالات میں جو فنونِ سیاست کے مشاغل کو روکتے ہیں، کس طرح زندگی کی آسائشیں فروغ پاسکتی ہیں۔

خاندیش کے شمال میں مالوہ کی سلطنت واقع تھی۔ پہلے تو یہاں ایک مقامی

[ط] شاہی مہر و کرم سے سرفراز ہونے کے متعلق اس شخص کی داستان جس طرح عوامی روایت میں بیان کی گئی ہے وہ خواہ غلط ہو یا صحیح بہرحال معاصرانہ طریق کا ایک نمونہ ہے۔ ایک مرتبہ شکاری مہم کے دوران، سلطان فیروز نے خود کو اپنے خدم و حشم سے جدا پایا۔ وہ ایک ایسے مقام پر آنکلا جہاں ایک تنہا شکاری آگ روشن کیے ہوئے تھا۔ شکاری نے اُسے طعام میں شرکت کی دعوت دی جو تیار ہو رہا تھا۔ کھانا اتنا مزے دار تھا کہ سلطان نے اپنی اصلیت کا انکشاف کرتے ہوئے فوراً اس اجنبی کو اپنی خدمت میں لے لیا۔ اس دن کے بعد سے ملک کی ترقی اتنی سرعت سے ہوئی کہ اُسے 'فرقی' (یعنی خوش قسمت) کا نام دیا گیا اور یہی نام اس نے اس شاہی خاندان کی طرف منتقل کر دیا جس کی اُس نے بنیاد ڈالی۔

راجپوت خاندان کی حکومت تھی لیکن ۱۳۰۴ء میں یہ علاقہ علاء الدین نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ اس کی آزادی کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب ۱۳۸۷ء میں دہلی کا ایک امیر دلاور خاں غوری یہاں کا نائب سلطان مقرر کیا گیا۔ جلد ہی اپنی حیثیت کو استوار کر کے ۱۴۰۱ء میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا اور ایک ریاست کی بنیاد ڈالی جو ۱۵۳۱ء تک قایم رہی۔ اس سلطنت کی بعد کی تاریخ پر ہم کوئی تفصیلی بحث نہیں کرسکتے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اپنی مختصر زندگی کی پوری مدت کے دوران مالوہ کو میواڑ کی ابھرتی ہوئی راجپوت طاقت کے قرب سے نقصان اٹھانا پڑا جو کہ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی۔ اس کا سب سے بڑا بادشاہ ہوشنگ شاہ (۱۴۰۵ــــ۱۴۳۵) کچھ عرصے تک مقابلے پر جمے رہنے میں کامیاب رہا مگر اس کے آخر زمانۂ حکومت میں میواڑ کا عظیم رانا کنبھا ناقابل مزاحمت ثابت ہوا۔ اولوالعزم محمود خاں خلجی نے جو بحیثیت وزیر ۱۴۳۵ء میں تخت پر قابض ہوگیا تھا، ۱۴۴۰ء میں راجہ کنبھا کی قیادت میں راجپوتوں کے ہاتھوں ایک ذلیل کن شکست کھائی اور گرفتار ہوگیا۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک تمام امورِ سلطنت پر راجپوت مکمل طور پر چھا جاتے ہیں۔ ریاست میں اہم عہدوں پر ہندو قبضہ جما لیتے ہیں۔ اور مشہور راجپوت سردار میدنی رائے ایک بادشاہ گر کا کھیل کھیلتا ہے۔ جب کٹھ پتلی بادشاہ محمود ثانی ہندوؤں کے غلبے سے بےزار ہوکر شاہ گجرات سے مدد طلب کرتا ہے تو میدنی رائے میواڑ کے رانا سنگرام سنگھ کو بلالیتا ہے جو نہ صرف محمود کو ۱۵۱۹ء میں قیدی بناکر چتوڑ لے جاتا ہے بلکہ ۱۵۲۰ء میں احمد نگر پر اچانک یلغار اور قبضہ کرکے جنگ کو علاقہ گجرات کے اندر تک پھیلا دیتا ہے۔ یہ مالوہ کی اندرونی سیاست ہی ہے جس سے ہمیں سب سے زیادہ واضح طور پر اس فروغ پذیر راجپوتی غلبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو سولھویں صدی کے آغاز میں سیاسی صورتِ حال کا سب سے نمایاں عنصر ہے۔

دکن کی مسلمان سلطنتوں میں سب سے آخر میں سلطنت گجرات آتی ہے۔ یہ صوبہ اسلامی فوجوں نے ۱۱۹۶ء میں فتح کیا تھا اور تیمور کے حملے کے وقت تک، کم از کم برائے نام سلاطین دہلی کے ماتحت رہا۔ سابقہ پورے دس سال کے دوران بدنظمی کے آثار نمایاں رہے تھے۔ اور ایک نمایاں قابلیت کے ناظم مظفر خاں کو دہلی سے اچھے نظم و نسق کی بحالی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ۱۳۹۶ء میں اُس نے سلطان کا جوا اُتار پھینکا اور ایک خودمختار سلطنت قایم کرلی

جو ۲ ، ۱۵۰ تک چلتی رہی۔ ۱۴۱۰ء میں مظفر کو اُس کے پوتے احمد شاہ نے زہر دے دیا جو اپنی حکومت کی غیر امید افزا ابتدا کے باوجود ایک قابل اور کامیاب حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے مالوہ کے عظیم سلطان ہوشنگ کے خلاف کامیاب مزاحمت کی، فوج کو منظم کیا، مالیات کی جڑوں کو مضبوط کیا ـــــ اور سلطان محمود بیغرہ (۱۴۵۹ ـــــ ۱۵۱۱) کے زیرِ حکومت گجرات کی آئندہ عظمت کی بنیاد ڈال دی۔ یہ حکمران جس کا عہد اب بھی دورِ زرّیں کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی داخلہ و خارجہ دونوں ہی حکمت عملیوں میں بے مثال طور پر خوش قسمت تھا۔ صرف یہی نہیں کہ اس نے عمدہ امن و امان قایم رکھا اور تجارت کی ہمت افزائی کی بلکہ خوف ناک راجپوت اتحاد کا مقابلہ کرنے میں بھی کامیاب ہوا۔ اور جوناگڑھ اور چمپانیر فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی، لیکن اس کے جانشین مظفر دویم کی قسمت نے کم یاوری کی۔ مالوہ کو مکمل طور پر ہندو اقتدار کے تحت آنے سے روکنے کی کوشش میں وہ میواڑ کے خلاف ایک تباہ کن جنگ میں پھنس گیا۔ اس کی موت پر جانشینی کا ایک تنازعہ پیدا ہو گیا اور جب بابر اپنی پانچویں مہم پر ہندوستان میں داخل ہوا تو اس نے گجرات کو اندرونی پریشانیوں کی وجہ سے انتشار میں مبتلا پایا۔

اب ہم راجپوتانہ پر آتے ہیں جو کہ پندرھویں صدی کے اختتام پر ایک دفعہ پھر سیاسی افق پر بڑا نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ میواڑ، جو طویل مدّت سے راجپوت سیاسی اتحاد کی سب سے اعلا و اہم ریاست تھی۔ اپنے قابل حکمران کنبھا کی سرکردگی میں عروج پا کر ایک عظیم طاقت بن گیا تھا۔ اس کے پچاس سالہ عہد (۱۴۱۹ ـــــ ۱۴۶۹) میں چوراسی[۸۴] میں سے تیس[۳] قلعے تعمیر ہوئے تھے جن سے کہ اس کی سلطنت کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کی اس کے مسلمان ہمسایوں نے جو بھی کوششیں کیں، اس نے کامیابی کے ساتھ ان سب کی مزاحمت کی اور ایک بڑے لشکر کی سرکردگی کرتے ہوئے جس کی قوت کا اندازہ ایک لاکھ سوار اور پیدل، اور چودہ سو ہاتھی لگایا گیا ہے، اُس نے ۱۴۴۰ء میں مالوہ اور گجرات کی متحدہ افواج کو شکست فاش دی۔ ۱۴۶۹ء میں اُس کے قتل کے بعد اس کے جانشین رائے مل نے اس کا کام جاری رکھا، جس کے عہدِ حکومت میں اس کے جانباز لڑکوں سنگرام سنگھ، پرتھوی راج اور جے مل کی دیرینہ خاندانی عداوتوں کی وجہ سے بہت اختلال رہا۔ آخر کار اپنے بھائیوں کی موت کے بعد ۱۵۰۹ء میں سنگرام سنگھ تخت نشین ہوا۔

اس کے عہد میں میواڑ بامِ عروج پر پہنچ گیا۔" اسی ہزار سوار ـــــ اعلا ترین منصب کے سات راجہ ـــــ ایک سو چار سردار پانچ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُس کے ہمراہ ہوتے تھے۔" بلاواسطہ یا بالواسطہ راجستھان کے تمام وسائل اس کے اختیار میں تھے۔ اٹھارہ گھمسان لڑائیوں میں دہلی و مالوہ کے بادشاہوں کے خلاف اس نے فتح حاصل کی ـــــ ہندوستان کی کوئی فوج میدانِ جنگ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ جیسا کہ شیخ زین نے بعد میں لکھا: " دہلی، گجرات اور مانڈو جیسی ان تمام عظیم مملکتوں میں صفِ اوّل کا ایک بھی حکمران ایسا نہ تھا جو اُس کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرسکتا۔ (اہلِ ایمان کے دو سو شہروں پر پرچم کفار فخر و شان سے لہراتا تھا۔" یہ تھا عالم متحدہ ہندو ریاستوں کی تنظیم کا اور یہ تھی کیفیت اسلامی وسائل کے زوال کی جبکہ شمال سے بابر اور اس کے ترکی جنگ آزمودہ سپاہیوں کی آمد نے ایک بار پھر راجپوتوں کے خلاف قسمت کا پانسا پلٹ دیا۔

شمالی حلقے کی مسلمان ریاستوں پر ہمیں زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ سندھ کا چھوٹا سا صوبہ جو کہ ہندوستان میں اسلام کی پیش قدمی کا سب سے پہلا میدان ہے، دہلی سے اتنا دور تھا کہ راجدھانی سے اس پر موثر طور سے قبضہ قایم رکھنا ممکن نہ تھا۔ تیرھویں صدی کے دوران مقامی راجپوت خاندان سمیرا کو زیر کیا جاچکا تھا ـــــ لیکن ۱۳۳٦ء میں ایک اور راجپوت خاندان، سُمن قبیلے کے جام لوگوں نے دوبارہ اپنی آزادی قایم کرلی۔ اُنھوں نے ۱۵۲۰ء تک سلطنت پر حکمرانی کی جبکہ قندھار کے گورنر شاہ بیگ ارغوں نے اس کو فتح کرلیا جس کو ایک ایسی مملکت کی تلاش تھی جو اس کو بابر کی سرگرمیوں کے دائرے سے دور کردے۔ شاہ بیگ کے بیٹے شاہ حسین نے ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کرکے اپنی فتح کو مستحکم کیا اور مقامی لُنگ خاندان کی شمع حکومت گُل کردی۔ یہ صوبہ آخرکار ۱۵۹۰ء میں دہلی سلطنت میں دوبارہ شامل ہوگیا اور اپنی تمام تاریخ میں ہندوستان کی سیاسیات پر محض معمولی سا اثر ڈالتا رہا۔

اب بنگال پر چند الفاظ کہنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے کے ابتدائی دنوں سے ہی اُس نے ایسی خود کفالتی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس کو سیاست کے اہم دھارے سے علاحدہ کرنے کا رجحان رکھتا تھا۔ یہ پوری تیرھویں صدی میں برائے نام دہلی کے زیرِ اطاعت رہا مگر محمد بن تغلق کے عہد میں اُس نے بغاوت کردی۔ مکمل طوائف الملوکی کے

ایک مختصر دور کے بعد شمس الدین نے اقتدار پر قبضہ کرلیا جس نے ۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۷ء تک حکومت کی۔ جس خاندان کی اس نے بنیاد ڈالی تھی وہ ۱۳۸۶ء تک قایم رہا، جبکہ ایک اور دور طوائف الملوکی کے بعد تخت شاہی ایک ہندو زمین دار مسمّی راجہ کنس کے قبضے میں آگیا، جس کے خاندان نے ۱۴۲۶ء تک حکمرانی کی۔ بیشتر پندرھویں صدی کے دوران اقتدار پیشہ ور حبشی سپاہیوں کے ہاتھ میں رہا جن پر شاہی محافظ دستہ مشتمل تھا۔ اور ۱۴۹۱ء میں ایک غلام ملک عندل ان کی حمایت سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بہت شان و شوکت سے تیس سال سے زیادہ حکومت کی۔ بہترین امن و امان قایم رہا، تجارت کی ہمت افزائی کی، تعمیرات پر دریا دلی سے خرچ کیا لیکن سیاستِ خارجہ میں بہت کم حصّہ لیا۔ اس نے کسی شاہی خاندان کی بنیاد نہ رکھی اور سولھویں صدی کی ابتدا سے پہلے ہی ایک کامیاب انقلاب نے اس کے وزیر سید شریف کو علاء الدین کے لقب سے تخت شاہی پر متمکن کر دیا۔ اس نے ۱۵۲۳ء تک حکومت کی جبکہ اس کا لڑکا ناصب اس کا جانشین ہوا۔ جیسا کہ اس مختصر جائزے سے اندازہ ہوسکتا ہے ہندوستان کی سیاسیات کے ایک عنصر کی حیثیت سے بنگال کی بہت کم اہمیت تھی۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کے معاملات میں بہت کم دخل اندازی کی۔ یہ ایک تجارتی، ادبی اور فنّی علاقہ تھا۔

کم از کم یہی کچھ جونپور کے اس دور کے متعلق کہا جاسکتا ہے جبکہ وہ اپنی خوش حالی کے شباب پر تھا۔ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اس کی ابتدا ۱۳۹۴ء میں ہوئی، جب محمد بن تغلق نے اپنے وزیر خواجہ سرا خواجہ جہاں کو اس علاقے کا اقطع دار بنایا جس پر جدید ہندوستان کے صوبہ متحدہ (موجودہ اُتر پردیش، مترجم) کا بیشتر حصّہ مشتمل ہے۔ مقطعی نے جلد ہی 'ملک الشرق'[1] کے لقب کے ساتھ خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے متبنّیٰ بیٹے ابراہیم شاہ (۱۴۰۱ ـــــ ۱۴۴۰) کے تحت اس سلطنت کی طاقت میں سرعت سے اضافہ ہوگیا۔ جس کا مرکزِ اقتدار جونپور تھا۔ اس سلطان نے اپنی خود مختاری کو برقرار رکھا، اپنے علاقوں کو مستحکم کیا، بیرونی سیاست سے واسطہ نہ رکھا اور خود کو فنِ تعمیر، صنعت و حرفت اور زراعت کی ہمت افزائی میں لگادیا۔ اُس کے پُرامن عہدِ حکومت میں سلطنت اتنی پختہ و مضبوط ہوگئی کہ اس کے جانشین محمود شاہ (۱۴۴۰ ـــــ ۱۴۷۵) نے سید خاندان کے نابود ہونے پر

---

[1] مشرق کا شہزادہ یا بادشاہ۔

شہنشاہی کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ہمت اپنے اندر محسوس کی۔ لیکن پنجاب کا نائب سلطان بہلول لودی بہ یک وقت زیادہ تیز اور طاقت ور ثابت ہوا جس کے باعث محمود کو ذلت آمیز پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ۱۴۵۷ء میں اس کی وفات کے بعد ایک قتل و سازش کا دور آیا، جس سے آخری مشرقی بادشاہ حسین شاہ فتح یاب و کامراں برآمد ہوا۔ خود پسندی و جاہ طلبی کے ساتھ وہ قابل بھی تھا۔ اُس نے اڑیسہ کو ہندو راجاؤں کے قدیم خاندان سے جیت لیا۔ اُس نے گوالیار پر حملہ کر کے وہاں کے حکمران کو خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اپنی بدقسمتی سے ۱۴۷۳ء میں اُس نے کسی اشتعال کے بغیر ہی بہلول پر حملہ کر دیا۔ دہلی کے مخلص حکمران نے ایک ایمان دار انسان کی طرح مفاہمت کی کوشش کی لیکن تمام مصالحت ناممکن ہونے کے بعد وہ (دہلی سے) باہر نکلا اور حملہ آور کو تین گھمسان جنگوں میں شکست دی اور اپنے دشمن کے دارالخلافہ جونپور پر قبضہ کر لیا۔ پانچ سال بعد مشرقی سلطنت باضابطہ طور پر پھر دہلی سے منسلک ہو گئی۔

اب ہم خود دہلی کی سلطنت پر آتے ہیں جس کی تاریخ اس قدر معروف العام ہے کہ اس پر زیادہ وقت صرف کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ۱۴۵۱ء میں کمزور شاہ عالم کی تخت سے دست برداری کے بعد نام نہاد سید خاندان ختم ہو گیا اور پنجاب کے طاقت ور افغان خاندانوں نے جو اس کے نام سے پنجاب پر حکومت کرتے تھے، اپنے سب سے نمایاں آدمی، لودی قبیلے کے شاہ بہلول شاہو خیلی کو آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک اچھا سپاہی اور ایک سادہ فطرت انسان تھا جسے نمود و نمائش سے نفرت تھی لیکن سب سے بڑھ کر وہ ایک دُور اندیش سیاست دان تھا جس کی طاقت کی بنیاد خود اپنی ہی نسل کے افراد کی اطاعت پر تھی اور وہ یہ بھی پوری طرح جانتا تھا کہ یہ اطاعت کس طریقے سے حاصل کی جا سکتی ہے اور برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

'تاریخ داؤدی' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس تاثر کا اندازہ ہوتا ہے جو کہ اس نے اپنے ہم عصروں پر ڈالا تھا:[1]

"وہ تفریح کی صحبتوں میں کبھی تخت پر نہ بیٹھتا، اور نہ اپنے امرا کو کھڑا رہنے دیتا۔

---

[1] ایلیٹ و ڈاؤسن۔ چہارم۔ ص ۴۳۶-۴۳۷

دربارِ عام میں بھی وہ تخت پر متمکن نہ ہوتا بلکہ قالین پر نشست اختیار کرتا۔ جب کبھی اپنے امرا کے نام فرمان تحریر کرتا انھیں 'مسندِ علی' (؟ عالی) سے خطاب کرتا۔ اور اگر کبھی وہ اس سے ناراض ہوجاتے تو وہ انھیں خوش کرنے کی اتنی سخت کوشش کرتا کہ خود اُن کے گھر جاتا، اپنی کمر سے تلوار کھول کر آزردہ شخص کے سامنے رکھ دیتا۔ یہی نہیں، کبھی کبھی تو وہ سر سے عمامہ بھی اتار دیتا اور معافی کا خواستگار ہوتے ہوئے کہتا 'اگر تم مجھے میرے اس عہدے کے لائق نہیں سمجھتے تو کسی اور کو چن لو اور مجھے کوئی اور عہدہ عطا کردو'۔ وہ اپنے تمام سرداروں اور سپاہیوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتا۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو وہ عیادت کو جاتا اور اس کی خدمت کرتا۔"

اس قسم کی طبیعت کا مالک ہونے کی وجہ سے، بہلول سلطانِ دہلی کی حیثیت سے قبیلے کے ان لوگوں کی اطاعت کو پختہ کرسکا جن کی مدد سے وہ پنجاب پر پہلے حکمرانی کرچکا تھا۔ اپنے طاقت ور ہاتھوں سے اس نے دہلی اور اس کے نواح میں جلد ہی امن و امان قایم کردیا اور اپنے عہدِ حکومت کے آخر میں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس نے جونپور کی سلطنت کو دوبارہ منسلک کرلیا جو کہ تقریباً پچھتر برس سے خود مختار چلی آرہی تھی۔ لیکن اس کی طاقت اس کے منصب سے زیادہ اس کی شخصیت سے متعلق تھی، کیوں کہ وہ فی الحقیقت اُس کے قبیلے والوں کی تلوار پر منحصر تھی جو اس کی حمایت کرتے تھے، اس لیے نہیں کہ وہ اُن کا بادشاہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مقبول موروثی سردار تھا۔ 'تاریخ شیر شاہی' میں جگہ جگہ ایسی عبارات ملتی ہیں جن سے اُس کے مخصوص عجیب منصب پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ مندرجہ ذیل اس کی ایک مثال ہے:

" سلطان بہلول لودی دیپال پور میں تھا جب دہلی کے محاصرے کی تکلیف دہ خبر اُسے ملی اور اس نے اپنے امرا و وزرا سے کہا، 'ہند کے علاقے وسیع و زرخیز ہیں اور ان کے حکمران ہندوستانی نسل سے ہیں، میرے وطن میں میرے بہت سے رشتے دار اپنی شجاعت و طاقت کے لیے مشہور ہیں جنھیں ذریعۂ معاش کی پریشانی ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو انھیں غریبی کی ذلت سے نجات مل جاتی اور میں ہند پر قبضہ کرلیتا اور اپنے دشمنوں کو تباہ کردیتا۔"

" اُس کے سرداروں نے جواب دیا '.... موجودہ حالات میں یہ قرینِ مصلحت

ہے کہ سلطان عالی جاہ۔ علاقہ روہ کے سرداران قبائل کو اس مضمون کے خطوط لکھیں: 'خدا نے اپنے فضل سے دہلی کی سلطنت افغانوں کو عطا کی ہے مگر دیگر شاہان ہند انہیں ملک سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہماری مستورات کی عزت کا معاملہ ہے۔ ہند کے علاقے وسیع و زرخیز ہیں اور بہت لوگوں کی گزر بسر کا ذریعہ بن سکتے ہیں، لہٰذا اس ملک میں چلے آؤ۔ اگرچہ بادشاہت پر تو ضرور میرا ہی نام ہوگا لیکن جو بھی علاقے ہم لوگ فتح کر سکیں گے، ہم لوگ بھائیوں کی طرح ان میں حصے دار ہوں گے، سلطان محمود دہلی کا محاصرہ کیے ہوئے ہے جہاں افغانوں کے اہل و عیال ہیں۔ اگر تم لوگ میری مدد کو تیار ہو تو ابھی اور ایک بڑی فوج کے ساتھ کرو۔۔۔۔'

"بادشاہ نے اس مشورے کو پسند کر کے مختلف افغان قبیلوں کے سرداروں کو فرمان جاری کر دیے۔ فرمان پاکر روہ کے افغان لوگ بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہونے کے لیے اپنی عادت کے مطابق مور و ملخ کی طرح اُمنڈ آئے"[1]

جس نئی بادشاہت کی اس نے بنیاد ڈالی وہ بہت حد تک شخصی تھی، اس کا ثبوت اس کے بیٹے اور جانشین نظام خاں کی تاریخ سے مل جاتا ہے، جس نے سلطان سکندر کی حیثیت سے ۱۴۸۹ء سے ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ وہ بغیر کسی خاص مخالفت کے تخت نشین ہوگیا لیکن جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ اپنے باپ کی جگہ پُر کرنا آسان کام نہیں، اگرچہ پنجاب، دہلی اور جونپور پر نام کے لیے اُس کی حکمرانی تھی لیکن درحقیقت ملک اُن وابستہ جاگیرداروں کے ہاتھوں میں تھا جن کی اطاعت و وفاداری پر اس کی طاقت کا دار و مدار تھا۔ جیسا کہ 'واقعات مشتاقی' کا مصنف کہتا ہے:

> "پورے ملک کا نصف حصّہ فارمولیوں کو جاگیر میں ملا ہوا تھا اور باقی نصف دیگر افغان قبیلوں کو۔ اس وقت فارمولیوں اور لوہانیوں کا غلبہ تھا۔ سارن و چمپارن کے اضلاع میاں حسین کے قبضے میں تھے۔ میاں محمد کالاپہاڑ کے پاس اودھ، انبالہ و ہودنہ تھے۔ میاں گرائی کے پاس قنوج، میاں عماد کے پاس شمسہ باد، میاں احمد کے بھائی تاتار خاں کے پاس تھانیسرو، شاہ آباد اور مارہر اور خواجگی شیخ سعید کے پاس ہریانہ، دلیوا اور دیگر متفرق پرگنہ جات تھے۔

---

[1] ایلیٹ و ڈاؤسن۔ چہارم۔ ص ۳۰۶، ۳۰۷

"سروانیوں کا سردار اعظم ہمایوں تھا اور لودیوں کے خاص سردار چار تھے —: محمود خاں جس کے پاس کالپی کی جاگیر تھی —— میاں عالم جس کو اٹاوہ و چاندوہ تفویض ہوئے تھے —— مبارک خاں کی جاگیر لکھنؤ تھی —— اور دولت خاں جس کے قبضے میں لاہور تھا —— شاہو خیل کے سردار حسین خاں اور خان جہاں تھے، ان کے اور سلطان بہلول کے اجداد ایک ہی تھے —— حسین خاں بن فیروز خاں اور قطب خاں لودی، شاہو خیل۔

"ان میں سے بعض کے پاس بڑے بڑے محلے تھے۔ کڑا کا جاگیردار اعظم ہمایوں قرآن کے دو ہزار نسخے ہر سال خریدتا تھا اور اس کے زیر کمان پینتالیس ہزار گھوڑے اور سات سو ہاتھی تھے۔ ان سے کم رتبہ سرداروں میں یہ لوگ تھے: دولت خاں جس کے پاس چار ہزار سوار تھے —— علی خاں اوش کے پاس بھی چار ہزار سوار تھے۔ فیروز خاں سروانی جس کے پاس چھ ہزار سوار تھے۔ دیگر امرا کے درمیان مزید پچیس ہزار سوار منقسم تھے۔ جمال خاں لودی سارنگ خانی کے بیٹے احمد خاں کو جب جونپور مامور کیا گیا تو اس کے تحت بھی بیس ہزار سوار تھے۔"

فیاضانہ حکمرانی کے اس دور کو بعد میں ایک عہد زریں کے طور پر حسرت سے یاد کیا جاتا تھا۔ افغان شاہی خاندان کے مورخ، مغل شہنشاہوں کے عہد میں رقم طرازی کرتے ہوئے سلطان سکندر کے مبارک دور قدیم کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔ ذیل کا اقتباس اس کا ایک مثالی نمونہ ہے[1]:

"ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا اور ایک قایم شدہ دستور کبھی بدلا نہ جاتا تھا.... وہ امرا اور اکابرین وقت سے ہمیشہ اسی طرح پیش آتا رہتا تھا جس طرح ملاقات کے پہلے دن پیش آتا تھا.... ہر سردار کی اس کے حضور میں ایک خاص جگہ متعین تھی جہاں وہ ہمیشہ کھڑا ہوتا تھا۔ سلطان کو تمام اشیا کی قیمتوں کی اور سلطنت کے مختلف اضلاع میں رونما شدہ واقعات کی روداد روز پہنچتی تھی۔ اگر اسے کسی غلط چیز کی ذرا سی بھی جھلک محسوس ہوتی تھی تو وہ فوراً اس کے متعلق تحقیقات کراتا تھا.... اس کے عہد میں کاروبار بہت پُرسکون، ایمان دارانہ

---

[1] ایلیٹ و ڈاؤسن، چہارم، ص ۴۴۸، ۴۴۹

اور بے لاگ طریقے پر ہوتا تھا۔ ایک نئی قسم کی زندگی جاری و ساری تھی کیونکہ اعلا و ادنا سب لوگ شائستہ تھے اور خودداری، دیانت اور دینداری اس قدر عام تھی کہ سابقہ بادشاہوں کے عہد میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ ادبیات کے مطالعے سے بھی بے توجہی نہ تھی۔۔۔۔ کارخانجات کی اتنی ہمت افزائی کی جاتی تھی کہ تمام نوعمر امرا اور سپاہی مفید صنعتوں میں مشغول تھے۔۔۔۔ سکندر کے تمام امرا اور سپاہی مطمئن تھے۔ اُس کا ہر سردار ایک ضلع کی حکومت پر مامور تھا اور اس کی خاص خواہش تھی کہ عوام کی محبّت و خیر سگالی اُسے حاصل ہو جائے۔ اپنے افسروں اور سپاہیوں کی خاطر اُس نے اپنے دور کے تمام دیگر حکمرانوں اور سرداروں سے جنگ و جدل ختم کر دیا اور تنازعہ و مناقشہ کی راہ بند کر دی۔ اس نے اپنے باپ کے ورثے میں ملے ہوئے علاقوں پر قناعت کی اور اپنی تمام زندگی نہایت سلامتی و خوش کامی سے بسر کی اور اعلا و ادنا سب کے دل جیت لیے۔"

اس کا بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک موقع ناشناس اور غیر مقبول حکمران اس عجیب نظم سیاست کو لاعلاج پراگندگی میں مبتلا کر سکتا تھا۔ سکندر کا بیٹا ابراہیم بہادر، لیکن مغرور، تیکھا اور شکّی مزاج تھا۔ نتیجہ تباہ کن ہوا۔ اُس نے نہ صرف اپنے اُن امرا کو برگشتہ کر دیا جن کی امداد پر اس کی طاقت کا دار و مدار تھا اور نہ صرف اُن لوگوں کو عملی مخالفت پر مجبور کر دیا جن کو تمام خطرات کے باوجود خوش رکھنا چاہیے تھا بلکہ ایک جابر فرمانروا کا کھیل کھیلنے کی کوشش بھی کی جس کے باعث حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ اس کے بے رحمانہ افعال اور جرائم نے اس کے باپ دادا کے سارے اچھے کام کو تباہ کر دیا۔ سلطنت دہلی میں پراگندگی پیدا ہو گئی، پنجاب اور جونپور کھلے طور پر باغی ہو گئے۔ دو دفعہ ابراہیم کو راجپوتوں سے شکست کھانی پڑی[1]

یہ تھی سولھویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کی سیاسی صورت حال ـــــ مسلمان طاقتیں کمزور تھیں اور آپس کے تفرقات کی وجہ سے انتشار میں مبتلا تھیں۔ میواڑ کی قیادت میں راجپوت ریاستی اتحاد اس سلطنت پر قابض ہونے کو تقریباً تیار تھا جو کہ اس کی دسترس میں تھی ـــــ لیکن قسمت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ سنگرام سنگھ اپنے انعام سے محروم رہ گیا، اسلامی

---

[1] ٹاڈ، تاریخ میواڑ۔ باب نہم۔

طاقتیں از سرِ نو مستحکم ہو گئیں اور نعمت یابی کے بجائے زحمت کشی راجپوتوں کا مقدر بن کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ ایک واحد غیر معمولی فرد ظہیر الدین محمد بابر[1] کا کارنامہ تھا ــــــ یہ داستان پوری تاریخِ مشرق میں شاید سب سے زیادہ رومانی افسانہ ہے اور اسی سے آئندہ صفحات متعلق ہیں۔

---

[1] جیسا کہ مسٹر ونسنٹ اسمتھ نے کہا ہے ("اکبر"، ص ۹، نوٹ ۲) ترکی لفظ "بابر" کا کوئی تعلق عربی لفظ "ببر" بمعنی شیر سے نہیں ہے۔ ریڈ ہاؤس۔ ٹرکش لکسیکن اور اسٹینگاس، پرشین انگلش ڈکشنری۔
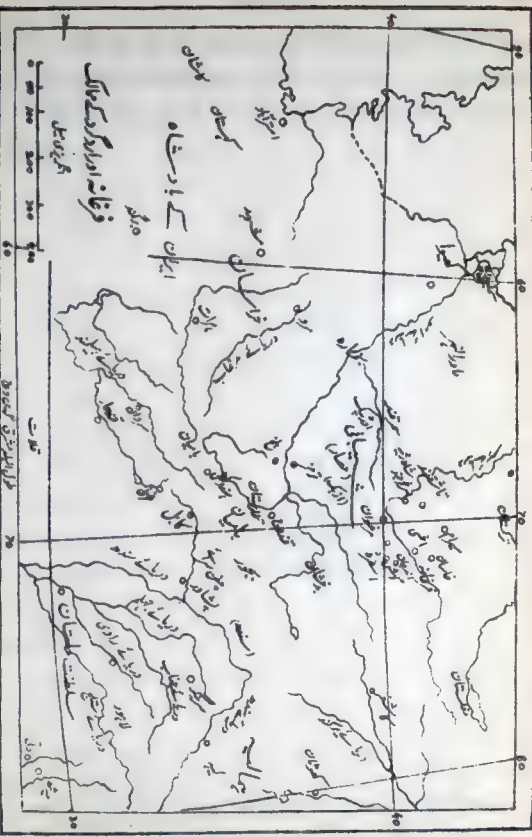
بَابِ اوّل

بابر کا لڑکپن

اسناد : بابر نامہ ، تاریخ رشیدی ، حبیب السیر ، شیبانی نامہ ، احسن التواریخ۔

جدید تصانیف : ارسکن ، لین پول۔

بابر کی تخت نشینی کے وقت دیگر حکمراں :

سلطان محمود خاں[1] (بابر کے بڑے ماموں) ـــــ تاشقند ، سیرام ، شاہ رخیہ۔

سلطان احمد خاں (چھوٹے ماموں) ـــــ تاشقند اور ویلدوز کا درمیانی علاقہ۔

سلطان احمد مرزا (بڑے چچا) ـــــ سمرقند و بخارا۔

سلطان محمود مرزا[2] (چھوٹے چچا) ـــــ حصار ، بدخشاں اور قندز

سلطان الغ بیگ مرزا (سب سے چھوٹے چچا) ـــــ کابل و غزنی۔

سلطان مرزا بیقرہ (برسراقتدار خانوادۂ تیموری کا سردار اعلا) ـــــ خراسان و ہرات۔

---

[1] بابر کے دو ماموں سلطان محمود خاں اور سلطان احمد خاں تھے ، اول الذکر یونس خاں کے بڑے بیٹے تھے مگر یہ دونوں ہی بھائی بابر کی والدہ سے چھوٹے تھے۔ اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ ، ص ۲۳)۔

[2] بابر کے دادا ابوسعید مرزا کے پانچ بیٹے تھے ، بڑے تین بھائی ، سلطان احمد مرزا ، سلطان محمد مرزا اور سلطان محمود مرزا تھے۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا چھوٹے بیٹے تھے۔ اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ ، ص ۴۱۳) محمد مرزا کی وفات ۹۰۶ھ (۱۵۰۱ء) میں ہوئی۔ اے۔ ایس۔ بیورج ، ص ۱۸۵۔

"۸۹۹ھ[1] کے ماہ رمضان میں، اپنی عمر کے بارھویں سال میں[2]، فرغانہ کا حکمراں بن گیا۔"[3]

ان الفاظ کے ساتھ بابر اپنی مہم پسندانہ زندگی کی داستان یکایک شروع کر دیتا ہے اور اُس کی ضخیم کتاب کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک اس کی شخصیت و تحریر میں ہماری دل چسپی ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے پیشتر کہ ہم دیانت دارانہ طور پر اس کی جہدِ حیات کا تذکرہ شروع کر سکیں جس کا آغاز ترکستان کی ایک حقیر سی ریاست سے اور اختتام سلطنتِ ہند پر ہوا، ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر یہ واضح کریں کہ وہ کون تھا اور کن حالات میں اُس کی تخت نشینی ہوئی۔

جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے بابر کا شجرہ ایشیا کو متاثر کرنے والے دو عظیم ترین معمارانِ سلطنت، تموچن عرف چنگیز خاں اور تیمور لنگ سے ملتا تھا۔ اپنے والد کی طرف سے پانچویں پُشت میں وہ براہِ راست تیمور کی اولاد تھا[4]۔۔۔۔ اور ماں کی طرف سے اس کا نسب چودھویں

---

[1] بابر کے والد عمر شیخ مرزا ۸ جون ۱۴۹۴ء (۴ رمضان ۸۹۹ھ) کو ہلاک ہوئے۔

[2] بابر کی پیدائش بروز جمعہ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء (بمطابق ۶ محرم ۸۸۸ھ) کو ہوئی۔

[3] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱ و نوٹ۔

[4] والد کی طرف سے بابر کا شجرہ حسبِ ذیل ہے:

امیر تیمور
|
مرزا میراں شاہ
|
سلطان محمد مرزا
|
سلطان ابو سعید مرزا
|
سلطان عمر شیخ مرزا

بابر، جہانگیر، ناصر، خانزادہ بیگم، مہر بانو بیگم، شہر بانو بیگم، یادگار سلطان بیگم، رقیہ سلطان بیگم
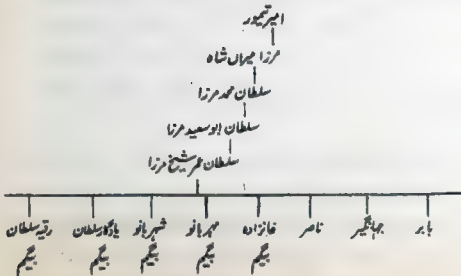
پشت میں چنگیز سے ملتا تھا[1]

بابر کے خاندانی شجرہ کے ان بعید تر بزرگوں سے ہمیں یہاں اس امر کی وضاحت کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں کہ اگر انسان کی جبہ جبلت کی تشکیل میں توارث کی توفیق بھی کچھ کام کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے بابر کو جبلت کے ذریعے ایک فاتح بنانے کے لیے سب کچھ کر ڈالا تھا۔ لیکن بابر کے دادا اور نانا کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری ہے تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ ماحول کے ذریعے اس کو ایک فاتح بنانے کے لیے قسمت نے بھی اپنی قوتوں کو قدرت کے ساتھ متحد کردیا تھا اور اس لیے طفولیت کے اوّلین ایام سے ہی اس کے چاروں طرف سازش و اولوالعزمی کی ایک فضا پیدا کردی تھی۔

بابر کے دادا، تیموری حکمراں، سلطان ابوسعید مرزا نے بہت خطرات اور ناکامیوں کے بعد ماوراء النہر کو فتح کرنے میں کامیابی حاصل کرلی جو اس کے چچا کی ملکیت میں تھا اور خراسان کو جیت کر مکران و سندھ تک اپنی مملکت وسیع کرلی۔ اس کی راجدھانی ہرات تھی اور یہاں سے اس نے بیس سال تک بڑی قوت و خوش حالی کے ساتھ اپنی وسیع سلطنت پر حکمرانی کی۔ یہاں تک کہ ۱۴۶۹ء میں اس نے 'تباہی عراق' کے مشہور سانحے میں وفات پائی[2]۔ اس علاقے کے دو ترکمانی قبیلوں کے ایک جھگڑے کو طے کرنے کی غرض سے اس نے صوبہ آذربائیجان میں داخل ہونے کی خطرناک جرات کی اور اپنی پوری فوج کے ساتھ اردبیل کی پتلی سی گھاٹی میں پھنس گیا۔ نہ صرف وہ خود ختم ہوگیا بلکہ اس کی بے شمار فوج میں سے صرف چند

---

[1] ماں کی طرف سے شجرہ مندرجہ ذیل ہے:

اُس کی ماں قتلق نگار خانم بنت یونس خاں بن ویس خاں بن شیر علی خاں بن محمد خواجہ خاں بن خضر خواجہ خاں بن تغلق تیمور خاں بن ایسن بغا خاں (پسر) بن دوا چیچان (دوا خاں؟) بن بورک خاں (؟ براق خاں۔ غیاث الدین) بن منکر بن موہکار بن چغتائی بن چنگیز۔

ارسکن اول، ص ۸۰، کورٹیل اول، ص ۱۰۱

بابر نامہ میں ہے: براق بن یسنتوا خاں بن موالوکان بن چغتائی۔ اے۔ ایس۔ بیوریج (بابر نامہ)، ص ۱۹

لیکن 'حبیب السیر' (جلد سوم، ص ۸۱، ۸۲) سے شجرہ اس طرح معلوم ہوتا ہے:

براق خاں بن جیسو منکا بن چغتائی خاں۔ (مترجم)

[2] تاریخ رشیدی۔

لوگ یہ اندوہ ناک خبر سنانے کے لیے زندہ واپس آئے۔ اس موقع پر اتنا زبردست قتل عام ہوا تھا کہ یہ دن طویل عرصے تک یاد رہا اور پورے ماوراالنہر میں ایک ایسا مقررہ نقطۂ زمانی سمجھا جانے لگا جس سے دیگر تاریخوں کا شمار کیا جاتا تھا۔ سلطان ابوسعید مرزا کی موت پر اس کی سلطنت اس کے بیٹوں میں بٹ گئی، جن میں سے چار خود مختار حکمراں ہوگئے۔ سب سے بڑا بیٹا سلطان احمد مرزا قلبِ سلطنت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس میں وسیع شہرت کے صوبے سمرقند و بخارا شامل تھے جن کا نام ہی ثقافت، عیش و آرام اور دولت کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ تیسرا بیٹا محمود مرزا، بدخشاں و ختلان اور ہندوکش و اسفرہ پہاڑوں کے درمیان واقع دیگر صوبوں کا حکمران بن گیا۔ اُلغ بیگ مرزا کے پاس کابل و غزنی کی حکومت رہی جس پر اپنے والد کی حیات میں اس کا قبضہ رہا تھا۔ چوتھے بیٹے عمر شیخ مرزا (بابر کے والد) نے بھی اپنی جاگیر فرغانہ کی سلطنت برقرار رکھی۔

فرغانہ، جو کہ اب روسی ترکستان کا تقریباً پچاس ہزار مربع میل وسیع ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ یہ ایک زرخیز علاقہ ہے جس کی آب و ہوا میں یکسانیت ہے۔ غلّوں اور میووں کی پیداوار خوب ہے اور ہر طرح کے چھوٹے شکار بکثرت ملتے ہیں۔ یہ ایک بہت واضح جغرافیائی اکائی ہے اور مغرب کی سمت چھوڑ کر باقی تین طرف بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں کے درمیانی خلاؤں سے عظیم دریائے سیموں مغرب سے مشرق کی سمت بہتا ہے[1] اور کوہستانی حلقے میں گھرے ہوئے میدان کو دو غیر مساوی حصوں میں اس طرح بانٹ دیتا ہے کہ فرغانہ کے سات خاص انتظامی اضلاع میں سے دو دریا کے شمال اور پانچ جنوب میں واقع ہیں۔ فوجی نقطۂ نظر سے بابر کے عہد کا فرغانہ، چند دل چسپ نکات رکھتا ہے۔ مختصر الفاظ میں صورتِ حال کچھ اس طرح ہے: سب سے زیادہ خوش حال اضلاع جن کو ایک حملہ آور کا فطری نشانہ ہونا چاہیے' دریا کے جنوب میں واقع ہیں۔ اس جنوبی علاقے کا خاص شہر اندجان[2] ہے جو ہمیشہ اس صوبے کا پایۂ تخت رہا ہے۔

---

[1] 'بابر نامہ' کے مطابق دریائے سیموں اس ملک میں شمال و مشرق کی سمت سے داخل ہوتا ہے اور ملک کے وسط سے گزر کر مغرب کو بہنے لگتا ہے۔

[2] بابر لکھتا ہے: اندجان کا قلعہ بہت مضبوط ہے اور سمرقند و کیش کے قلعوں کی ہمسری کرتا ہے۔ اس کے تین دروازے ہیں اور نو نہریں مختلف حصوں میں بہتی ہیں۔ قلعہ کے گرد سنگین خندق ہے اور خندق کے ایک سمت وہ راستہ ہے جو قلعے کو شہر سے ملاتا ہے اور فصیل کا کام کرتا ہے۔ اے۔ ایس۔ بیورج (بابر ")۔

پندرھویں صدی میں یہ ایک محفوظ اور قلعہ بند جگہ تھی۔ اندجان سے کچھ مغرب میں ایک اور کمزور تر شہر مرغلان[1] آباد ہے اور جنوب میں کسی قدر فاصلے پر اوش[2] ہے۔ لیکن فرغانہ کی اصلی کلید اخسی[3] ہے جو دریا کے شمال میں واقع ہے اور مغربی راستے کی حفاظت کرتا ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے کوئی بڑا لشکر قلب ملک میں داخل ہوسکتا ہے۔ جب ایک مرتبہ اخسی پر حملہ آور کا قبضہ ہوجاتا تھا تو سیموں کے شمال کے اضلاع اس کے زیر قوت آجاتے تھے۔ تب وہ اس کے بعد والے خطہ دفاع کو توڑنے کے لیے جو کہ خود دریا پر مشتمل تھا کوئی مناسب مقام انتخاب کرسکتا تھا۔ جب اُس میں بھی کامیابی ہوجاتی تو دریا اور پہاڑوں کے درمیان کا زرخیز میدان پامال کرکے وہاں کے باشندوں کو اندجان اور مرغلان کے شہروں میں پناہ لینے پر مجبور کرسکتا تھا جن کے گرد وہ جب چاہے محاصرہ ڈال سکتا تھا اور اس طرح ملک کے تمام وسائل کا مالک بن سکتا تھا۔

لیکن جیسا کہ آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہ وسائل بہت زیادہ نہیں تھے۔ فرغانہ کسی بھی ایسے حکمران کی کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا جو فتوحات کی راہ پر گامزن ہونے کے منصوبے بنارہا ہو۔ اس کے باوجود بابر کے والد عمر شیخ مرزا جو کہ احتیاط اور اخلاقی ارتیاب کا مادہ کم رکھتے تھے، ہمیشہ ذاتی مفاد کی خاطر اپنے پڑوسیوں کے معاملات میں مداخلت کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ جیسا کہ اس عہد میں عام طور سے ہوتا تھا، اُن کے خاص حریف ان کے اپنے ہی خاندان والے تھے۔ اپنے بڑے بھائی سلطان احمد مرزا سے ان کے تعلقات مستقل طور پر معاندانہ تھے[4]۔

---

[1] مرغلان۔ بابر نامہ (بیورج) میں اسے مرغینان لکھا ہے۔ بابر کے کہنے کے مطابق یہ اندجان سے سات یگاچی دور جانب مغرب میں آباد ہے۔ اے۔ ایس۔ بیورج۔ ص ۶ (مترجم)
بیورج کے مطابق بابر کا ایک یگاچی چار سے آٹھ میل کے درمیان رہتا ہے (مترجم)۔

[2] اوش۔ اسے بابر نے فرغانہ کا دوسرا بڑا شہر لکھا ہے۔ یہ جنوب مشرقی گوشے میں اندجان سے کسی قدر مشرق کی سمت واقع ہے۔ یہ اندجان سے چار یگاچی کے فاصلے پر آباد ہے۔
اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ)، ص ۴

[3] بابر لکھتا ہے: کتابوں میں اسے اخسیت کہا گیا ہے۔ اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ)، ص ۹، نوٹ ۴

[4] 'تاریخ رشیدی' —— علاوہ ازیں ملاحظہ ہو پی۔ ڈاکورٹیل۔ اول، ص ۱۴ —— المنسکی، ص ۹

اس کی کئی وجوہات تھیں، سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ سیماب فطرت عمر شیخ کے دانت اپنے سے زیادہ خوش قسمت بھائی کے مقبوضات پر لگے ہوئے تھے اور وہ اس کے خلاف مستقل سازشیں کرتا رہتا تھا۔ فطری طور پر اس کے جواب میں سلطان احمد ایک طاقت ور لشکر کے ساتھ حدود فرغانہ کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا تھا اور کئی مرتبہ فرغانہ کو خود اپنی مملکت میں شامل کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ عمر شیخ اپنے وسائل کی کمتری سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی سے خوف زدہ بھی تھا اور رشک بھی کرتا تھا۔ انجام کار تاشقند اور شاہ رُخیہ کے سرحدی صوبے جن پر دونوں ہی اپنا اپنا حق جتاتے تھے، ایک مستقل وجہ مخاصمت کی شکل اختیار کر گئے۔

بڑے بھائی کے مادّی وسائل کی زبردست برتری کے باعث یہ مقابلہ بہت ہی غیر متوازن تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ عمر شیخ مرزا کے لیے اس کش مکش کو جاری رکھنا جس چیز نے ممکن بنا دیا وہ اس کے خُسر اور بابر کے نانا یونس خاں کی امداد تھی۔

یونس خاں کا شجرہ بارھویں پُشت میں چنگیز اعظم سے مل جاتا ہے۔ وہ اُس وَیس کا سب سے بڑا بیٹا تھا جس نے منگولوں[1] کے خاقان کی حیثیت سے حکومت کی تھی، لیکن وہ اپنے والد کا جانشین معمول کے مطابق نہ ہوا، کیوں کہ آزاد اور خود مختار قبائل نے اُس کے چھوٹے بھائی کو چُن لیا تھا، جس کے باعث مجبوراً یونس خاں کو منگولستان چھوڑنا پڑا اور متعدد سال بحیثیت جلاوطن فرمانروا کے بدخشاں کے دربار میں گزارنے پڑے۔ یہاں اسے ایسی تعلیم حاصل ہوئی جو کم ہی اس کے ہم وطنوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ اُس کی وہ ناشائستہ عادتیں چھوٹ گئیں جن کے باعث اس کے خاندان کے محکوم خانہ بدوش قبائل ذلّت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے بجائے اس نے ایک تعلیم یافتہ ایرانی کے طور طریقے سیکھ لیے۔ چالیس سال کی عمر میں اسے اس شائستہ آسائش کی زندگی سے سلطان ابوسعید مرزا نے، (جو کہ بعد میں 'تباہی عراق' میں ختم ہو گیا) یکایک باہر کھینچ بلایا اور اسے منگولوں کی خاقانی پر دوبارہ اپنا حق جتانے کے لیے تیار کرلیا۔ آخر اپنے سرپرست کی مدد سے بہت سے نشیب و فراز کے بعد اس نے اپنا حق

---

[1] 'منگول' کا لفظ جہاں جہاں بھی اس کتاب میں استعمال ہوا ہے، وہ علم الانسان (Ethnology) کے اصطلاحی و محدود معنی میں ہوا ہے۔ اور 'مغل' کا لفظ عام اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (مترجم)

منوانے میں کامیابی حاصل کی اور ۱۴۹۵ — ۱۴۶۶ء میں خاقان تسلیم کر لیا گیا۔ جب سلطان ابوسعید اور اس کی تمام فوج ختم ہوگئی تو یونس خاں نے اپنے تمام عظیم وسائل اپنے محسن کے بیٹوں کی مدد میں لگا دیے۔ اس نے اپنی تین بیٹیوں کی شادی تین مرزاؤں، یعنی سمرقند کے سلطان احمد مرزا، بدخشاں کے سلطان محمود مرزا اور فرغانہ کے سلطان عمر شیخ مرزا سے کردی۔ اس طرح اس کو اپنے دامادوں کے باہمی تنازعات میں ثالث بننے کے لیے ایک بہت عمدہ حیثیت حاصل ہوگئی —— پھر ایک غیر معمولی راست باز و قابل محبت کردار کا انسان ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت کا اقتدار بھی اُن پر بہت زیادہ تھا۔ اُسے عمر شیخ سے خاص اُنسیت تھی۔ اور اپنے اس منظورِ نظر کو اس کی نافہمی کے نتائج سے بچانے کے لیے بار بار مداخلت کرتا رہتا تھا۔ خاص طور سے ایک موقع پر جبکہ سلطان احمد اور عمر شیخ میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل صف بستہ تھے، اُس نے اپنے تمام وسائل کمزور تر حریف کی حمایت میں جھونک دیے اور اس طرح جنگ و جدل میں اتنے عرصے کے لیے التوا پیدا کر دیا کہ مشہور بزرگ خواجہ نصیر الدین عبیداللہ نے آکر صلح کرا دی[1] لیکن خاقانِ اعظم کی جو عزت و عظمت اس کے تمام حلیفوں میں تھی اس کا شاید سب سے نمایاں ثبوت یہ امر ہے کہ جب سلطان احمد اور عمر شیخ تاشقند اور شاہ رخیہ کے سرحدی صوبوں کے متعلق تنازعہ میں کسی سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے، تو دونوں فریق زیرِ بحث علاقوں کو یونس خاں کے سپرد کر کے اس دشواری کو حل کرنے پر رضامند ہوگئے۔ لہٰذا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ بابر کے نانا نے اپنے ہم عصروں کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ نہ صرف منگول خون اور ایرانی ثقافت کا ایک اجتماع ضدین تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک حاکمانہ شخصیت اور ایک نہایت دل کش کردار کا مالک بھی تھا —— اس کا حال جو ایک عینی شاہد نے بیان کیا ہے ہمارے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، کیوں کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ خود بابر اور اس کے نانا خاقان میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں :

> "میں نے سنا تھا کہ یونس خاں منگول ہے اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ بے ریش آدمی ہوگا اور اس میں ایک صحرائی باشندے کے غیر مہذب انداز اور طور طریقے ہوں گے۔ اس کے برعکس میں نے اسے ایک نفیس گھنی داڑھی والا خوبصورت انسان پایا، جس کی شستہ وضع قطع اور دل پذیر و پاکیزہ اطوار اور اندازِ گفتگو

---

[1] تاریخ رشیدی۔ ارسکن دوم، ص ۶۰

ایسے تھے کہ انتہائی مہذب سوسائٹی میں بھی خال خال ہی ملتے ہیں“[1]

جب تک یونس خاں زندہ رہا، اس کے ثالثانہ اثرات اس کے دامادوں کی باہمی جنگ و جدل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہمیشہ کارفرما رہے لیکن جب (۱۴۸۶-۱۴۸۷) میں اس کی وفات ہوئی تو آپس کی کش مکش ایک نئی وحشیانہ شدت سے شروع ہوگئی ــــــ ہمیں ان جھگڑوں کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے کیوں کہ بابر کی تخت نشینی کے وقت سیاسی صورت حال کا انحصار انھیں پر تھا۔

یونس خاں کی موت کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ شاہ رخیہ اور تاشقند کا پورا مسئلہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بڑا بیٹا محمود خاں جو کہ ان علاقوں کے آس پاس کے قبائل پر حکمراں تھا، فطری طور پر ان اضلاع کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ دوسری طرف دونوں تیموری بھائیوں، سلطان احمد اور عمر شیخ کا دعوا تھا کہ تاشقند و شاہ رخیہ کے علاقے یونس خاں کے قبضے میں صرف اختلافی حقوق کا فیصلہ ہونے تک عارضی طور پر دیے گئے تھے۔ عمر شیخ سیماب فطرت تو ہمیشہ سے تھا، اس نے ہی پہلا قدم اٹھایا۔ برسوں تک یونس خاں سے دوستی کی وجہ سے وہ منگولوں کی طاقت کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اپنے بھائی پر سبقت لے جانے کے لیے بے تاب ہوکر اس نے اپنی چھوٹی سی ریاست کے سارے وسائل اندھادھند ایک ہی داؤ پر لگا دیے۔ وہ اچانک دھاوا کرکے تاشقند کے ایک اہم قلعے اُشتر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن جیسا کہ اس کو پیش بینی سے کام لے کر پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا، محمود خاں کے اعلا تر وسائل کے سامنے وہ اُس پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے بہت کمزور تھا ــــ ”خان بزرگ“ نے جیسا کہ عام طور پر محمود خاں کو کہا جاتا ہے، اَپنے چھوٹے بھائی شمالی منگولستان کے حکمران احمد کو مدد کے لیے بلانے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، اُس نے خود ہی فوراً اُشتر پر حملہ کر دیا۔ ایک زبردست جنگ کے بعد طوفان کی طرح اس میں گھس پڑا اور قلعے کی فوج کو تہ تیغ کر دیا۔ عمر شیخ نے اپنی بہترین فوج اور کچھ عرصے کے لیے اپنی جارحانہ کارروائی کی طاقت ضایع کر دی۔ اس مجبورانہ بے کاری کے زمانے میں اسے یقیناً اپنے طاقت ور برادرِ نسبتی پر اپنے غیر دانش مندانہ حملے کے متعلق سوچنے اور افسوس کرنے کا کافی موقع ملا ہوگا۔[2]

---

[1] تاریخ رشیدی۔ ارسکن اول۔ ص ۶۰ [2] ایضاً

اب سلطان احمد مرزا کی باری تھی، اپنے بھائی عمر شیخ کی ہزیمت سے اسے کافی تسلی ہوئی ہوگی لیکن اپنے اعلا تر وسائل کے باوجود اس کو فرغانہ کے حکمران سے بھی کم از کم بدتر نتائج کا سامنا ہونے والا تھا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار فوج مجتمع کر کے اس نے دوسرے ہی سال تاشقند پر حملہ کر دیا۔ محمود خاں مقابلے کو بڑھا اور شہر دریائے سیموں کے درمیان مورچہ قایم کیا۔ بدقسمتی سے سلطان احمد کی فوج میں ایک شخص شاہی بیگ یا شیبانی تھا جس کا مزید تذکرہ ہم آئندہ کریں گے[1] اس شخص نے محمود خاں سے خفیہ ساز باز کیا اور خود اپنی طرف کی فوج کی ہزیمت کا منصوبہ طے کر دیا۔ ہوا یہ کہ محمود خاں نے اپنے حریف کو اُس دریا کے پار کرنے کا موقع فراہم کر دیا جس نے کہ دونوں فوجوں کو جدا کر رکھا تھا اور پھر اچانک ہی اُس پر سامنے سے حملہ کر دیا۔ غدار شیبانی اس وقت پیچھے سے ٹوٹ پڑا۔ دونوں طرف سے گھبرا کر سلطان احمد کی فوج میں افراتفری پھیل گئی اور آخر جس دریا کو ابھی پار کیا تھا، اس میں ہی اس کو دھکیل دیا گیا۔ خون ریزی زبردست ہوئی اور فوج کا بہت سا حصّہ دریا میں تباہ ہوگیا۔ اس تباہی کا بابر کی قسمت پر ایک اہم اثر پڑا۔

سلطان احمد محمود خاں کی طاقت کا ایک مفید احترام اپنے دل میں لیے ہوئے سمرقند لوٹ گیا۔ کچھ عرصے بعد ان سابقہ حریفوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا اور سلطان احمد نے اپنی ایک لڑکی کی شادی محمود خاں سے کر دی۔ لیکن فرغانہ کا عمر شیخ تجربے سے سیکھنے والا انسان نہ تھا۔ جیسے ہی اس کے پاس میدانِ جنگ میں ایک فوج اُتارنے کے لیے کافی وسائل جمع ہوئے اُس نے اپنے پڑوسیوں کے معاملے میں مداخلت کی پرانی پالیسی پر پھر عمل شروع کر دیا۔ آخر کار اس نے اپنے بھائی سلطان احمد مرزا اور برادرِ نسبتی محمود خاں کو اس کے خلاف پُر قوت اقدام کرنے پر مشتعل کر دیا۔ اُس کی مستقل سازشوں سے تنگ آکر انھوں نے ۱۴۹۴ء میں مصمم عزم کر لیا کہ اس کو اس کے علاقوں سے محروم کر دیا جائے اور اس طرح اس کو کوئی مزید آفت برپا کرنے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فرغانہ پر ایک متحدہ حملے کا منصوبہ تیار کیا۔ تاشقند سے روانہ ہو کر سلطان احمد کو دریائے سیموں کے جنوب میں سڑک کے ذریعے ملک میں داخل ہو کر براہِ راست راجدھانی اندجان پر حملہ کرنا تھا۔ اپنے بہتر وسائل کی مناسبت سے محمود خاں کو دریا کے شمال میں درّے سے گزر کر اخسی کے قلعے پر قبضہ کرنا تھا۔ حملے کے پہلے مرحلوں میں منصوبے کے مطابق عمل درآمد ہوا اور یقیناً ایسا نظر آنے لگا

---

[1] 'شیبانی نامہ' اور 'اشاریہ' کتاب ہٰذا۔

کہ فرغانہ کی قسمت پر تباہی کی مہر لگ گئی ہے۔ عمر شیخ نے ایک وہی واحد قدم اٹھایا جو ایسے حالات میں ممکن تھا۔ راجدھانی کو اپنے بڑے بیٹے بابر کے زیر حکم دے کر اور مشورہ دینے کے لیے خود اپنے اتالیق خدابردی[1] اور کچھ دوسرے معتمد بیگ سرداروں کو اس کے پاس چھوڑ کر وہ بذات خود خطرے میں گھرے ہوئے شمالی اضلاع کی طرف روانہ ہوگیا اور اخسی میں داخل ہو کر ایک آخری سرفروشانہ مزاحمت کے لیے تیار ہوگیا۔

اس نازک موقعے پر ایک عجیب واقعہ ہوا جس کی وجہ سے فرغانہ بچ گیا۔ عمر شیخ مرزا کو اپنے بہت سے ترکی خاندان والوں کی طرح لوٹن کبوتر پالنے اور تربیت دینے کا انتہائی شوق تھا۔ ایک دن وہ اخسی میں ایک کبوتر خانے میں داخل ہوا جو ایک پہاڑی کے پہلو پر بنا ہوا تھا اور اس پہاڑی کا ڈھال نیچے کی طرف دریا تک چلا گیا تھا۔ بنیاد کمزور ہونے کی وجہ سے کبوتر خانہ اس پر آپڑا اور وہ فوراً ختم ہوگیا۔[2] یہ واقعہ دوشنبہ کے روز ۸ جون ۱۴۹۴ کو ہوا۔

پہلی نظر میں تو سلطنت کے لیے اس سے زیادہ تباہ کن اور کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ دو طاقت ور فوجیں سرحد میں داخل ہو چکی تھیں اور مرحوم حکمران کا سب سے بڑا بیٹا بابر صرف گیارہ سال کا تھا لیکن درحقیقت عمر شیخ کی موت نے وہ واحد رشتہ توڑ دیا جو دشمنوں کو ایک مشترکہ مقصد کے تحت متحد کیے ہوئے تھا۔ اُس سے ہی وہ دونوں نفرت کرتے تھے۔ اس کے بیٹے سے انھیں کوئی پرخاش نہ تھی۔ سلطان احمد مرزا اور محمود خاں دونوں ہی فرغانہ کے خواہش مند تھے اور اس طرح ہر ایک اس بات پر نارضامند تھا کہ فرغانہ دوسرے کے قبضے میں چلا جائے۔ ساتھ ہی یہ تو طے تھا کہ صوبے کو تسخیر ضرور کرلیا جائے لیکن دونوں میں سے ہر ایک حملہ آور دوسرے پر نظر ضرور رکھے ہوئے تھا۔ اس طرح ہر چیز کا انحصار اب ولی عہد کی شخصیت پر تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اس کا انجام بھی پریوں کی کہانیوں والے "حقیقی شاہزادۂ ولی عہد" کا سا ہوگا، یا وہ اپنے ان دو

---

[1] ملاحظہ ہو پی۔ ڈی۔ کوریل۔ اول، ص ۲۵ اور المنسکی، ص ۱۶ ـــــ خدابردی کو سلطان ابو سعید کی دولت سرا کا ناظم بنایا گیا تھا اور بابر نے اس کی زبردست انتظامی قابلیت کا تذکرہ کیا ہے۔

[2] نہ تو 'بابر نامہ' اور نہ ہی 'تاریخ رشیدی' سے ارسکن کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ کبوتر خانہ اور عمر شیخ سب دریا میں گر پڑے۔ یہ سوچنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ پہاڑی جس پر کہ عمارت بنی تھی وہ عمودی تھی۔

"شیطان فطرت پچاؤں" کے ارادوں کو ناکام بنا دے گا؟

ظہیر الدین محمد، المعروف بہ بابر بروز جمعہ بتاریخ ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء، پیدا ہوا تھا۔ اس طرح جب اس کے والد کی اچانک وفات پر اسے تخت ملا، تو وہ صرف ۱۱ سال اور ۴ مہینے کا تھا۔ اس کے دو سوتیلے بھائی جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا اس سے بالترتیب دو اور چار سال چھوٹے تھے۔ اس کے ابتدائی لڑکپن کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس نے یہ زمانہ بیشتر اپنے استادوں کے ساتھ گزارا، جن سے کہ اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اس کی تعلیم انتہائی عمدہ ہوئی تھی۔ وہ خوش خط تھا اور بعد میں اس نے کچھ قابلِ غور شعری نمونے بھی تخلیق کیے[۱]۔ اس کے زمانے کے حالات اور حسب و نسب کے پیشِ نظر یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک قابلِ تعریف شہ سوار، عمدہ نشانہ باز، ایک ماہر شمشیر زن اور ایک زبردست شکاری تھا۔ اپنے والد کی جگہ لینے سے بھی پہلے وہ اس بات کا ثبوت دے چکا تھا کہ لوگوں کے رہنما کی حیثیت سے اس میں کچھ معمولی صفات نہیں تھیں۔ اس امر سے کہ اپنے والد کے اخسی جانے کے بعد ان کی عدم موجودگی کے دوران اس کو راجدھانی کی حکومت کے لیے انتخاب کیا گیا تھا، کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوتی، کیوں کہ اس زمانے میں تو گود والے بچے بھی بعض اوقات نام کے لیے ایک حملہ آور فوج کے کمانڈر مقرر کر دیے جاتے تھے[۲]۔ لیکن اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی طوفانی مہینوں میں اس نے جو کارنامے انجام دیے اُن کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں خواندمیر کے وہ بیانات قابلِ یقین محسوس ہونے لگتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر اپنی عمر سے کہیں زیادہ غیر معمولی اوصاف کا مالک تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندجان اپنے نوخیز گورنر کا فرماں بردار ہو گیا تھا جس کی کردار شناسی اور قوتِ مشاہدہ کی تیزی ابتدائی عمر کے باوجود اُن لفظی خاکوں سے کافی واضح ہو جاتی ہے جو اس نے اُن لوگوں کے متعلق پیش کیے ہیں جن سے اسے لڑکپن کے دور میں واسطہ پڑا تھا۔ ملاحظہ ہو یہ اثر پرستانہ خاکہ جو کہ اس نے اپنے والد عمر شیخ مرزا کے متعلق پیش کیا ہے اور یہ امر ذہن میں رکھیے کہ بابر نے اس کو آخری مرتبہ گیارہ سال کی عمر

---

[۱] اس کی ترکی نظموں کے مشہور و مختصر رامپوری نسخے میں بابر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطور ہیں۔

[۲] ملاحظہ ہو وہ معرکہ جس کی برائے نام کمان شیر خوار شاہ طہماسپ کو سونپی گئی تھی۔ 'حبیب السیر' اور 'احسن السیر' ایک اور مثال مراد مرزا کی ہے جو کہ ۱۵۴۵-۱۵۴۴ء میں ہمایوں کے ایرانی مددگاروں کے ساتھ تھا۔

میں دیکھا تھا:[1]

" وہ ایک چھوٹے قد، بھاری مضبوط اور بھرے بھرے چہرے کے انسان تھے۔ وہ اس قدر چست قبا پہنتے تھے کہ باندھتے وقت پیٹ اندر کرنا پڑتا تھا اور باندھنے کے بعد اگر وہ اپنے کو ڈھیلا چھوڑ تے تھے تو اکثر بند ٹوٹ جاتے تھے۔ کھانے اور کپڑے کے معاملے میں ان کی کوئی خاص پسند نہ تھی۔ وہ یک تہہ صافہ باندھتے تھے۔ اس زمانے میں سب صافے چار تہہ ہوتے تھے، لوگ انھیں بغیر بل دیے باندھتے تھے اور سرے لٹکے چھوڑ دیتے تھے۔ گرمی میں وہ سوائے اپنے دربار کے باقی وقت مغلی ٹوپی پہنے رہتے تھے۔ مزاج شاعرانہ تھا مگر شعر کہنے کا شوق نہ تھا۔ وہ اتنے عدل پسند تھے کہ جب انھوں نے سنا کہ ایک کارواں چین سے لوٹتے ہوئے مشرقی اندجان کے پہاڑوں میں برف میں دب گیا ہے اور اس کے ایک ہزار راس گھوڑوں میں سے صرف دو زندہ بچے ہیں تو انھوں نے اپنے ناظروں کو تمام سامان تحویل میں لینے کے لیے بھیجا اور اگرچہ کوئی وارث قریب نہ تھا اور وہ خود حاجت مند تھے مگر انھوں نے خراسان اور سمرقند سے وارثوں کو بلایا اور ایک دو سال کے عرصے میں سارا سامان بحفاظت ان کے سپرد کر دیا۔"

ایسے خاکے بے شمار پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن (مثال کے لیے) ایک اور کافی ہوگا

" علی دوست طغائی میری نانی کا رشتہ دار تھا۔ میں نے عمر شیخ مرزا سے بھی زیادہ اس پر مہربانیاں کیں۔ لوگ کہتے تھے 'وہ کچھ کام کر دکھائے گا' لیکن میرے ساتھ اس نے بہت سال گزارے اور کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہ دیا۔۔۔ وہ فطرتاً اور عادتاً بے مصرف، کنجوس، سخت گیر، فتنہ پرور، فریبی، خود پرور، بد زبان اور سر درد انسان تھا۔[2]"

ان فہیمانہ نقوش کے مصور کو اُن مشکلات کے نرغے میں اپنے حواس قایم رکھنے کے لیے جن سے وہ محصور تھا، اپنی تمام مستعدی کی ضرورت تھی۔ عمر شیخ مرزا کے حادثے کے وقت بابر اپنے موسم گر

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ)، ص ۱۴۔ پی۔ ڈی۔ کورٹیل، اول، ص ۱۲، ۱۳۔ المنسکی، ص ۸

[2] اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ)، ص ۲۷، ۲۸

کے مستقر اندجان کے چہار باغ میں تھا۔ یہاں اُسے اپنے والد کے انتقال کی خبر بروز منگل ۹ جون کو ملی۔ اپنی نوعمری کے باوجود اُس نے بہت عزم و فیصلے سے کام لیا۔ پہلا کام بدیہی طور پر قلعے کی طرف سے اطمینان کرلینا تھا۔ وہ فوراً اپنے مصاحبوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوا اور ابھی شہر میں داخل ہونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس کے ایک بیگ امیر[1] کے دماغ میں معاً ایک شبہ پیدا ہوا۔ احمد مرزا کثیر فوج کے ساتھ ملک پر حملہ کر رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اندجان کے قلعے کی فوج نوعمر شہزادے کو گرفتار کرلے اور ملک کو تباہی سے بچانے کے لیے اس کو اس کے چچا کے حوالے کر دے؛ اُس نے اس خدشے کا اظہار اپنے آقا سے کیا جس کو فوراً ہی اس سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے کا احساس ہوگیا۔ یہ فیصلہ تقریباً ہو ہی چکا تھا کہ نوعمر شہزادہ اوزقند کی پہاڑیوں میں چلا جائے کہ یہ بات شہر پناہ کے اندر وفادار بیگ امرا کے کانوں میں پڑی۔ اپنے نئے آقا کے خلاف غداری کا خیال تک اُن کو آ کر نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بابر کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے تیزی سے قدم اُٹھایا۔ شہزادے کا احترام بجالانے کے لیے اس کے والد کے پرانے خادم اردگرد کے علاقے سے غول درغول قلعے میں جمع ہوگئے اور محنت و مشقت کے ساتھ قابل مدافعت علاقوں کے حصار اور دمدمے درست کرنے لگے۔ بابر لکھتا ہے:

"میری خدمت میں حاضر ہونے کے بعد وہ سب مل کر ایک دل و دماغ کے ساتھ اور پوری تندہی و قوت سے قلعہ کو بچانے میں لگ گئے"۔[2]

حالت تیزی سے نازک ہوتی جارہی تھی۔ بابر کے ۹ سالہ بھائی جہانگیر کی برائے نام قیادت میں اور عمر شیخ مرزا کے انتہائی معتمد و بہترین جنگ آزماؤں کے مشورے سے اُخسی شمال میں ابھی تک مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا، لیکن جنوب میں حالات بہت تاریک نظر آرہے تھے۔ سلطان احمد خوف ناک رفتار سے بڑھتا ہی چلا آرہا تھا اور اپتہ، خوجند اور مرغیلان ایک کے بعد ایک اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکے تھے اور آخرکار اس نے پائے تخت سے صرف تھوڑی دور اپنے خیمے گاڑ دیے تھے۔ اُس کو نزدیک آتا دیکھ کر قلعے کی فوج میں بہت سے سپاہیوں کے دل یقینی طور پر اس تشویش سے دھڑکنے لگے ہوں گے کہ ان کا کم عمر آقا اپنے چچا کے برتر وسائل کا مقابلہ کرنے کی اُمید کیوں کر کرسکتا ہے؟ اندجان کے کم ازکم ایک اہم فرد درویش گاؤ نے بابر کے بقول کچھ "نامناسب تجاویز"

---

[1] شیرم طغائی۔ [2] اے۔ ایس۔ بیورج (بابرنامہ)، ص ۳۰

رکھیں، بلاشبہ ان تجاویز کا مقصد یہ ہوگا کہ سمرقندی افواج کی واپسی کی قیمت ادا کرنے کے لیے نوجوان شہزادے کو چچا کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن اس کو فوراً ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور غدار کو فوری سزا مل جانے سے قلعہ بند فوج کا اتفاق رائے از سر نو بحال ہوگیا۔ لیکن قلعے بند ہو کر محاصرین کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرنے سے پہلے بابر کی جماعت نے حملہ آور افواج سے دوستانہ سمجھوتے کی کوشش کی۔ سلطان احمد کے سامنے جو تجاویز پیش کی گئیں اُن کو بابر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"آپ خود اس ملک پر اپنا ایک خادم مامور فرمائیں گے اور میں خود خادم بھی ہوں اور عزیز بھی، اس لیے آپ یہ خدمت میرے سپرد فرما کر انتہائی اطمینان و آسانی سے اپنا مقصد حاصل کر سکیں گے"[1]

لیکن مفاہمت کی یہ عمدہ کوشش ناکام رہی۔ بابر کہتا ہے:

"سلطان احمد بہت نرم خو، کمزور طبع اور کم گو انسان تھے۔ وہ اپنے امرا کے مشورے کے بغیر کسی رائے یا معاہدہ، کسی اقدام یا حرکت کا فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ہماری تجویز پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا بڑا سخت جواب دیا اور آگے بڑھ گئے"[2]

حالات ابھی اسی مرحلے پر تھے اور قلعہ بند فوج محاصرے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ اچانک معاملے کا رُخ ہی بدل گیا۔ حملہ آور فوج تقریباً اندجان کی فصیلوں کے نیچے آ کر رُک گئی اور بہت فیاضانہ شرائط پیش کیں۔ سلطان احمد کے رویے کی اس تبدیلی کے کئی اسباب تھے۔ اوّل یہ کہ اس علاقے کے دیہاتی باشندوں کی وفاداری نے اس کے حوصلوں کو بہت پست کر دیا تھا۔ بقول بابر:

"ہمارے سپاہیوں اور کسانوں میں انھوں نے (حملہ آوروں نے) ایسی مستقل مزاجی اور یک دماغی پائی کہ جب تک ان کے جسم میں سانس اور طاقت تھی وہ اپنی جانوں کو قربان کرنے سے ہرگز گریز نہ کرتے"[3]

دوم یہ کہ سمرقندی افواج کے گھوڑوں میں ایک مہلک وبا پھیل گئی جس سے وہ غول در غول مرنے

---

[1] الفنسکی، ص ۲۰ [2] ایضاً، ص ۲۰، ۲۱

[3] اے۔ایس۔ بیورج (بابر نامہ)، ص ۳۱

لگے۔ لیکن آخری وجہ جس نے سلطان احمد کو مجبور کر دیا کہ اپنے بھتیجے کو امن سے چھوڑ کر چلا جائے یہ تھی۔ سلطان احمد کو قبا سے روانہ ہو کر ایک دلدل جیسے گہرے پانی کو پار کرنا پڑا جس پر صرف ایک پل تھا۔ تنگ پیدل راستے پر حد سے زیادہ ہجوم ہو گیا جس کے باعث کثیر تعداد میں آدمی، گھوڑے اور اونٹ راستے سے لڑھک گئے اور دلدل میں بری طرح تباہ ہو گئے۔ اس حادثے سے سات برس پرانی سیموں کی تباہ کاری کی یاد ایسی دہشت خیزی کے ساتھ تازہ ہو گئی کہ سلطان احمد کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب اس کی بس یہی خواہش تھی کہ بدقسمتی کے دوبارہ نزول سے پہلے ہی وہ ملک سے نکل جائے۔ بلا نتیجتاً اس نے جلدی سے اپنے بھتیجے سے صلح کی اور سب نے حیرت سے دیکھا کہ وہ جتنی تیزی سے بڑھا تھا اتنی ہی پھرتی سے لوٹ گیا۔ اس طرح غیر متوقع طور پر یہ قریب ترین خطرہ بابر کے سر سے ٹل گیا۔

لیکن ابھی ایک اور دشمن قوت اس کے علاقے میں موجود تھی، اس کا ماموں خاقان محمود دریا کی شمالی سمت سے بڑھ رہا تھا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، بھوتے کے مطابق اس نے اخسی کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن قلعہ بند فوج نے علی درویش بیگ، مرزا قلی کوکلتش اور دوسرے لوگوں کی رہنمائی میں ایک سرفروشانہ مزاحمت کی۔ نوعمر جہانگیر مرزا کی موجودگی ان کی وفادارانہ خدمات کے لیے بلاشبہ ہمت افزائی کا سبب بنی۔ قلعے والی فوج اتنی عمدگی سے لڑی کہ محمود نے جس کی ہمت اپنے حلیف سلطان احمد کی غیر متوقع پسپائی سے پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ سوائے سخت نقصان کے کچھ پانے کی توقع نہیں، واپس لوٹنے ہی میں خیر دیکھی۔ اسی درمیان وہ بیمار پڑ گیا اور حتی الامکان نیک نامی کے ساتھ واپس ہونے کے لیے اس نے بیماری کے عذر سے فائدہ اٹھایا۔

ابھی ایک اور حریف ابابکر دوغلت کاشغری باقی تھا جو کاشغر و ختن کا کچھ عرصے سے حاکم تھا اور فرغانہ کے مصائب سے فائدہ اٹھا کر اس نے اوزکند کے جوار میں ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ اس مقام تفوق سے اس نے آس پاس کے علاقے میں لوٹ مار مچا دی۔ جیسے ہی بابر کو اپنے قوی تر حریفوں سے نجات ملی اس نے ابابکر کی طرف توجہ دی۔ حالات کی اس تبدیلی سے ابابکر سکتے میں رہ گیا تھا۔ خیریت سے گھر واپس جانے کی اجازت پا کر وہ بہت خوش ہوا۔

بابر کی جماعت کو اب ایک لمحہ سکون کا نصیب ہوا تو انھوں نے اس کا بہترین ممکن فائدہ

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج (بابر نامہ)، ص ۳۱۔ الفنسکی، ص ۲۱

اُٹھایا۔ اس کے والد کے خاندان والے اَخسی سے اندجان آئے تو عزاداری کی رسمیں پوری ہوئیں۔ اور نوجوان شہزادے نے انتظامِ مملکت اور فوجی تنظیم پر توجہ کی۔ اس زمانے میں معاملات کی حقیقی سربراہ اس کی نانی ایسن دولت بیگم تھی جس کے دانش مندانہ مشورے بہت حد تک بابر کی کامیابی کے ذمہ دار تھے۔ شاید اس کے ہی اشارے پر اندجان کی حکومت اور امیر حاجب کا عہدہ حسن بن یعقوب[1] کو ملا۔ اوزون حسن اخسی کا حاکم ہوا اور مرغلان علی دوست طغائی کو تفویض ہوا۔ دیگر امرا کو جنھوں نے حالیہ مصائب میں وفاداری کا ثبوت دیا تھا، فرداً فرداً ذاتی حالات کے مطابق زمین، عہدہ یا روپیہ وغیرہ دیا گیا۔[2] آخر میں فوج کی بہت احتیاط سے تنظیم کی گئی، یقیناً نئے تقرر شدہ افسروں کے ماتحتوں کی خدمات کا بھی صحیح اندازہ لگایا گیا ہوگا۔

ابھی تنظیم نو کا کام مشکل ہی سے ختم ہوا ہوگا کہ سیاسی حالات میں ایک اور حیران کن تبدیلی کی اطلاع ملی۔ فرغانہ کی مہم کے دوران سلطان احمد مرزا کی صحت خراب ہی چل رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے غیر متوقع طور پر اس مہم کو ختم کرنا پڑا تھا۔ وسط جولائی ۱۴۹۴ء میں وہ اچانک ہی چل بسا۔ اُس کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس لیے مشورے کے بعد امرا نے اُس کے چھوٹے بھائی سلطان محمود مرزا کو جو کہ بدخشاں و اصغرہ و ہندوکش پہاڑوں کے درمیانی اضلاع پر حکمران تھا، تخت کی پیش کش کی۔ سلطان محمود مرزا نے اس پیش کش کو قبول کرلیا، اور حصار ایک بیٹے کو اور بخارا دوسرے کو سپرد کر کے خود سمرقند آگیا۔ وہ بغیر کسی مخالفت کے تخت نشین ہوگیا۔ اپنی اور اپنے بھائی کی سلطنت پر قابض ہوجانے کے بعد اس کے وسائل بہت بڑھ گئے —— ایک سخت گیر حکمران اور ایک امتیازی صلاحیت کا منتظم ہونے کی وجہ سے اس نے تیزی سے اپنے نئے صوبوں میں امن و امان قائم کردیا۔ سمرقند کے امرا کو جلد ہی یہ مایوس کن اور ہولناک احساس ہوگیا کہ انھوں نے ایک "شاہ شطرنج" کی جگہ ایک "شاہ صد رنج" کو چُن لیا ہے۔ اُس نے اپنے دو عزیزوں کو مروا ڈالا اور تین کو قید کردیا۔ ہر طرح

---

[1] 'بابر نامہ' میں لکھا ہے کہ حسن یعقوب.... چھوٹے ذہن، اچھے مزاج کا بہت پھرتیلا انسان تھا۔ وہ ایک بہت بہادر شخص، اچھا تیرانداز اور چوگان کا کھلاڑی تھا۔ بابر نے (بیورج۔ بابر نامہ، ص ۲۶) اسے فسادی طبیعت بھی بتایا ہے۔ (مترجم)

[2] امرا کو بابر کے الفاظ میں ولایت (علاقہ) ییر (زمین) موجہ (عہدہ) اور وجہ (نقدی) وغیرہ دی گئیں۔ بیورج۔ بابر نامہ، ص ۲۶۔ (مترجم)

کی مخالفت سے بے خطر ہو کر اس نے مال گزاری میں ترمیم کر دی اور جن لوگوں کو ان کی تقدیس کی وجہ سے محاصل سے بری رکھا گیا تھا، انھیں بھی ادائگی پر مجبور کر دیا۔ اس بات پر علما نے غضب ناک شور و غوغا برپا کر دیا جس نے اس کی ذاتی بدکارانہ زندگی کے ساتھ مل کر سلطان محمود مرزا کو انتہائی غیر مقبول بنا دیا۔ لیکن اس کا اقتدار اس قدر زبردست تھا کہ اس کو ہلانا محال تھا۔ اس نے اپنی نئی رعایا کے بڑبڑانے کی کوئی پروا نہ کی اور حرم کر اپنی پالیسی پر عمل کرتا رہا[1]

جلد ہی وہ مزید تصرفات کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ اُس کو خیال آیا کہ فرغانہ، نہ صرف اس کے مقبوضات میں ایک پسندیدہ اضافہ ہوگا بلکہ سازش کے لیے اچھا میدان بھی رہے گا۔ (وہاں کا) حکمران کم عمر و ناتجربہ کار ہے۔ علاوہ ازیں اُس کے دو چھوٹے بھائی ہیں جن کو اس کھیل میں آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے اور متعدد جاہ پرست امرا بھی ہیں جو نوعمر بادشاہ کی مرضی کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنے میں ناکام ہو کر مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ ان خیالات کے مطابق اس نے بابر کو مبارک باد دینے کے لیے ایلچی بھیجا، تو اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر بابر کے حاجب حسن بن یعقوب کو جو کہ اندجان کا حاکم تھا اپنی طرف ملانے کی کوشش کی[2]

پانچ چھ ماہ بعد یعنی (۱۴۹۴ء) کے آخر میں بابر نے اپنے آپ کو ایک زبردست سازش میں گھرا پایا۔ حسن یعقوب نے اپنے آقا کو ہٹا کر اس کی جگہ نوعمر جہانگیر کو تخت نشین کرنے کی سازش کی، اُسے امید تھی کہ وہ ایک آسان آلۂ کار ثابت ہوگا۔ اُس نے چند غیر مطمئن امیروں کو اپنی طرف ملانے میں کامیابی حاصل کر لی، اگرچہ اکثریت بابر کی وفادار رہی —— اس بحران کا مقابلہ کرنے کی

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج (بابر نامہ)، ص ۴۰-۴۴۔ حبیب السیر۔ بی۔ ڈے کورٹیل۔ اول، ص ۴۹، ۵۰۔ المنتکی، ص ۳۱۹

[2] اس سفارت کے متعلق بابر کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

"اس سال (۱۴۹۵ء) محمود مرزا نے اپنے ایک ایلچی عبدالقدوس کے ذریعے (اپنے بیٹے) مسعود مرزا کی شادی صالحہ بیگم دختر سلطان احمد کے ساتھ (کرنے کے بعد) ایک تحفہ (بابر کو) بھیجا۔ اس ایلچی اور حسن یعقوب میں کوئی قریبی رشتہ تھا اور اس کے بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ لالچ دے کر حسن یعقوب کو سلطان محمود کی طرف کر لیا جائے۔ ایلچی کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ اس بات ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پانچ چھ ماہ ہی میں حسن یعقوب کے انداز بدل گئے اور وہ امرا سے بدسلوکی کرنے لگا۔"

—— اے۔ ایس۔ بیوریج (بابر نامہ)، ص ۴۳

ذمہ داری دانش مند ایسن دولت بیگم نے سنبھالی[1] وفاداروں کا ایک اجتماع اس کے حضور میں منعقد کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ پہلی ضرب خود ہی لگائی جائے۔ حسن یعقوب شکرہ کے ذریعے شکار کیلئے گیا ہوا تھا۔ قلعے سے اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اُس کے معتمد ترین ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ خبر پاتے ہی قیاساً سلطان محمود مرزا کی عملی مدد حاصل کرنے کے لیے حسن فوراً سمرقند روانہ ہو گیا۔ اپنے آقا کے سامنے خالی ہاتھ جانا اُسے پسند نہ تھا، اس لیے وہ اخسی پر قبضہ کرنے کے لیے سیدھی سڑک کو چھوڑ کر مڑ گیا۔ بابر نے اس سے آگے بڑھ کر اس کو روکنے کے لیے کچھ لوگوں کی ایک جماعت فوراً بھیج دی اور ایک شب خون میں غدار اپنے ہی ایک آدمی کے اتفاقیہ تیر سے ختم ہو گیا[2] یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ لیکن آلۂ کار کو ختم کرنے کے بعد اصل شخص (محمود مرزا) کا فیصلہ ابھی باقی تھا، اس نازک لمحے میں قسمت نے ایک بار پھر بابر کا ساتھ دیا اور سلطان محمود مرزا جنوری ۱۴۹۵ء میں اچانک ہی چل بسا۔

ایک دم ہی اس کی تمام مملکت میں گڑبڑ پھیل گئی اور پانسا بالکل ہی پلٹ گیا۔ جنوب اور مغرب کی طرف سے ایک طاقت ور ہمسایہ کا خطرہ لاحق ہونے کے بجائے جو اس کو ہضم کرنے کے لیے بے تاب تھا، بابر نے اب اپنے مقابل ایک منتشر سلطنت پائی جس کے معاملات میں وہ اپنے مفاد کے لیے مداخلت کرنے کی بڑی آسانی سے اُمید کر سکتا تھا۔ جیسے ہی سلطان محمود مرزا کی آنکھیں بند ہوئیں، ایک مرحوم سلطان کے علاقوں پر قبضہ کے لیے حسبِ معمول جد و جہد شروع ہو گئی۔ اُس نے پانچ بیٹے چھوڑے تھے مگر فی الحال ہمیں صرف تین، یعنی سلطان مسعود مرزا، سلطان بائسنغر مرزا اور سلطان علی مرزا سے مطلب ہے[3] اپنے باپ کی وفات کے وقت بڑے دونوں بیٹے غیر موجود اور اپنی اپنی حکومتوں میں تھے —— سلطان مسعود مرزا حصار میں اور بائسنغر مرزا بخارا میں —— نتیجتاً وزیر خسرو شاہ نے ایک بے باکانہ کوشش کے ذریعے سمرقند اور شاہی خزانے پر قبضہ کرنا چاہا لیکن واجب طور پر اور بے حد غیر مقبول ہونے کی وجہ سے ایک عام بغاوت نے اُسے راجدھانی سے نکال دیا اور وہ محافظین کے پہرے میں حصار پہنچا دیا گیا۔ امرا کی ایک مجلس میں

---

[1] اپنے نواسے کے معاملات میں اس کے اختیارات کے سلسلے میں دیکھیے۔ اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۴۳۔ المنسکی ص ۳۱

[2] اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۴۳۔ حبیب السیر۔

[3] باقی دو بیٹے سلطان حسین مرزا اور سلطان ویس مرزا تھے۔ اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۴۷

(محمود مرزا کے) دوسرے بیٹے بائسنغر مرزا کو جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ بڑے بیٹے مسعود کو نظر انداز کرنے کی وجہ بظاہر اس کی کمزور شخصیت تھی۔ لیکن ابھی مشکل سے بائسنغر سمرقند کے تخت پر بیٹھا تھا کہ نئی پریشانیاں شروع ہو گئیں۔ جنید برلاس اور دوسرے امرا کی قیادت میں ایک غیر مطمئن جماعت نے خاقان محمود کو مداخلت کی دعوت دی۔ خاقان کے ایک انتہائی تجربہ کار سپہ سالار حیدر کوکلتش کی کمان میں منگولوں کی ایک طاقت ور فوج نے ملک پر فوراً حملہ کر دیا مگر بائسنغر نے اپنی وراثت کی خاطر ایک زبردست ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ باہر نکلا اور حملہ آوروں کو کن بائی کے قریب ایک زبردست شکست دی۔ بائسنغر کی موجودگی میں اتنے قیدیوں کا سر کاٹا گیا کہ تین دفعہ اس کا خیمہ ہٹانا پڑا کیوں کہ زمین لاشوں سے پٹ گئی تھی[1]

بابر سمرقند کے حالات بہت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے باپ کی طرح، خود اس کے انتہائی ابتدائی خواب اس شہر سے متعلق رہے تھے جس کا نام ناقابل انقطاع طور سے امیر تیمور کی شوکت و عظمت سے وابستہ تھا۔ بس کسی طرح وہ اپنے عظیم مورث کے تخت پر بیٹھ سکتا تو شہرت اس کے قدم چومتی اور وہ مطمئن مر سکتا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس طرح کے منصوبے کی طرف توجہ کر سکتا، کچھ اور بھی معاملات گھر کے اور زیادہ قریب موجود تھے جن کو طے کرنا ضروری تھا۔ خجند جس پر بابر کے والد مدت تک اپنا حق سمجھتے رہے تھے، عالیہ مصائب کے دوران فرغانہ کے تصرّف سے نکل گیا تھا اور اب سمرقند کا ایک ماتحت ضلع تھا۔ ایک اور ضلع اورا تیپہ کا بھی، جو پہلے عمر شیخ کے تصرف میں تھا، یہی حشر ہوا تھا اور اب وہ بائسنغر مرزا کی طرف سے اس کے بھائی سلطان علی مرزا کے پاس تھا۔ آخری بات یہ تھی کہ کاشغر و فرغانہ کے درمیان جو قبائل آباد تھے اُن میں سے ایک قبیلہ خراج کی ادائیگی کے متعلق دشواریاں پیدا کر رہا تھا۔ اتنی کچھ ذمہ داریوں کی موجودگی میں بابر کو بائسنغر مرزا کے ساتھ اچانک جنگ میں اُلجھ جانے سے ضرور کچھ نہ کچھ جھنجھلاہٹ ہوئی ہوگی۔ سمرقند کے نئے سلطان کی نمایاں خواہش تھی کہ بابر کے خلاف جو منصوبے سلطان محمود کی موت کی وجہ سے ادھورے رہ گئے تھے ان کی تکمیل کا کام جاری رکھے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے عمر شیخ مرزا کے پرانے خادم و منگول سردار ابراہیم سارو کو اپنی طرف ملا لیا۔ اس شخص نے فرغانہ کی مغربی سرحد پر واقع ایک قلعہ اسفرہ پر قبضہ کر لیا اور بائسنغر کی

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۵۲۔ پی۔ ڈے کورٹیل، اول، ص ۶۴ (المنتکی، ص ۳۸)

طرف داری کا اعلان کر دیا۔ بابر کی خوش قسمتی سے یہ اعلان بے محل تھا، ٹھیک اسی موقع پر سلطان احمد تنبل کو خاقان محمود کے مقابلے پر جانا تھا اور وہ ابراہیم سارو کو کوئی مدد نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس طرح بابر کے پاس اتنا وقت تھا کہ اس ہونے والی بغاوت کو ابتدا ہی میں ختم کر ڈالے۔ تیز کارروائی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بابر مئی ۱۴۹۵ء میں اسفرہ پر حملے کے لیے اندجان سے روانہ ہوگیا۔ مہینے کے اختتام تک اس نے قلعے کا اس طرح محاصرہ کر لیا کہ کہیں سے مدد کا کوئی امکان نہ رہا۔

آخر قلعے والوں کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ ابراہیم سارو نے اطاعت پر مراجعت کر لی اور اس کے ساتھ ایک بار پھر تلطف و کرم کا برتاؤ کیا گیا۔ اس کامیابی سے سرشار ہوکر بابر نے ایک اور کامیابی کے لیے خجند پر حملے کا ارادہ کر لیا۔ بائسنغر منگولوں سے ڈلھا ہوا تھا اور سپہ سالار نے غالباً مدد سے مایوس ہوکر یہ مقام فوراً بابر کے سپرد کر دیا۔

قسمت کی بات تھی کہ اتفاقاً اس وقت خاقان محمود قریب کے صوبہ شاہ رُخیہ میں تھا۔ بابر کو خیال آیا کہ اگر چل کر ماموں سے مل لیا جائے تو بڑی دانش مندی کی بات ہوگی۔ اس طرح نہ صرف ملک کے حالات کا اندازہ ہو جائے گا بلکہ خان کو یہ بھی یقین دلادیا جائے گا کہ اخسی پر اُس کے حملے سے کسی طرح کا دل میں میل نہیں آیا۔ ماموں بھانجے کی ملاقات اگرچہ کافی رسمی تھی لیکن جیسی بھی ہوئی بظاہر بہت اطمینان بخش رہی۔

> "خان سے میری ملاقات اس باغ میں ہوئی جو حیدر کوکلتش نے شاہ رخیہ کے باہر لگایا تھا۔ وہ ایک بڑے چہار درخیمے میں بیٹھے تھے جو باغ کے بیچ میں نصب تھا۔ خیمے میں داخل ہوکر میں تین بار دو زانو ہوا۔ انھوں نے بھی اُٹھ کر میرا احترام کیا۔ ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور میں اپنی جگہ واپس آگیا۔ جب میں دو زانو ہو چکا تو اُنھوں نے مجھے اپنے پاس بلالیا اور میرے ساتھ بہت شفقت اور دوستی (مودّت) سے پیش آئے۔"[1]

دو دن بعد بابر اندجان کے لیے روانہ ہوگیا اور اپنی نادہند رعایا سے خراج کی بقایا وصول کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کر دی۔ اس مہم میں بھی مکمل کامیابی ہوئی اور فوج ۲۰ ہزار بھیڑیں اور ایک ہزار پانچ سو گھوڑے قبائلیوں سے ضبط کر کے اپنے ساتھ راجدھانی میں لے آئی۔ اب آخری مہم

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج (بابر نامہ) ، ص ۵۴

اُوراتیپہ کی رہ گئی تھی۔ یہاں بابر کو ایک رکاوٹ پیش آئی۔ جب سلطان علی مرزا نے فرغانہ کے فوجی دستوں کی آمد سُنی تو وہ بہ عجلت تمام وہاں سے چلتا بنا، لیکن اُس نے اپنے سرپرست شیخ ذوالنون ارغن کو کافی فوج کے ساتھ وہاں چھوڑ دیا۔ بابر جب پہنچا تو اُسے وہ جگہ اپنی طاقت کے مقابلے میں بہت مستحکم نظر آئی اور وہ اندجان لوٹ گیا۔ لیکن بعدہٗ جلد ہی اس کے ماموں خاقان محمود نے اُوراتیپہ پر حملہ کردیا۔ وہ بابر سے زیادہ کامیاب رہا کیوں کہ اُس نے اُوراتیپہ پر قبضہ کرلیا اور اسے (اُوراتیپہ) محمد حسین دوغلت کے سُپرد کردیا جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

بابر مجموعی طور پر کافی مطمئن ہوکر اپنی راجدھانی لوٹ آیا۔ اُس نے بغاوت کُچل دی تھی، اُس نے خراج وصول کرلیا تھا اور اس نے ایک اہم مقبوضہ کو واپس لے لیا تھا۔ اب وہ آئندہ کوششوں کے لیے اپنے وسائل کی تنظیم میں لگ گیا۔ اسی دوران سمرقند کے سلطان بائسنغر مرزا کے معاملات میں دلچسپی کا بہت کچھ سامان مل گیا۔

سمرقند کی بدقسمت سلطنت نے خاقان محمود کی منگول فوج کو مار بھگانے کے بعد اب اپنے آپ کو ایک نئے اور انتہائی خوفناک حریف کے مقابل پایا —— سلطان حسین بیقرہ جو امیر تیمور کے بڑے بیٹے کی نسل سے تھا، خراساں کا حکمراں تھا اور اپنے خاندان کے شہزادوں میں سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اپنے پائے تخت ہرات سے وہ ایک وسیع سلطنت پر فرمانروائی کرتا تھا۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ اور علوم و فنون کا ایک فیاض و صاحب بصیرت 'مُربّی' تھا۔ اس کا دربار تمام ایشیا میں سب سے زیادہ تابناک تھا۔ لیکن وہ بہت عزم پرست اور خودغرض تھا اور اپنے پڑوسیوں کے نقصان پر اپنے علاقوں کی توسیع کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا[1]۔ سلطنت سمرقند کے مصائب سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ ایک بڑی فوج لے کر حصار کی طرف بڑھا۔ وہ موسم سرما کے مستقر ترمز میں داخل ہوگیا جہاں بائسنغر کے بڑے بھائی سلطان مسعود مرزا نے اُسے دریا پار سے دیکھ لیا۔ تقریباً سردیوں بھر دونوں مقابل فوجیں ایک دوسرے پر نظر جمائے رہیں۔ لیکن آخرکار سلطان حُسین نے ایک فریب کے ذریعے دریا پار کرلیا اور اپنے حریف کو پسپا کرکے حصار میں پناہ لینے پر مجبور کردیا، جس کا فوراً محاصرہ کرلیا گیا۔ اُسی وقت اس نے دو فوجی رسالے روانہ کیے، ایک رسالہ تو اپنے بڑے بیٹے بدیع الزّماں مرزا کی سرکردگی میں قندز

---

[1] حبیب السّیر (خواندمیر)، دوم، ص ۲۵۹ —— ۶۰ - تاریخ رشیدی۔

کے مقام پر بھیجا گیا جہاں سابق وزیر خسرو خاں ابھی تک مقابلے پر جا ہوا تھا اور دوسرا ایک چھوٹے بیٹے مظفر حسین مرزا کی کمان میں ختلان روانہ ہوا۔ سلطان مسعود فوراً اس بری خبر کو لے کر بائسنغر کے پاس سمرقند بھاگ گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ پورا علاقہ سلطان حسین بیقرہ کے قبضے میں چلا جائے گا۔ بہت سے اُزبک پیشہ ور سپاہی جو سمرقندی حکمرانوں کی ملازمت میں تھے، یہ سمجھے کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور اپنی تلواریں بابر کو پیش کرنے آگئے۔ لیکن قسمت کا کرنا یہ ہوا کہ حالات نے حملہ آوروں کے خلاف پلٹا کھایا ـــــ حصار نے بہادری سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خسرو شاہ نے اپنے خلاف بھیجی ہوئی فوجوں کو دو مرتبہ مار بھگایا۔ خراسان کے عظیم حکمراں نے خوشی سے صلح کرلی اور واپس چلا گیا۔ بابر کو یقیناً اس سے بڑا اطمینان ہوا ہوگا، کیوں کہ اگر سلطان حسین بیقرہ نے سمرقند پر قبضہ کرلیا ہوتا تو (بابر کے لیے) شہر تیمور پر ایک کامیاب حملے کے امکانات بہت کم رہ جاتے۔ اس موقع پر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے بابر کے دل کو یقیناً نئی اُمیدوں سے بھر دیا ہوگا ـــــ سمرقند میں اُن مقامی اُمرا کے ذریعے ایک خوفناک سازش کی وبا پھیل گئی، جن کو یہ شکایت تھی کہ سلطان اپنے بچپن کے ساتھی اہلِ حصار کو حد سے زیادہ لطف و کرم سے نوازتا ہے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ اُسے تخت سے اتار کر اس کے چھوٹے بھائی سلطان علی کو اُس کی جگہ بٹھا دیا جائے۔ بائسنغر کو اغوا کرلیا گیا اور لوگ اس کو لے کر بدنام زمانہ مقام گوک سرائے کی طرف چل دیے جہاں خانوادۂ تیموریہ کے شہزادے کبھی نہیں جاتے تھے، سوائے ان اوقات کے جبکہ ان کو اندھا کیا جاتا تھا یا تانت سے پھانسی دی جاتی تھی یا اُن کی تاج پوشی کی جاتی تھی[1] اس کو اُدھر لے جایا ہی جارہا تھا جبکہ وہ ایک مشہور خواجہ (عبداللہ مروارید) کے پاس بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس کے میزبان کا تقدس اس کی جان کی حفاظت کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک عوامی بغاوت نے

---

[1] بابر کا اس سلسلے میں ایک دل چسپ نوٹ ہے:

"گوک سرائے سمرقند کے حصار میں ایک بڑی عمارت ہے۔ اس کی ایک عجیب اور خاص بات یہ ہے کہ اگر کسی تیموری (شہزادے کی) تخت نشینی ہوتی ہے تو یہاں ہوتی ہے اور اگر تخت کی خواہش میں وہ اپنا سر کھوتا ہے تو اسی جگہ۔ اس لیے گوک سرائے کا نام ایک مجازی مفہوم کا حامل ہے۔ اگر کسی حکمراں کے بیٹے کے لیے کہا جائے کہ اُسے گوک سرائے لے گئے ہیں تو اس سے مطلب موت ہے۔" اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۶۳، لیکن درحقیقت یہ عمارت تیمور سے پہلے کی ہے۔ پیٹس ڈے لاکروا۔ چنگیز خاں، ص ۱۱۱، ارسکن، اول، ص ۹۸

اس کا تخت اس کو واپس دلا دیا۔ اس کے بدلے بدقسمت سلطان علی کو گوک سرائے بھیج دیا گیا، لیکن جب اُس کی آنکھوں میں آتشیں سلائی پھیری گئی تو اتفاق سے اس کی آنکھوں کی روشنی ختم نہ ہوئی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس بخارا بھاگ گیا اور ایک لمحے میں سمرقند کی سلطنت خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئی۔ سلطان بائسنغر اپنے بھائی کے خلاف بڑھا لیکن نقصان اٹھا کر پسپا ہوا اور اپنے پائے تخت میں واپس دھکیل دیا گیا۔

یہ خبر ملتے ہی بابر نے ایک مستحکم عزم و فیصلے کے ساتھ قدم اُٹھایا۔ اگرچہ اُس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی لیکن اس نے اپنے لیے ایک ضرب لگانے اور اگر ممکن ہو تو اپنے مورث تیمور کے تخت پر خود بیٹھنے کا عزم کر لیا۔ لہٰذا وسط جولائی ۱۴۹۶ء میں اس نے اپنے آدمیوں کو سوار ہونے کا حکم دیا اور سمرقند کے محاصرے کو بڑھا۔ یہاں اُس نے اپنے رشتے کے دو بھائیوں کو پہلے ہی سے فصیلوں کے نیچے خیمہ زن پایا۔ ان میں سے ایک سلطان علی تھا جو بدلا لینے پر تُلا ہوا تھا اور دوسرا سلطان مسعود جو ایک سمرقندی خاتون کی محبت میں گرفتار تھا۔ تینوں شہزادوں نے تین چار ماہ تک سمرقند کا محاصرہ جاری رکھا لیکن چونکہ موسم سرما کی آمد تھی اس لیے وہ لوگ اوائل ستمبر میں واپس چلے گئے۔ بابر اور سلطان علی نے اگلے سال پھر محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان مسعود نے اپنی محبوبہ کو حاصل کر لیا تھا اس لیے وہ مطمئن ہو کر حصار لوٹ گیا۔ سلطان علی بخارا واپس چلا گیا تاکہ اگلے سال کی مہم کی تیاریاں کر سکے۔ بابر دوبارہ پہاڑیوں سے گزر کر فرغانہ آیا اور اسی قسم کے مقصد سے اندجان میں داخل ہو گیا۔

سمرقند کے اس بے نتیجہ محاصرے کے ساتھ ہی بابر کی زندگی کا پہلا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اب وہ ایک لڑکا نہیں رہا بلکہ ایک مرد اور ایک جنگجو سورما ہے ـــــ شہرت و عظمت کے حصول کا شائق ـــــ ضبط و پابندی کا غیر متحمل ـــــ اور سیاسیاتِ اعلا کے مسحور کن کھیل میں دیگر حریفوں کے خلاف اپنی قوتوں کو جھونک دینے کے لیے بے تاب ـــــ وہ کھیل جس میں کہ بازی ایک شہنشاہیت کی تھی اور پانسے بادشاہتیں تھیں۔

باب دوم

جنگجو کی تربیت

اسناد : 'بابر نامہ' 'حبیب السیر'، 'شیبانی نامہ'، 'عالم آرائے عباسی'، 'تاریخ رشیدی'۔

جدید تصانیف : 'ارسکن'، 'لین پول'، وامبرے کی 'تاریخ بخارا'۔

ایک جہاں گرد شہزادے کی حیثیت سے بابر کی پُرمہم زندگی اب خاصی مستحکم ہوچکی تھی۔ موسم بہار میں سمرقند کے مجوزہ حملے کے لیے بابر نے ۱۴۹۶ء کے جاڑے کا تمام موسم محتاط تیاریوں میں گزارا۔ اپنے منصوبے کو بائسنغر سے ایک مکمل راز رکھنے میں وہ کامیاب رہا۔ آخر کار جب سب کچھ تیار ہوگیا تو مئی ۱۴۹۷ء میں وہ تڑپ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور دارالخلافہ کے معاملات کو اوزن حسن اور علی دوست طغائی کی سپردگی میں دے کر سمرقند کی راہ لی۔

غیر متوقع واقعات کے اچانک ظہور نے بدقسمت بائسنغر کو انتہائی ناخوشگوار حیرانی میں ڈال دیا۔ اُسے بخوبی معلوم تھا کہ اس کا بھائی سلطان علی نیا حملہ کرنے والا ہے، چنانچہ اپنی ایک چھوٹی سی کامیابی سے ہمت و حوصلہ پاکر وہ اُس کے مقابلے کو نکل آیا تھا۔ ابھی دونوں بھائیوں کی فوجیں آمنے سامنے پڑی ہوئی تھیں کہ بابر کے مخبر دستے نمودار ہوئے۔ بائسنغر نے اس غیر متوقع دشمن کی آمد پر بدحواس ہوکر اپنا پڑاؤ ختم کرڈالا اور افراتفری کے ساتھ لوٹ پڑا ـــــ بس عین وقت پر ہی وہ بچ نکلا کیوں کہ اس کی فوج ساقہ پر لشکر فرغانہ کے ایک اُڑن دستے نے شب خون مارا،

شدید نقصانات پہنچائے اور مالِ غنیمت کا ایک انبار لے کر چلتا بنا[1]

سلطان علی کے ساتھ مل کر بابر نے سمرقند پر چڑھائی کی۔ شیراز حملہ آوروں کے قبضے میں آگیا۔ بائسنغر کے آدمی روز بروز زیادہ تعداد میں آ آکر اُن کی ملازمت اختیار کرتے رہے ـــــــ یہ پیشہ ور سپاہی جو ہارتے ہوئے فریق کا ساتھ چھوڑنے پر ہمیشہ کربستہ رہتے تھے، بیشتر منگول تھے۔ بابر پوری طرح واقف تھا کہ وہ ناقابل اعتماد ہیں اور اس کے علاوہ وہ ان کی قوم کو ذاتی طور پر بھی ناپسند کرتا تھا۔ اس لیے اس کو ہرگز کوئی افسوس نہ ہوا ہوگا جب ایک بار اُن کو یہ دکھانے کا موقع آیا کہ وہ واقعی ایک آقا ہے۔ ان منگولوں میں سے کچھ لوگوں کو حقیر و غریب بوڑھے دیہاتیوں کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرنے کے جرم میں اُس کے سامنے لایا گیا۔ بابر نے، جسے اپنے سپاہیوں کے انضباط و خودضبطی پر بڑا ناز تھا، یہ حکم دیا کہ ان غارت گروں کی بوٹی بوٹی کردی جائے۔ ہم دیکھیں گے کہ انصاف کے اس سخت اقدام کی وجہ سے بابر کو مستقبل میں بہت پریشانی اٹھانا پڑی، لیکن فی الحال یہ سبق موثر ثابت ہوا۔ ایک دن جبکہ فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں، اچانک ایک ہنگامہ سا ہوا اور کچھ مسلمان تجار جو خرید و فروخت کے لیے لشکرگاہ میں آئے تھے لُوٹ لیے گئے۔ بابر بڑے فخر سے لکھتا ہے :

> " لیکن ہماری فوج کا نظم و ضبط ایسا تھا کہ جب ہر چیز کو واپس لوٹانے کا حکم دیا گیا تو اگلے دن کا پہلا پہر بھی نہ گزرا تھا کہ کوئی بھی شے حتیٰ کہ روئی کا ایک پہل یا ٹوٹی سوئی کی ایک نوک بھی فوج کے کسی آدمی کے پاس نہ رہی۔ سب کچھ ان کے مالکوں کے پاس واپس پہنچ گیا۔"[2]

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۶۶ ۔ پی۔ ڈے کورٹیل، اول، ص ۱۳ (المنسکی، ص ۴۸)۔
اس موقع پر بہت سے ازبک سرداروں نے جو کہ خاندانِ تیموری کے ملازم تھے ساتھ چھوڑ دیا اور شیبانی سے جا ملے، جس کا ستارہ عروج پر تھا۔ انھیں میں 'شیبانی نامہ' کا مصنف محمد صالح مرزا بھی تھا۔ (دیکھو وامبری، باب شانزدہم۔ اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۶۴)

[2] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۶۶ ۔ پی۔ ڈے کورٹیل، اول، ص ۸۵ ۔ منگولوں کے بارے میں بابر کی پست رائے کا اظہار تزک میں کئی جگہ صاف صاف ہوا ہے : " منگولوں کا گروہ ہمیشہ سے ہر قسم کی شرارت اور اطاعت

(باقی اگلے صفحے پر)

بابر نے شہر کے سامنے پڑاؤ ڈالا اور محاصرے کا کام آگے بڑھایا گیا۔ 'محافظ فوجوں' کے ساتھ بار بار ٹکراؤ ہوتا رہا اور عمومی طور پر پلّہ محاصرین ہی کا بھاری رہا۔ لیکن ایک 'پُرفریب پیغام' کے نتیجے میں جس میں بابر کو اپنے چیدہ سپاہیوں کے ایک دستے کو 'غارِ عاشقاں' کی طرف بھیجنے کی دعوت دی گئی تھی، اُس کے بہترین سپاہیوں کی ایک مختصر سی جماعت گھات میں بیٹھے ہوئے دشمن کے ذریعے تباہ ہوگئی[۱]۔ فوجی کارروائیاں تمام موسمِ گرما میں جاری رہیں اور قلعے بند فوج کی حالت رفتہ رفتہ نازک ہوتی گئی۔ (محصورین کے) دھاوے پر دھاوے نقصان کے ساتھ پسپا کیے جاتے رہے اور آخر وہ شہری فصیل ہی میں بالکل مقید ہو کر رہ گئے۔ بائسنغر قطعی مایوس ہو کر جان پر کھیلنے کو تیار ہوگیا۔ اس کے کئی اپنے خاندان والے ہی مدد کو تیار نہ تھے اور ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ترکستان کے گورنر شیبانی خاں سے مدد کی درخواست کی۔

شیبانی، جس سے کہ ہم اُس کے متبادل لقب' شاہی بیگ کے تحت پہلے بھی مل چکے ہیں ایک شخص ابوالخیر کا پوتا تھا۔ وہ ایک شہزادہ تھا جس نے شمالی مغربی صحرا کے خانہ بدوش ازبک قبیلوں کو ایک مضبوط جتھے میں تبدیل کر دیا تھا[۲]۔ یہ نوزائیدہ سلطنت اپنے زیادہ وحشی و قدامت پرست عناصرِ ترکیبی کی دشمنی و رقابت سے تباہ ہوگئی اور اپنے خاندان کی واحد امید شیبانی کو اپنی پھوٹی ہوئی قسمت کو جوڑنے کے لیے وطن سے باہر ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ وفادار ساتھیوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ کبھی وہ ایک حکمراں اور کبھی دوسرے حکمراں کو اپنی خدمات فروخت کرتا رہا اور اس دوران ہمیشہ اپنے ذرائع بڑھاتا اور اپنے مفادات کے حصول میں بے ضمیری و بے رحمی سے مصروف

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

سے انحراف کا بانی رہا ہے۔ اس تحریر کے وقت تک وہ میرے خلاف پانچ دفعہ بغاوت کر چکے ہیں۔"
(پی۔ ڈی کورٹیل، اول، ص ۱۳۹، ۱۴۰۔ المنسکی، ص ۸۰) اور سلطان علی چنگ کی بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے بابر کہتا ہے: "یہ یقینی ہے کہ اس کا قابلِ ملامت چال چلن اس کی مغول فطرت کی وجہ سے ہے۔" (پی۔ ڈی کورٹیل ص ۱۶۳، المنسکی ص ۹۳)

[۱] 'حبیب السیر' کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ پیغام اصلی تھا مگر بابر اس سے یہ سمجھ بیٹھا کہ کوئی مخالفت نہ ہوگی۔ یہ دراصل شہری شورہ پشت تھے جو کہ اُس کے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔

[۲] ملاحظہ ہو 'شیبانی نامہ' (بعد کی زندگی کے لیے)۔ تاریخِ رشیدی۔ حبیب السیر۔ عالم آرائے عباسی اور اور جدید اسناد میں 'ارسکن'، اول، ص ۳۰۔ ۳۴ وغیرہ۔

رہا۔ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ کس طرح سرپل کی جنگ میں اس نے اپنے آقا سلطان احمد مرزا کو دھوکا دیا تھا۔ اس دغا بازی پر بطور انعام خاقانِ اعظم محمود نے اُسے ترکستان کا حاکم (گورنر) بنا دیا تھا۔ اسی وقت سے وہ عمومی طور پر آلِ تیمور اور خصوصی طور پر بابر کے ایک زبردست دشمن کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ اُس کی طاقت، چالاکی اور بے رحمی نے اُسے ایک انتہائی خوف ناک حریف بنا دیا۔ اور جب تک دستِ اجل نے اُسے راستے سے نہ ہٹا دیا، وہ فرغانہ کے کم عمر شہزادے کی راہ میں سب سے زیادہ ناقابلِ عبور رکاوٹ بنا رہا۔

بہرحال اس وقت قسمت بابر پر مسکرا رہی تھی۔ ابھی اُس نے اپنی فوجوں کو جاڑے کے مستقر میں پہنچا کر 'غارِ عاشقاں' والے دستے کو ہلاک کرنے والی جماعت کے چند سرداروں سے روادوی میں انتقام لیا ہی تھا[1] کہ شیبانی محاصرین کو اچانک حملے سے بدحواس کرنے کی اُمید میں رواں دواں آ پہنچا ـــــ لیکن ان کی جمیت کو اس قدر طاقت ور پایا کہ اُن پر حملہ ممکن نہ تھا۔ بائسنغر نے اپنے حلیف کی مصلحت اندیشی پر نااُمید ہو کر اپنی جھنجلاہٹ کا برملا اظہار کیا اور شیبانی برافروختہ ہو کر اپنی فوجیں واپس لے گیا۔ لیکن بقول ارسکن[2] اس نے 'صید' (سمرقند) کی فربہی اور اس کا دفاع کرنے والوں کی ناتوانی کو دیکھ لیا تھا۔ اس دن سے سمرقند اپنے تموّل و تعیّش کی وجہ سے اُس کے لیے مسحور کن بن گیا اور اُس نے اُسے خاندانِ تیموری سے چھیننے کا عہد کر لیا۔ لیکن اس وقت سوائے مراجعت کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس طرح اس کے نوعمر حریف کے لیے میدان صاف ہو گیا۔

اب محاصرے کو سات مہینے گزر چکے تھے اور شہر عرصے تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب شیبانی واپس چلا گیا تو کامیاب مزاحمت کی آخر اُمید بھی ختم ہو گئی۔ اس لیے بائسنغر دو یا تین سو نیم فاقہ زدہ ساتھیوں کو لے کر ایک رات چپکے سے شہر سے نکل گیا اور اپنے سابق وزیر خسرو خاں کے پاس تلاشِ پناہ میں قندز روانہ ہو گیا۔ اس کا بھائی مسعود اس کی راہ میں تقریباً حائل ہو ہی گیا تھا، لیکن آخر کار وہ بحفاظت قندز پہنچ گیا۔ خسرو نے اُسے اپنے مقصد کے لیے ایک مفید آلۂ کار سمجھتے ہوئے مہربانی سے اُس کا استقبال کیا۔

اس طرح آخر نومبر ۱۴۹۷ء میں بابر نے اپنی زندگی کا خواب پورا کر لیا۔ لشکرگاہ سے نکل کر

---

[1] پچھلا نوٹ دیکھو۔ اس سے 'حبیب السیر' کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] ارسکن۔ اول، ص ۸۳۔

اُس نے اپنے آباد اجداد کے شہر کی راہ لی:

"ہمارا استقبال کرنے کے لیے امرا اور جنگجو سردار سڑک پر ایک کے بعد ایک استادہ تھے۔ اس طرح خدا کے فضل و کرم سے سمرقند کا شہر اور مضافات قبضے میں آگئے۔"[1]

سلطان علی مرزا نے یہ کیا کہ آگے بڑھ کر بخارا پر قبضہ کرلیا۔

بابر کی خوشی کی انتہا نہ رہی ـــــ برسوں بعد بھی جب سیکری کے خانہ باغ میں بیٹھ کر ـــــ جیسا کہ اس کی بیٹی گلبدن ہمیں بتاتی ہے ـــــ وہ اپنی کتاب لکھا کرتا تھا[2] تو اُس کا ذہن دورِ ماضی میں اس اہم دن کی عظمتوں کی طرف مُڑ جاتا تھا ـــــ فخر و ناز سے وہ شہرِ تیمور کے عجائبات کا تفصیلی تذکرہ کرتا چلا گیا ـــــ اُس کے شان دار محلات، اس کی مساجد، اس کے باغات، اس کے مدارس اور اس کی فصیلیں ـــــ اس کے ماتحت علاقوں کی دولت و خوشحالی کی داستان ـــــ اور اس کی یہ دل چسپ تاریخ کہ کس طرح ایک کے بعد ایک شہزادہ اور ایک کے بعد ایک فاتح اس پر قبضہ کرتا اور دوبارہ قبضہ کرتا چلا گیا ـــــ ہندوستان کی تمام فتوحات بھی اس کے ذہن سے اُس دن کی یاد کو محو نہ کرسکیں جب وہ سمرقند میں داخل ہوا تھا ایک ایسے فاتح کی حیثیت سے جو بمشکل پندرہ سال کا تھا۔

لیکن اس کا تخت کوئی جائے آسائش نہ تھا ـــــ اپنی نئی رعایا اور پرانے سپاہیوں کو ایک ساتھ مطمئن کرنا ناممکن تھا۔ دونوں ہی طویل محاصرے سے بیدم ہوچکے تھے۔ لوٹ مار کی ممانعت فوجیوں کو سخت ناگوار گزری اور انھوں نے اپنی تنخواہ کے لیے ہنگامہ شروع کردیا۔ نیم فاقہ زدہ شہر سے کوئی بھی رقم حاصل کرنا ناممکن تھا اور بابر کے آدمی گروہ در گروہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اندجان واپس جانے لگے ـــــ لیکن صرف اتنا ہی نہ تھا، جب اوزن حسن کو، جسے اندجان چھوڑ دیا گیا تھا، یہ حکم دیا گیا کہ مفرورین کو گھیر کر واپس بھیج دے تو وہ خود ایک اعلا بیگ سردار سلطان احمد تنبل کا ہم نوا بن کر یہ مطالبہ کرنے لگا کہ اندجان اور اخسی کے شہر بابر کے بھائی جہانگیر کے حوالے کردیے جائیں۔ بلاشبہ وہ لوگ چھوٹے شہزادے کو خود مفادات کے حصول میں ایک آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔ کئی اسباب کی بنا پر اس مطالبے کو منظور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فطری طور پر خاص سبب یہ تھا

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۳۰۔ پی۔ ڈی کورٹیل۔ اول، ص ۹۶ (الفنسٹن، ص ۵۵)

[2] گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، ورق ۱۵ (الف)۔ ایڈیشن اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۹

کہ بابر اس امداد کے لیے فرغانہ کا محتاج تھا جو اس کو سمرقند میں محفوظ و مضبوط بنا سکتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ خاقانِ اعظم محمود نے خود اندجان اور اخسی کا مطالبہ پیش کر دیا تھا اور بابر اپنے ماموں کے ساتھ لڑائی میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اُن کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا تو دونوں سازشیوں نے ایک فوج تیار کی اور اندجان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ وفادار قلعہ بند فوج علی دوست طغائی کی ماتحتی میں مقابلے پر ڈٹ گئی لیکن فوری پیغامات سمرقند بھیجے:

"اس طرح وہ ہمارا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ اگر ہماری فریاد درد پر آپ نہ آئے تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ سمرقند اندجان کی طاقت سے لیا تھا۔ اگر اندجان آپ کے ہاتھ میں رہے گا تو انشاءاللہ سمرقند پھر سے لے لیا جائے گا۔"[1]

بدقسمتی سے ٹھیک اسی وقت بابر ایک شدید بیماری سے سنبھل رہا تھا اور اپنی کمزور صحت کی حالت میں کام کرنے سے بیماری عود کر آئی۔ وہ کہتا ہے:

"بحالیٔ صحت کے زمانے میں مناسب احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے میرا حال پھر ابتر ہو گیا اور اس دفعہ میں اتنا سخت بیمار ہوا کہ چار دن تک میری زبان میں لکنت رہی اور لوگ روئی بھگو کر میرے مُنھ میں پانی ٹپکایا کرتے تھے۔ میرے سب ساتھی اُمرا اور بہادر سردار یکساں طور پر میری زندگی سے مایوس ہو کر اپنے اپنے بارے میں سوچنے لگے۔"[2]

فیصلے کی ایک ناقابلِ معافی غلطی سے باغیوں کے ایک ایلچی کو بابر کے بستر علالت تک باریابی کا موقع مل گیا ـــــ فطری طور پر وہ بعجلت تمام واپس چل دیا، یہ اطلاع پہنچانے کے لیے کہ شہزادہ بسترِ مرگ پر ہے ـــــ واقعہ یہ ہے کہ بابر کچھ ہی دن میں اندجان روانہ ہونے کے قابل ہو گیا لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اہلِ قلعہ نے اُسی دن ہتھیار ڈال دیے تھے جس دن وہ سمرقند سے روانہ ہوا اور اس کی راجدھانی دشمنوں کے قبضے میں تھی ـــــ لیکن معاملہ اسی پر ختم نہ ہوا۔ جیسے ہی وہ سمرقند سے ہٹا، اس کے جانب دار پست حوصلہ ہو گئے۔ اُس کے دشمنوں نے دلیری کے ساتھ معاملات کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس کے چچازاد بھائی سلطان علی مرزا کو بخارا سے بُلایا گیا اور اس طرح شہرِ تیمور اُس کے ہاتھ سے نکل گیا

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۸۸ [2] ایضاً، ص ۸۸

بدنصیب بابر کے پاس اب صرف خجند ہی فوجی صدر کیمپ کے طور پر رہ گیا تھا۔ اُس نے خاقانِ اعظم سے مدد کی درخواست کی اور دونوں کی متحدہ فوجیں اخسی کی طرف بڑھیں۔ لیکن عین نازک موقع پر جب کہ بس ایک ہی اور منزل میں علاقہ واپس مل جاتا، محمود خاں وعدوں اور رشوتوں کے زیرِ اثر اپنے بھانجے کا ساتھ چھوڑ کر اپنی فوجیں واپس لے گیا۔ اس سے بھی بدتر وہ ہے جو اس کے بعد ہونے والا تھا۔ ایک ایک کر کے بابر کے آدمی اس کے پاس سے کھسکنے لگے، یہاں تک کہ صرف وہی دو یا تین سو آدمی باقی رہ گئے جو اس کی تمام جہاں گردیوں میں اس کے ساتھ رہے تھے۔ بے چارے نوعمر شہزادے کو بڑی تلخ مایوسی ہوئی۔ وہ لکھتا ہے :

"یہ چیز میرے لیے بڑی ہی سخت تھی۔ میں خوب روئے بغیر نہ رہ سکا۔"[1]

خجند ایک ادنا مقام تھا اور اگرچہ بابر کا دربار بہت مختصر رہ گیا تھا لیکن اس کے لیے بھی اس میں گنجائش نہ تھی۔ اپنے بلند منصوبوں سے قطع نظر کرنے کے بعد اس کو قیام کے لیے جلد ہی ایک نئی جگہ کی تلاش ضروری تھی۔ لیکن ۱۴۹۸ء کی گرمیوں کے دوران اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اپنے ماموں محمود خاں سے کچھ آدمی مستعار لے کر اس نے سمرقند پر پیش قدمی کی کوشش کی لیکن پتہ چلا کہ خوفناک شیبانی خطرناک حد تک قریب موجود ہے۔ ایک دفعہ اُسے پھر مراجعت اختیار کرنا پڑی۔ محمود خاں کی نیم دلانہ امداد کے ساتھ اندجان پر قبضے کی ایک اور کوشش بھی ناکام رہی اور اب خود کو اوراتیپہ کے حکمران محمد حسین دوغلت کی خیرات پر ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ (آخر) جسے اپنا ایک گاؤں پاشاغر مستعار دینے پر راضی کرلیا گیا۔ یہاں جیسے تیسے کر کے بابر نے اپنی سردیاں گزار دیں اور اپنے معاملات کی ناسازگاری سے ذرہ برابر بھی پست ہمت نہ ہو کر یہ انتظار کرتا رہا کہ دیکھیں تقدیر اب کون سا تحفہ بھیجتی ہے۔

جاڑے کا موسم گزر گیا اور بابر جس کو ابھی تک یہ یقین نہ تھا کہ کہاں جائے، جنوبی اوراتیپہ کے گرمائی مرغزاروں میں چلا گیا۔ اچانک ہی اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک دن نمازِ عصر کے وقت ایک تنہا سوار اس وادی کے دامن میں نمودار ہوا جہاں شہزادہ خیمہ زن تھا۔ وہ اُس علی دوست طغائی کا پیش خدمت نکلا جس نے بابر کی بیماری کی خبر سن کر اس قدر جلد بازی سے اندجان کا قلعہ دشمن کے حوالے کر دیا تھا۔ ملازم ایک ایسا پیغام لایا تھا جو کسی بھی جلاوطن بادشاہ

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۱

کے دل کو باغ باغ کرسکتا تھا۔ علی دوست نے اپنی سابق غلط کاریوں کی معافی مانگی تھی، لطف و کرم سے سرفراز کیے جانے کی درخواست کی تھی اور بابر کو مرغیلان کی پیش کش کی تھی۔

موقعہ اتنا اچھا تھا کہ اُسے چھوڑنا مناسب نہ تھا، بابر اور اس کے چھوٹے سے گروہ کے دو سو چالیس آدمی فوراً گھوڑوں پر سوار ہوئے اور تمام رات چلتے ہی رہے۔ تیسرے دن وقت سحر تک وہ مرغیلان کی طرف ایک سو پچاس میل کی راہ طے کر چکے تھے۔ جب وہ شہر کے نزدیک پہنچے تو اُن کے ذہن میں شکوک سر ابھارنے لگے: کیا ہوگا اگر یہ پیغام محض ایک فریب ہوا جس کے ذریعے شہزادے کو اُس کے دشمنوں کے پنجوں میں پھنسانا مقصود ہو؟ لیکن اب پس و پیش کا وقت نکل چکا تھا۔ حالات کا جواں مردی سے مقابلہ کرتے ہوئے بابر پھاٹک تک آپہنچا۔ ایک مختصر گفت و شنید کے بعد معافی کے وعدے پر علی دوست طغائی نے اُسے اندر داخل کرلیا۔ بابر ایک بار پھر ایک فصیل بند شہر پر قابض ہوگیا۔

معتمد ایلچیوں کو سپاہیوں اور رسد کی تلاش میں دیہات کا گشت لگانے کے لیے روانہ کیا۔ ہر سمت سے اسلحہ اور آدمی آنے لگے۔ بابر نہ صرف اپنی پُرکشش شخصیت بلکہ نظم و ضبط کی وجہ سے بھی ہر دل عزیز تھا۔ دوسری طرف اوزن حسن اور سلطان احمد تنبل نے جو کہ اپنے کٹھ پتلی جہانگیر کے نام پر فرغانہ پر حکمرانی کر رہے تھے اور بقول بابر "بے دین و بدطینت قہرمان" تھے، دہقانوں اور اپنے ہم قوموں دونوں ہی پر زبردست مظالم توڑتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک خاصی بڑی فوج جمع کرلی اور مرغیلان کے محاصرے کی کوشش کی لیکن لڑبھڑ کر نواحی علاقوں میں اپنا راستہ بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اسی دوران اخسی کے عوام محافظ فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے قلعے میں ڈھکیل کر بابر کے ساتھیوں کو شہر میں داخل کرلیا۔ خبریں بہتر سے بہتر ہوتی گئیں۔ ایک کارآمد امدادی فوج محمود خاں کے پاس سے آپہنچی۔ اوزن حسن کے انتہائی معتمد سپاہیوں کا ایک چنیدہ دستہ جو کہ اخسی میں اُس کے حامیوں کی مدد کو بھیجا گیا تھا، دریا پار کرتے ہوئے ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا[1] آخر جب اوزن حسن اور تنبل ابتری کے عالم میں اندجان کی طرف پسپا ہو رہے تھے تو اُن کے پاس پیغام پہنچا کہ خود اُن کا حاکم قلعہ بابر کی طرفداری کا

---

[1] 'حبیب السیر' جس میں کچھ بیان مختلف ہے لکھا ہے کہ اوزن حسن کے سپاہیوں کی تباہی کا سبب وہ مغول سپاہی تھے جنھیں محمود خاں نے بھیجا تھا اور جو اچانک ہی ان پر ٹوٹ پڑے۔

اعلان کر چکا ہے۔

اب پوری سلطنت اس کے ساتھ ہوگئی اور جون ۱۴۹۸ء میں بابر ایک دفعہ پھر فرغانہ کا مالک ہوگیا۔ سلطان احمد تنبل اوزقند بھاگ گیا۔ اوزن حسن اخسی میں جا پڑا اور اُسے مصالحت کی اجازت مل گئی۔ بغاوت کے تمام نشانات ختم ہوگئے اور ایسا نظر آنے لگا کہ بابر کی تمام مصیبتوں کا فی الحال خاتمہ ہوگیا ہے۔

لیکن درحقیقت یہ بات نہ تھی۔ ایک واحد غلط اقدام نے کئی ہفتوں کی سخت جنگ سے بنائے ہوئے کام کو بگاڑ دیا۔ جب باغی سرداروں نے اطاعت قبول کرلی تو ان کے زیادہ تر ساتھی بابر سے آملے۔ یہ ساتھی بیشتر منگول تھے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ بابر اس قوم کو ناپسند کرتا تھا اور اُس نے سمرقند مہم کے دوران ان کو قابو میں رکھنے کے لیے کس طرح سخت اقدام کیے تھے۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس بھی ایسے حکمران سے محبت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی جو اس قدر سختی سے لوٹ مار کے ہنگاموں کو دباتا تھا اور حقیر دہقانوں کی جان و مال کی حفاظت کے بارے میں اتنی مضحکہ خیز حد تک فکرمند رہتا تھا جو کہ خود اپنی حفاظت نہیں کرسکتے تھے۔ بابر کے بہت سے انتہائی معتمد ساتھی ان کرایہ کے منگول سپاہیوں کو ایمان دار لوگوں کے لُٹے ہوئے سامان سے آراستہ دیکھ کر بہت بگڑے ہوئے تھے۔ ان کی معروضات کے بل پر بابر یہ حکم نافذ کرنے پر تیار ہوگیا کہ منگول وہ تمام سامان واپس کردیں جس کو اس کے جائز مالک پہچان لیں اور دعوا کریں۔ یہ حکم بہت ناموزوں وقت پر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ وہ خود تسلیم کرتا ہے:

> "اگرچہ حکم معقول و منصفانہ تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ قدرے جلد بازی پر مبنی تھا۔ جہانگیر جیسا فتنہ جب میرے پہلو نشین تھا تو لوگوں کو یوں خوفزدہ کرنے میں کوئی عقل مندی نہ تھی۔"[1]

منگولوں نے بغاوت کردی اور بلا توقف تنبل کے ساتھ شامل ہونے کو روانہ ہوگئے اور اس پر اس نے پھر سے جنگ و جدال شروع کردیا۔ قاسم خاں کی قیادت میں بابر کی ایک فوج نے زبردست شکست کھائی اور ایک ماہ تک تنبل دارالخلافہ کا محاصرہ کیے بھی پڑا رہا۔ جب اُسے وہاں کچھ کامیابی نہ ہوئی تو وہ اوش چلا گیا۔ اب ایک اور مہم کے سوا چارا نہ تھا

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۰۴

ان حالات کے تحت اگست ۱۴۹۹ء میں بابر نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کرکے تنبل کی طاقت کے مرکزی علاقہ اوش پر چڑھائی کر دی۔ جب بابر اُدھر جارہا تھا تو اُس مستعد و سرگرم باغی نے اندجان پر اچانک حملے کی کوشش کی لیکن خوش قسمتی سے قلعہ بند فوج کو زبردست خطرے کا پتہ چل گیا اور تنبل کو لوٹنا پڑا۔ دوسری طرف بابر خود مادو کے مستحکم قلعے کے سامنے جم گیا جو تنبل کے چھوٹے بھائی کے قبضے میں تھا۔ اس مقام پر زبردست حملے کیے گئے۔ ایک دن علی الصبح چڑھائی کی گئی اور دوسرے دن صبح قلعہ بند فوج نے صلح کی درخواست کی اور اپنے مورچوں کو چھوڑ دیا۔

اس کامیابی کے بعد جلد ہی بابر نے اپنے حمایتوں کی تازہ کمک سے ہمت پاکر ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کرلیا۔ تنبل خود گھوم کر بابر و دارالخلافہ کے درمیان حائل ہوگیا۔ شہزادے کے لیے اس سے بہتر کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لڑائی اندجان سے پندرہ میل دور ایک گاؤں خوبن میں ہوئی۔ بابر نے حسبِ معمول مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی فوجوں کو اپنی نسل کے روایتی انداز پر آراستہ کیا تھا —— ہراول، قلب، یسرہ اور میمنہ —— اُس کے معر تربیت یافتہ پیدل سپاہیوں کے لیے گولیوں کو روکنے والی ٹٹیاں فراہم کی گئی تھیں کہ اگر ضرورت پڑے تو پیچھے ہٹ کر مدافعت کرسکیں۔ مگر خوش قسمتی سے اُن کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہ سواروں کا مقابلہ تھا اور بابر کے گھوڑوں نے دشمن کو بڑی سرعت کے ساتھ میدان سے صاف کر دیا۔ بدقسمتی سے فتح کے فوائد حد سے زیادہ احتیاط نے بہت کچھ ضایع کر دیے، کیوں کہ دشمن کا کافی دور پیچھا نہ کیا گیا۔ بایں ہمہ بابر بہت خوش تھا:

> "یہ میری پہلی صف بستہ جنگ تھی۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے رحم و کرم سے اُسے ایک فتح و کامرانی کا دن بنادیا۔"[1]

تنبل اوزقند لوٹ گیا اور اس پر نظر رکھنے کو بابر موسم سرما کے مستقر میں چلا گیا۔ بدقسمتی سے اپنی فوج کو مجتمع رکھنا اُسے ناممکن معلوم ہوا۔ سب سے بڑا امیر (بیگ) قنبر علی واپس اپنے علاقے میں جانے پر مُصر تھا[2] اور اُس کی ناوقت واپسی کے باعث کمزور تر ہوجانے کی وجہ سے بابر جنگ

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۱۳

[2] بعد کے حالات کی روشنی میں اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس کا منصوبہ بابر کو فیصلہ کن کامیابی حاصل کرنے سے روکنا تھا۔

جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ واپس اندجان لوٹ گیا لیکن جب اُس نے خبر سنی کہ اس کے ماموں خاقانِ اعظم نے تنبل کے کچھ رشتہ داروں کے اثر میں آکر جن پر وہ بہت مہربان تھا، فرغانہ کے باغیوں کو کمک بھیجی ہے تو بابر فوراً حرکت میں آگیا۔ تنبل اوزقند چھوڑ کر میدانوں کی طرف بڑھا، نئی سپاہ نے کاشاں کا محاصرہ کرلیا جو اخسی سے زیادہ دور نہ تھا۔ بابر نے حسب معمول مستعدی سے کام لیتے ہوئے مُٹھی بھر ساتھیوں کو جمع کیا اور وسط سرما کی سخت سردی میں اخسی روانہ ہوگیا۔ وہ لکھتا ہے:

"اس رات سردی اتنی زبردست تیز تھی کہ بہت سے آدمیوں کے ہاتھ پیر بیکار ہوگئے۔ بہت سے لوگوں کے کان سوج کر سیب کے برابر ہوگئے"[1]

اس کے آنے کی خبر سن کر خان کے آدمی خوف و مایوسی میں پسپا ہوگئے اور بابر خود تنبل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوتے ہوتے رہ گیا جو اپنے حامیوں کے پاس پہنچنے کے لیے تیزی سے جارہا تھا۔ بدقسمتی سے بابر کے سرداروں نے اُسے حملے کے لیے طلوعِ صبح تک انتظار کرنے پر تیار کرلیا اور نتیجتاً تنبل بچ نکلا اب باغیوں کی حالت مایوس کن تھی۔ لیکن فروری ۱۵۰۰ء میں جب کہ بابر ان کو بالکل ہی کچل ڈالنے کی پُرشوق اُمیدیں کررہا تھا، اس کو یہ معلوم ہوکر سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کے دو سب سے بڑے سردار علی دوست طغائی اور قنبر علی مصالحت کا انتظام کررہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے نوجوان آقا کو حد سے زیادہ مطلق العنان ہوجانے کی اجازت دے دینا اُن کے مفاد میں نہ تھا کیوں کہ اس طرح وہ ان کے اثر سے خود کو بالکل آزاد کرسکتا تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے فرغانہ کے علاقے کو بابر اور اس کے بھائی جہانگیر کے درمیان تقسیم کرنے پر اصرار کیا۔ دریا کا اخسی کی سمت والا علاقہ چھوٹے کی اور اندجان کی سمت والا بڑے کی ملکیت اس شرط پر ہونا تھا کہ جب بابر کو پھر سے سمرقند حاصل ہوجائے تو اندجان و اخسی دونوں جہانگیر کو مل جائیں گے۔ بابر کو طیش تو بہت آیا مگر کھُلم کھُلا اپنے سرداروں سے ناطہ توڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس وار کی کامیابی سے بابر کے مقرر کردہ حاکم اندجان علی دوست طغائی کا سر پھر گیا جو ایک خود مختار شہزادے کی طرح حکمرانی کرتا تھا۔ اپنے نوعمر آقا کے گھربار پر قطعی

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۱۲

حاکمیت اختیار کرنے کے بعد اس نے خلیفہ اور قاسم بیگ جیسے معتمد خدمت گاروں کو ذلت کے ساتھ برطرف کردیا جنھوں نے مصائب وصعوبات میں اتنا کچھ ساتھ دیا تھا۔ اس کا بیٹا تو اور بھی آگے بڑھ گیا۔ اُس نے ایک سلطان کی طرح استقبالیہ ضیافتیں اور ایک 'دسترخوانِ عام' شروع کردیا۔ بابر کے حالات انتہائی نازک ہوگئے۔[1] دوسروں کے زیرِ سرپرستی رہنا اس کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا اور وہ ایسی زندگی سے فرار ہونے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں ہی تھا کہ اچانک سمرقند سے طلبی آگئی۔

بابر نے جب اس سلطنت کو فروری ۱۴۹۸ء میں چھوڑا تھا اس وقت سے اب تک وہاں بہت کچھ ہوچکا تھا۔ بابر کے سابق حلیف سلطان علی مرزا نے فوراً ہی بعد سمرقند پر قبضہ کرلیا تھا اور ابھی تک شہر اور اس کے نواح پر حکمرانی کر رہا تھا، لیکن اس ملک کی نئی سیاست میں سب سے نمایاں بات بے ایمان وزیر خسرو شاہ کا اچانک برسرِ اقتدار آجانا تھا۔ سلطان احمد مرزا کی وفات کے بعد دار الخلافہ پر اس کے قبضہ کرنے کی کوشش کا ذکر پہلے ہی ہوچکا ہے۔ جب بابر اور سلطان علی نے بائسنغر کو نکال باہر کیا تھا تو وہ خسرو شاہ کے پاس قندز چلا گیا تھا جہاں اس کی پُرشفقت پذیرائی ہوئی تھی۔ تخت کے خاص دعوے دار کو اپنی گرفت میں لے کر خسرو فوراً دوسرے ممکنہ دعوے داروں کو قبضے میں کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس کا یہ کام مشکل نہ تھا۔ مسعود مرزا نے حصار کی حکومت میں اہلیت کے فقدان کا ایسا ثبوت دیا تھا کہ سمرقند کے تخت کا سوال اُٹھنے پر اُس کو نظرانداز کردیا گیا تھا۔ اُس نے اپنے خسر شیخ عبداللہ برلاس پر ایسی عنایات کی تھیں کہ وہ سارے اُمرا خفا ہوگئے تھے جن پر اُس کی ذات اور اس کے مقبوضات کی سلامتی کا انحصار تھا۔ خسرو شاہ نے اُسی کے مطابق اپنے منصوبے تیار کیے۔ مسعود کو خوش کرنے کے لیے ایک ایلچی کے ہاتھ سمرقند پر متحدہ حملے کا پیغام اس کے پاس بھیج کر وہ بائسنغر کے ساتھ حصار کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ شہر کے نزدیک پہنچا وہ سب لوگ جو مسعود سے غیر مطمئن تھے، بائسنغر کے پاس بھاگ آئے اور بدقسمت حکمران ٹھیک اس

---

[1] یہی حالات تھے جب کہ بابر اچانک اُردو بازار میں ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہوگیا جس کا نام بابری تھا۔ اس واقعے کے متعلق بابر کا اپنا بیان بے حد اثر انگیز ہے۔
ملاحظہ ہو: اے۔ ایس۔ بیورج، ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۲۱۔ پی۔ ڈی کورٹیل۔ اول، ص ۱۲۳، ۱۲۴۔ المنکی، ص ۹۲، ۹۲

وقت اور تقریباً تنہا فرار ہوگیا جب اس کے دشمنوں کی فوجیں شہر کے گرد حلقہ ڈال رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر سلطان حسین مرزا بیقرہ کے پاس پہنچا لیکن اُسے اپنے بیٹے بدیع الزماں سے علی الاعلان جنگ میں ایسا مشغول پایا کہ وہ کسی حالت میں مفرور شہزادوں کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ خسرو شاہ نے بائسنغر کو حصار میں مسند نشین کرنے کے بعد مسعود سے بات چیت شروع کی، اس احمق شہزادے نے سلطان احمد مرزا بیقرہ کی محفوظ پناہ چھوڑ کر خود کو خسرو کے ہاتھوں میں دے دیا — اگرچہ خسرو شاہ بچپن سے اس کا اتالیق رہا تھا لیکن پھر بھی اس کو گرفتار کرلیا اور اندھا کرڈالا۔ اس وحشیانہ ہولناک فعل کا تذکرہ کرتے ہوئے بابر کا غیظ و غضب تیز ہوجاتا ہے اور وہ لکھتا ہے:

> "لاکھ بار لعنت اس شخص پر جس نے ایسے ہولناک فعل کا منصوبہ سوچا اور اس پر عمل کیا! روزِ حشر تک جو بھی خسرو شاہ کے اس کام کے بارے میں سنے اس پر لعنت بھیجے اور جو سن کر بھی لعنت نہ بھیجے وہ بھی سمجھے کہ وہ لعنت کا مستحق تھا۔"[1]

ایک بھائی اندھا ہوچکا تھا اور دوسرے کا انجام بھی دور نہ تھا۔ اگست ۱۴۹۹ء میں بائسنغر کو معہ اس کے سرداروں (بیگ) کے گرفتار کرلیا گیا اور صرف بائیس سال کی عمر میں تانت کے پھندے سے پھانسی پاکر موت کی گود میں چلا گیا۔ خسرو اب قندز، حصار اور اس کے تمام نواحی علاقوں کا مالک تھا۔ سمرقند پر اس کی نظریں پہلے ہی پڑنی شروع ہوگئی تھیں مگر اس کی بدقسمتی سے میدان میں دوسرے اور اس سے زیادہ شریف النسل حریف موجود تھے۔

سمرقند کے حالات اس نازک موقعے پر ایسے تھے کہ بدقسمت حکمران کے علاوہ دوسرے ہر ایک شخص کے لیے پُرامید دلچسپی پیدا کررہے تھے۔ سلطان علی کی قسمت بگڑی تو اس طاقتور ترخان خاندان سے اس کا جھگڑا ہوگیا جس نے سمرقند و بخارا کی تمام مال گزاری اپنے ہاتھ میں محفوظ کرلی تھی۔ ترخانوں نے اپنی قوت کو خطرے میں پاکر خانِ اعظم کے کچھ منگولوں کو مدد کے لیے بلایا لیکن یہ لوگ ٹوٹی ہوئی بانسری ثابت ہوئے۔ وہ نہ صرف تکلیف دہ ساتھی تھے[2]

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۹۶

[2] منگول، ترخانوں کے سردار محمد مازید (بایزید) کو قیدی بنانا چاہتے تھے، قدرتی طور پر اس وجہ سے ترخان جماعت برگشتہ ہوگئی اور وہ معاہدے سے الگ ہوگئے۔ منگول اکیلے مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے گھر واپس چل دیے لیکن راستے ہی میں پکڑے گئے اور شکست کھائی۔

بلکہ اتنے بدقسمت بھی کہ سلطان علی سے ہار گئے۔ تب ترخانوں نے بابر کے پاس ایک قاصد بھیج کر سمرقند کی پیش کش کی

ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ یہ تجویز کس عالم میں بابر کے پاس پہنچی۔ اپنی تکلیف دہ پابندیوں سے نکلنے کا یہ ایسا اچھا موقع تھا کہ اس کو ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جہانگیر کے ساتھ عجلت سے معاملات طے کرکے اور قلعہ اوش پر تنبل کے حامیوں کے اچانک حملے کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے اُس نے مُرغیلان کی راہ لی۔ اسفیرہ جاتے ہوئے اس نے اپنے معتمد قاسم بیگ اور اس کی ایک مفید امدادی سپاہ کو اپنے ساتھ لے لیا اور قدم آگے بڑھائے۔ جلد ہی خبر ملی کہ میدان میں ایک اور حریف موجود ہے۔ شیبانی پہلے ہی ایک زبردست لشکر کی مدد سے بخارا پر قبضہ کرچکا تھا اور بہت سرعت سے سمرقند کے قریب آرہا تھا۔ شہر میں بابر کے بہت سے دوست تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ بابر ممکن حد تک قریب آجائے تو تب وہ اس کی طرفداری کا اعلان کریں۔ دوسری طرف چونکہ بابر کی فوج اتنی مختصر تھی کہ ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کوئی حقیقی کارروائی نہیں کرسکتی تھی، اس لیے وہ خود اس وقت تک دور ہی رُکا رہا جب تک یہ لوگ اعلانیہ طور پر حمایت کا مظاہرہ نہ کردیں۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ شیبانی دوڑ جیت گیا۔ شہر میں اس کا داخلہ جہاں کہ اس کے طرفدار بہت کم تھے، والدۂ سلطان علی کی تقریباً ناقابلِ یقین حماقت کی بدولت ہوا۔ وہ شہر کو اس وعدے پر اس کے حوالے کردینے پر راضی ہوگئی کہ ازبک سردار اس سے شادی کرلے گا اور اپنے دوسرے علاقوں میں سے کوئی علاقہ اس کے بیٹے کے لیے فراہم کردے گا۔ چنانچہ جولائی ۱۵۰۰ء میں سمرقند شیبانی کے ہاتھوں میں چلاگیا۔ بعد میں جو کچھ ہوا اس کو ہر شخص سوچ سکتا ہے۔ سلطان علی قتل کردیا گیا۔ اس کی ماں شیبانی کی سب سے ذلیل داشتہ بن گئی اور بابر کے حامیوں کا ایک قتل عام ہوگیا۔

شہزادۂ فرغانہ نے یہ دیکھ کر کہ اس کا گوہرِ مقصود فی الحال اس کے ہاتھ سے جاتا رہا ہے سمرقند سے احتراز کیا اور حصار کی طرف بڑھ گیا۔ شیبانی کے پاس سے بھاگے ہوئے سمرقند کے کچھ عمائدین اُس سے آملے لیکن جیسے ہی وہ حصار اور خسروشاہ کے علاقے کے نزدیک پہنچا ان لوگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بہت ممکن تھا کہ صرف دو تین سو معتمد ساتھیوں کے باقی رہ جانے کے بعد بابر اپنی مہم کی کامیابی سے ناامید ہوکر رہ جاتا۔ لیکن اندجان کی مجبور و پابند زندگی کے مقابلے میں ہر چیز اس کو بہتر معلوم ہوتی تھی چنانچہ اُس نے پھر ایک بار قسمت آزمائی

کا ارادہ کرلیا۔ اس کو اپنے چھوٹے ماموں خاقان (اصغر) احمد کے پاس جانے اور مدد مانگنے کا خیال آیا لیکن یہ خیال اس نے ترک کردیا اور فیصلہ کیا کہ اپنا مقصد یا تو اپنے ہی وسائل سے حاصل کرے گا یا پھر کچھ نہیں کرے گا۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر اس نے سمرقند پر چڑھائی کی۔

شیبانی نے اس مختصر جماعت کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ دراصل ازبک کے پاس اعتماد کا اچھا سبب موجود تھا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر اس کے تین چار ہزار جنگ آزمودہ سپاہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور اُتنی ہی تعداد میں اُن کے ساتھ مقامی بھرتی کے سپاہی بھی تھے۔ قلعے کے اندر پانچ چھ سو سپاہی ایک معتمد افسر کے زیر کمان تھے۔ دوسری طرف بابر کے پاس اچھے بُرے کل دو سو چالیس آدمی تھے۔ جو کچھ بیتی خود اُسی کے الفاظ میں سنیے:[1]

"صورت حال کے متعلق اپنے تمام سرداروں اور غیر زرہ پوش جانبازوں سے بات چیت کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے: — چونکہ شیبانی نے حال ہی میں سمرقند پر قبضہ کیا ہے، اس لیے نہ تو سمرقندیوں کو اس سے تعلق خاطر ہوا ہوگا اور نہ خود اُسے اُن لوگوں سے — اگر ہم فوراً کوشش کریں تو یہ کام پورا کرسکتے ہیں — اگر ہم سیڑھیاں لگائیں اور قلعے پر اچانک حملہ کردیں تو سمرقندی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے — آخر کیا وجہ ہے کہ نہ ہوں؟ اگر وہ ہمیں کوئی مدد نہ بھی دیں تو کم از کم ازبکوں کے لیے ہم سے جنگ نہ کریں گے — اور آخری بات یہ کہ ایک بار سمرقند ہمارے ہاتھ آگیا تو وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا —

"اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے ہم بعد نمازِ ظہر یازیلاق سے نکل کر روانہ ہوئے اور اندھیرے میں آدھی رات تک سفر کرتے ہوئے خان یورتی جا پہنچے۔ یہاں ہمیں خبر ملی کہ سمرقندیوں کو ہمارے آنے کی اطلاع ہے، اس وجہ سے ہم شہر کے اور نزدیک نہ گئے بلکہ خان یورتی سے سیدھے واپس لوٹے۔ پو پھٹ رہی تھی جب ہم رباطِ خواج

---

[1] مصنف نے یہاں یہ اور اضافہ کردیا ہے: "جیسے کہ مسز بیورج نے بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔" (مترجم)

کے نشیب میں دریائے کوہک کو پار کر کے ایک بار پھر یار یلاق میں تھے۔
ایک دن قلعہ اسفیدک میں میرے گھرانے والوں کی ایک جماعت میرے سامنے بیٹھی تھی، دوست نثار، نویاں کلکدش، وخان قلی، کریم داد وشیخ درویش اور مریم نثار سب ہی وہاں موجود تھے۔ چاروں طرف بحث و مباحثہ جاری تھا تو میں نے کہا "اچھا اب یہ بحث چھوڑو ــــ یہ بتاؤ کہ اگر خدا سب کچھ ٹھیک کر دے تو ہم سمرقند پر کب تک قبضہ کر لیں" ــــ کسی نے کہا "ہم اُسے گرمیوں میں لے لیں گے" ــــ یہ خزاں کا آخر تھا۔ دوسرے بولے "ایک مہینے میں" ــ "چالیس دن میں" ــ "بیس دن میں"، نویاں کلکدش نے کہا "ہم چودہ دن میں اُسے لے لیں گے" ــــ خدا نے اُسے سچا کر دکھایا۔ ہم نے واقعی ٹھیک چودہ دن میں اُسے لے لیا۔
"عین اسی زمانے میں میں نے ایک حیرت انگیز خواب دیکھا: ــــ محسوس ہوا اعلاحضرت خواجہ عبیداللہ (احراری) تشریف لائے ہیں۔ میں ان کی تعظیم کے لیے باہر گیا۔ وہ اندر آئے اور بیٹھ گئے۔ لوگوں نے بظاہر کافی ادب و احتیاط کے بغیر ان کے سامنے دسترخوان بچھا دیا۔ اس کی وجہ سے اعلاحضرت کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ مُلّا بابا (؟ پاشاغری) نے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اشارے سے جواب دیا، میری وجہ سے نہیں! قصور دسترخوان بچھانے والے کا ہے ــــ خواجہ صاحب سمجھ گئے اور معذرت قبول کرلی۔ جب وہ اٹھے تو میں نے مشایعت کی۔ اس گھر کے بڑے کمرے میں انھوں نے میرا شاید دایاں یا بایاں ہاتھ پکڑا اور مجھے اتنا اوپر اُٹھالیا کہ میرا ایک پاؤں زمین سے الگ ہو گیا اور ترکی زبان میں کہا: "شیخ مصلحت نے (سمرقند) دے دیا ہے" ــــ میں نے واقعی چند دن بعد سمرقند لے لیا۔
دو تین دن میں قلعہ اسفیدک سے قلعہ وسمند کی طرف حرکت کی گئی۔ اگرچہ ہم نے اپنی پہلی آمد سے اپنے منصوبے کا راز فاش کر دیا تھا مگر خدا پر بھروسا کر کے ہم نے سمرقند پر ایک دفعہ اور چڑھائی کی۔ بعد نماز ظہر ہم لوگ قلعہ وسمند سے روانہ ہوئے۔ خواجہ ابوالمکارم ہمارے ساتھ تھا۔ نصف شب تک ہم سایہ دار راستے میں خندق عتیق کے پُل پر پہنچے۔ وہاں سے ہم نے ستّر یا اسّی عمدہ سپاہیوں

کی ایک ٹکڑی آگے روانہ کی جن کا کام یہ تھا کہ 'غارِ عاشقاں' کے مقابل سیڑھیاں لگائیں۔ اُن پر چڑھ کر اندر داخل ہوجائیں۔ پھر بابِ فیروزی پر متعین لوگوں کا مقابلہ کرکے اس پر قبضہ کرلیں اور ایک آدمی کو میرے پاس بھیج دیں۔ وہ جری سپاہی چلے گئے، غارِ عاشقاں کے مقابل سیڑھیاں لگائیں۔ سب کی بے خبری میں اندر داخل ہوگئے۔ باب پر جاکر فاضل ترخان پر حملہ کیا۔ اُس پر اور اس کے تھوڑے سے سپاہیوں پر ضربات لگائیں۔ اُن کو ہلاک کرڈالا اور کلہاڑی سے تالا توڑ کر دروازہ کھول دیا۔

" ابوالقاسم کوہ بر خود ہمارے ہمراہ نہیں آیا تھا لیکن اپنے چھوٹے بھائی احمد قاسم کی قیادت میں اپنے تیس یا چالیس سپاہی بھیج دیے تھے۔ ابراہیم ترخان کا کوئی آدمی ہمارے ساتھ نہ تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی احمد ترخان کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس وقت آیا جب میں شہر میں داخل ہوکر خانقاہ میں قیام پذیر ہوچکا تھا۔

" شہر والے ابھی سو رہے تھے۔ کچھ تاجروں نے اپنی دکانوں سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے پہچانا اور دُعائیں دیں۔ کچھ دیر بعد جب خبر پھیلی تو اہلِ شہر اور ہمارے لوگوں پر ایک نادر قسم کی مسرّت و طمانیت طاری ہوگئی۔ انھوں نے گلی کوچوں میں ازبکوں کو لاٹھیوں اور پتھروں سے پاگل کتوں کی طرح مار ڈالا۔ اس طریقے پر چار پانچ سو ازبک مارے گئے۔ حاکمِ وقت جانِ وفا اس وقت خواجہ یحییٰ کے گھر میں سکونت پذیر تھا، وہ بھاگ کر شیبق خاں کے پاس چلا گیا۔

" بابِ فیروزی سے داخل ہوکر میں سیدھا دارالعلوم پہنچا اور خانقاہ کی محراب کے اوپر جگہ لے لی۔ دن نکلنے تک "مارو! مارو!" کا شور و غل برپا رہا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی خبر پاکر تاجر و عمائدین خوشی خوشی مجھ سے ملنے آئے۔ جیسا کچھ کھانا تیار تھا میرے پاس لائے اور میرے لیے دُعائیں مانگیں۔ دن نکلنے پر خبر ملی کہ ازبک بابِ آہنی پر لڑ رہے ہیں، اُنھوں نے اپنے مورچے کو بیرونی اور اندرونی دروازوں کے درمیان مضبوط کرلیا ہے۔ میں دس پندرہ یا بیس آدمی لے کر فوراً باب کی طرف روانہ ہوا لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی عوام ازبکوں کے ہجوم نے جو کہ لوٹ مار کے لیے شہر کا کونا کونا چھان رہے تھے اُن ازبکوں کو باہر نکال دیا تھا۔ جو کچھ

ہو رہا تھا اس کا حال سُن کر شیبق خاں عجلت سے سو یا ایک سو چالیس آدمیوں کے ساتھ سورج نکلتے باب آہنی پر آپہنچا۔ اس کی آمد ہمارے لیے ایک بڑا نایاب موقع تھی لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے میرے آدمی بہت کم تھے۔ یہ دیکھ کر کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا وہ فوراً لوٹ گیا۔ باب آہنی سے میں حصار کی طرف بڑھا اور وہاں قصر بوستاں کے پاس گھوڑے سے اُتر پڑا۔ صاحب منصب و امتیاز سرداران میرے پاس وہاں آئے اور مجھے دیکھ کر دُعائیں دیں۔

" تقریباً ایک سو چالیس سال تک سمرقند ہمارے خاندان کا دارالخلافہ رہا تھا۔ ایک غیر قوم کا شخص اور وہ بھی کس قسم کا! ــــ ایک ازبک دشمن نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ خُدا نے پھر عطا کر دیا! ــــ غارت شدہ و برباد ہمارا اپنا سمرقند ہمارے پاس واپس آگیا"۔[1]

یہ تھی داستان اس کارنامے کی جس کو بابر کے متعدد دلیرانہ کارناموں میں شاید سب سے زیادہ طوفانی قرار دیا جا سکتا ہے اور تنہا یہ کارنامہ ہی بابر کو وہ عزت و شہرت عطا کر سکتا تھا جو اس کے لیے اتنی عزیز و بیش قیمت تھی ــــ جہد و عمل سے اس کی تمام تر محبت کے بعد اگر کسی چیز سے اُس کی ذہنی عظمت کا اظہار سب سے نمایاں طور پر ہوتا ہے تو وہ اس کی قوتِ صبر و تحمل ہے ــــ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح مصیبت و بدبختی کے اُن پے در پے صدمات میں بھی وہ خوش طبع رہا جو دُنیا کے بیشتر انسانوں کو خودکشی پر مجبور کر سکتے تھے ــــ کس طرح وہ اس وقت بھی اپنا پُرسکون اعتماد قایم رکھتا ہے اور اپنی جد و جہد میں ذرا سا بھی ضعف نہیں آنے دیتا جب کہ اس کے عزیز ترین بلند عزائم ایک ایک کر کے اس کے قدموں میں دم توڑ دیتے ہیں اور اس کے انتہائی معتمد احباب اس کے ایّامِ مصیبت میں اس کی طرف سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۳۱ - ۱۳۴

بابِ سوم

مُصیبت کے دن

اسناد: 'بابر نامہ'۔ 'تاریخِ رشیدی'۔ 'حبیب السیر' 'شیبانی نامہ'۔'روضۃ الصفائے خواند میر' (ایڈیشن: ایماتنگ)۔
جدید تصانیف: ارسکن'۔ 'لین پول'۔

بابر نے بے پناہ نامساعد حالات سے جنگ کر کے اب سمرقند کو دوسری مرتبہ جیت لیا تھا اور اس کی دلیری کو مکمل کامیابی کا تمغہ عطا ہوا تھا۔ لیکن جس دشواری پر قابو پا لیا گیا تھا وہ اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی جس کا اب اس کو سامنا تھا۔ اس کے پاس صرف کوئی دو سو کار آزمودہ سپاہی تھے اور باقی کے لیے اسے شہری عوام کی پُر جوش لیکن غیر تربیت یافتہ شجاعت پر بھروسا کرنا تھا۔ چہار دیواری کے باہر شیبانی پانچ ہزار سپاہیوں کی ایک فوج کے ساتھ موجود تھا جو خوب تربیت یافتہ تھے، خوب مسلح تھے، سامانِ حرب سے خوب آراستہ تھے اور اپنی گرفت سے شہر کے غیر متوقع طور پر چھین لیے جانے کی وجہ سے آتشِ انتقام میں جل رہے تھے۔

لیکن اسی لمحے سے اچانک جادو کی طرح یہ مشکلات غائب ہونے لگیں۔ تمام دیہاتی علاقہ بابر کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ شودر، سغد اور قریبی قلعوں نے ایک ایک کر کے اپنی محافظ ازبیک فوجوں کو یا تو نکال باہر کیا یا اُن کو حراست میں لے لیا اور سمرقند کے نوعمر شہزادے (بابر) کی طرفداری کا اعلان کر دیا۔ شیبانی کے حالات بہت ابتر ہو گئے ـــــ پھر اسی نامساعد موقعے پر اس کے اپنے اور اُمرا کے اہل و عیال آ پہنچے جن کو اس نے اس وقت بُلا بھیجا تھا جب سمرقند

میں اس کو اپنی فتح مکمل نظر آرہی تھی۔ ان سب حالات نے مل کر اُسے بخارا کی طرف ہٹ جانے پر مجبور کر دیا جہاں سے وہ بابر کے حالات پر نظر رکھ سکتا تھا اور اپنے حریف پر ایک جوابی ضرب لگانے کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کر سکتا تھا۔

بابر کو اپنی صورتِ حال کی دشواریوں کا پورا احساس تھا۔ لیکن اس نے جب تک بھی ہو سکے سمرقند پر قبضہ قایم رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شیبانی کے اونچے حوصلوں کو ایک بار ہمیشہ کے لیے دبا دینے کا یہی موقع تھا جو نہ صرف 'شہزادۂ فرغانہ' کے لیے بہت خطرناک تھا بلکہ اس کے پورے خاندان ـــــ خانوادۂ تیموریہ کے لیے بھی ـــــ اپنے عزم کی ایک نمایاں علامت کے طور پر اس نے اپنی بیگم اور اپنی ماؤں کو بُلا بھیجا۔ ان کے آنے کے کچھ دن بعد اس کی پہلی اولاد تولّد ہوئی، مگر یہ بچی جس کا نام فخر النساء رکھا گیا تھا چھ ہفتے بعد ہی ختم ہو گئی۔ بابر کے پاس رنج و غم کرنے کو زیادہ وقت نہ تھا۔ وہ اپنے تیموری رشتہ داروں کے پاس ایلچی پر ایلچی بھیج کر کمک بھیجنے پر زور دے رہا تھا تاکہ شیبانی کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے۔ لیکن اس کو جو جواب ملا وہ بہت ہمت شکن تھا۔ کچھ لوگوں نے تو صاف انکار کر دیا اور کچھ نے اس کی درخواست نظر انداز کر دی۔ محض دو ذرائع سے اُسے حقیر سی امداد ملی۔ اس کے (دونوں) ماموں خان صاحبان نے چار پانچ سو آدمی بھیج دیے۔ اس کے بھائی جہانگیر نے جو کہ اب فرغانہ کا تنہا حکمراں تھا، دو سو اور بھیج دیے۔

سردیوں بھر بہتر سے بہتر ممکن طریقے پر خود کو مضبوط کرنے کے بعد ۱۵۰۱ء کے شروع میں بابر نے میدان میں آنے کا ارادہ کر لیا۔ بلاشبہ اُسے امید تھی کہ اگر ازبکوں کے خلاف اس نے ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی تو اُس کے رشتہ دار اپنا بے حس رویّہ چھوڑ دیں گے اور اپنی فوجوں کو اس کے لشکر میں شامل کر دیں گے۔ آئندہ ہم دیکھیں گے کہ ایسا سوچنے میں وہ جزوی طور پر حق بجانب تھا ـــــ علاوہ ازیں شیبانی نے گذشتہ موسم گرما میں کھویا ہوا کچھ علاقہ پھر سے حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے قراقل اور دبوسی کے دو قلعے واپس لے لیے تھے ـــــ پہلے کو اس کی محافظ فوج کی پسپائی کے باعث اور دوسرے کو براہِ راست حملے کے ذریعے ـــــ ان سب حالات نے مل کر بابر کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے دشمن سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کا خطرناک اقدام کر ڈالے۔

لہٰذا اپریل مئی ۱۵۰۱ء میں بابر شہر سے نکلا اور اس مقام پر اپنا پڑاؤ ڈالا جو 'سرپُل'

کہلاتا تھا۔ خندقوں اور گھنی جھاڑیوں کے ذریعے اس نے اپنے پڑاؤ کو مضبوط کرلیا اور دشمنوں و دوستوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے دشمن ہی وارد ہوا۔ شیبانی اس سے زیادہ اور کسی چیز کا متمنّی نہ تھا کہ اپنے دشمن کو سمرقند کی مضبوط فصیلوں سے باہر پا جائے۔ اس نے مسلسل شب خون کے ذریعے بابر کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تعداد کی برتری رکھنے کے باوجود وہ اپنے حریف کے مضبوط مورچے کو نہ توڑ سکا۔ اب شیبانی کی حالت نازک تھی۔ وہ بابر کو ایک دست بدست مقابلے پر مجبور نہ کرسکا تھا اور کمک نزدیک تھی جس سے تعداد کی وہ برتری کسی نہ کسی حد تک زائل ہو سکتی تھی جو شیبانی کی تنہا اُمید تھی۔ اگرچہ سلطان حسین مرزا بیقرہ، بدیع الزماں مرزا اور خسرو بے عمل رہے لیکن سمرقند کی جس جماعت کو شیبانی نے تباہ کیا تھا اس کا سردار باقی ترخان تقریباً دو ہزار آدمیوں کے ساتھ صرف دو دن کی مسافت پر بابر کے ساتھ شامل ہونے کا منتظر تھا اور محمد مرزا دوغلت جس کو بابر کے ماموں نے تقریباً اتنی ہی فوج کے ساتھ بابر کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا، صرف چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ معاملات اس منزل پر تھے جب کہ بابر نے کمک پہنچنے سے پہلے میدان میں اُتر کر دیدہ و دانستہ اپنی فتح کے موقعے کو کھو دیا ـــــ وہ کہتا ہے:

> "میں مقابلے کے لیے اس لیے بے چین تھا کیوں کہ لڑائی کے دن 'ہشت نجوم' دونوں فوجوں کے درمیان تھے۔ اگر لڑائی ٹال دی جاتی تو یہ ستارے تیرہ چودہ دن کے لیے دشمنوں کے پیچھے ہوتے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیالات کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور ہماری عجلت بے وجہ تھی۔"[1]

نجوم سے متعلق اپنے توہمات پر متاسف ہونے کی بہت کافی وجہ جلد ہی بابر کے سامنے آنے والی تھی۔ اپنے سپاہیوں کو روایتی ترتیب ـــــ: ہراول، قلب، میمنہ اور میسرہ میں آراستہ کر کے وہ باہر نکلا اور دشمن کا مقابلہ کیا۔ اُس کا میمنہ دریائے کوہک پر قایم تھا اور اسی بات نے جنگ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، کیوں کہ شیبانی نے اس کو دریا میں دھکیلنے کا عزم کرلیا۔ ازبک سردار (شیبانی) نے اپنے میمنہ کو بابر کے میسرہ کے گرد چکّر دیا اور بابر کو اپنے بازو کو بچانے

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۳۹ ۔ فرشتہ (دوم، ص ۲۰) میں ایک قصّہ لکھا ہے کہ بعد کی شکست محمود خاں اور جہانگیر مرزا کی فوجوں کے اچانک ساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کی اختراع ہے اور مجھے اس کی کوئی تصدیق نہیں ملی۔ شاید منگول مددگاروں کے ہاتھوں بابر کے سامان کی لوٹ کھسوٹ کا یہ مسخ کردہ بیان ہے۔
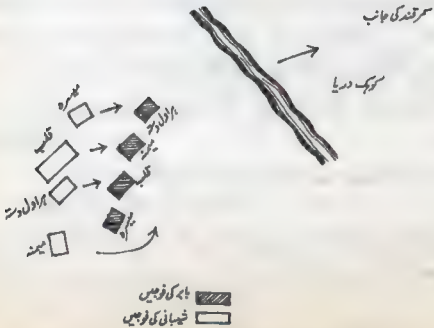
کے لیے اس سے مقابلے کو گھومنا پڑا جس کے باعث اُس کی پیٹھ دریا کی طرف ہوگئی۔ اس چیز نے قلب پر دشمن کے حملے کا راستہ کھول دیا کیوں کہ ہراول دستے کو گھومنے کی مہلت نہ مل سکی اور وہ تبدیل شدہ نئے نقشۂ جنگ میں داہنی طرف رہ گیا ـــــ سمرقندی سپاہیوں کی زبردست رزم آرائی کے باوجود جو ایک وقت ایسی نظر آتی تھیں کہ محض اپنی شجاعت کی بدولت میدان جیت لیں گی، بابر کا میسرہ بالکل ہی کچل گیا۔ اس کا قلب آگے اور پیچھے سے حملے کی زد میں آگیا ـــــ آخر لمحے میں ازبکوں نے اپنی قطار کے دونوں سروں کو گھمایا اور بابر کے عقب پر خوفناک گردشی حملہ کر دیا جو 'طلغمہ' کہلاتا تھا اور ان کا قومی طریقۂ جنگ تھا۔ بابر کے منگول مددگاروں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے، سامان کی لوٹ کھسوٹ کر کے انتشار میں اور اضافہ کر دیا اور بقول بابر اس طرح ان کی فطرت کی پیدائشی رذالت کی پوری پوری تصدیق ہوگئی۔ اب شکست سے بچنے کی کوئی اُمید باقی نہ تھی۔ دس آدمیوں کو لے کر جو ابھی تک اُس کے ساتھ رہ گئے تھے، بابر نے بھاری زرہ میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اپنے گھوڑے پر ہی کوہک کو پار کیا اور سمرقند روانہ ہوگیا۔

'سرپل' کی شکست کے نتائج انتہائی تباہ کن ہوئے۔ بابر کے چند بہترین آدمی ـــ ابراہیم ترخان، ابراہیم سارو، ابراہیم جان وغیرہ کھیت رہے تھے۔ کئی اور اشخاص جیسے محمد ترخان اور قنبر علی وقتی طور سے خسرو کے پاس بھاگ گئے۔ اگرچہ اس کے متعدد قریبی اعزّا و احباب نے اس کی بدبختی کے اس دور میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے باوجود کہ سمرقند کے علاوہ تمام علاقہ تیزی کے ساتھ شیبانی کے ہاتھوں میں چلا گیا لیکن بابر کے دماغ میں شکست تسلیم کرنے کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ اس نے اپنے بیگ سرداروں کی کونسل طلب کی اور وہ کہتا ہے کہ :

> "مشورے کے بعد ہم نے قلعے کو مستحکم کرنے اور اس کے اندر ہی رہ کر موت و زندگی کا فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔"[۱]

خود بابر نے اپنا مستقر وسط شہر میں بنا دیا اور اپنے خیمے مدرسۂ الغ بیگ مرزا کی چھت پر لگا دیے۔ اس کے بعد اس نے اپنے سب سے زیادہ معتمد آدمیوں کو شہری فصیلوں کے

---

[۱] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۴۱ - پی۔ ڈی کورٹنل، اول، ص ۱۹۰۔ (المنسکی ۔ ۷)

برجوں اور دروازوں پر متعین کر دیا اور شیبانی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک حملے کے لیے اس نے تمام احتیاطی تدابیر کیں اور خود اکثر فصیل کے پاس چکر لگاتا رہتا تھا۔

دو تین دن میں ازبک (شیبانی) آپہنچا، لیکن شہریوں کی شجاعت کی وجہ سے وہ مزید کئی دن تک فصیلوں کے نزدیک نہ پہنچ سکا، کیوں کہ جب اس کے آدمی مضافات میں سے گزرنے کی کوشش کرتے تو شہری ہجوم انھیں تنگ کرتا تھا۔ اپنی کامیابی سے مزید ہمت پاکر عوام کے ہجوم محاصرین پر چھاپے مارنے لگے اور آخر انھیں فریب سے ترغیب دیگر باہر کھلے میدان میں لایا گیا جہاں ان کو پکڑ لیا گیا اور بری طرح ان کی خبر لی گئی۔ جلد ہی شیبانی نے شہر کو اچھی طرح گھیرے میں لے لیا۔ قلعہ بند فوج مایوس کن حد تک ناکافی تھی اور کئی مرتبہ ازبک ایک ایسے حصۂ شہر میں داخل ہونے میں کامیاب بھی ہو گئے جن کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا لیکن زبردست لڑائی کے بعد انھیں نکال دیا گیا۔

محاصرہ تمام گرمیوں جاری رہا اور رسد میں کمی پڑنے لگی[1] غریب طبقات کتّے اور گدھے کھاکر گزارا کرنے لگے اور قلعہ بند فوج کے گھوڑوں کو پتّیاں اور لکڑی کی چھیلن بطور غذا ملنے لگی[2] شہر کو بیرونی دُنیا سے الگ کرنے کے بعد شیبانی نے پھر اس پر کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ تھوڑے فاصلے سے محاصرہ کرکے تھکی ماندی فوج کو مستقل طور پر خوف و خطرے میں مبتلا رکھے رہا۔ ہر طرف اور ہر جگہ مدد کے لیے بار بار ایلچی اور پیغامبر بھیجے گئے تھے لیکن کوئی بھی مدد نہ آئی۔ بابر شکایت کرتا ہے کہ:

"سلطان حسین مرزا نے کسی ہمّت افزا پیغام کے ذریعے بھی ہماری مدد نہ کی۔"

بلکہ اس کے برخلاف شیبانی کے پاس اپنا ایلچی بھیج دیا۔

اب بابر کی حالت بہت مایوس کن تھی اور اس کے آدمیوں نے بھی ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ـــــ وہ لکھتا ہے:

"امداد کے سلسلے میں ہم ہر طرف سے قطعی مایوس ہو چکے تھے۔ کسی جگہ بھی کوئی اُمّید باقی نہ تھی۔ ہمارا سامانِ رسد بہت ہی خراب تھا۔ اس میں بھی جو باقی تھا

---

[1] دوسری طرف شیبانی جس کے اختیار میں ملک کے وسائل تھے، سامانِ رسد سے مالا مال تھا (شیبانی نامہ)

[2] شہتوت اور کھجور کی پتّیاں سب سے بہتر پائی گئیں۔

وہ ختم ہو رہا تھا ـــــ اور مزید کچھ نہیں آرہا تھا۔ اسی دوران شیبق خاں نے صلح کی بات چیت شروع کردی۔ اگر کسی سمت سے بھی اُمید باقی ہوتی یا سامان غذا مل جاتا تو صلح کی بات چیت پر کان نہ دھرے جاتے ـــــ یہی شدنی تھا! ایک قسم کی صلح کرلی گئی۔"[1]

بابر یہ نہیں بتاتا کہ صلح کی کیا شرائط تھیں۔ وہ اُن سے بہت ہی شرمندہ تھا۔ لیکن معلومات کے دیگر ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو مجبور کردیا گیا تھا کہ شہر کو غیر مشروط طور پر دُشمن کے حوالے کردے اور خود اپنی نیز اپنے باقی ماندہ افرادِ خاندان کی سلامتی کا پروانۂ راہداری حاصل کرنے کے لیے بطور قیمت اپنی بڑی بہن خانزادہ بیگم کی شادی اپنے دشمن سے کردے۔[2] اس بات سے یقیناً بابر کی خود داری کو بڑا تلخ صدمہ پہنچا ہوگا۔ اب وہ پھر ایک جہاں گرد تھا کیوں کہ فرغانہ صلح نامہ کے تحت جہانگیر کے ہاتھوں میں تھا۔

اس نے شیبانی کے کردار کے متعلق خاصا صحیح اندازہ قایم کرلیا تھا اور اسی وجہ سے اس کے پروانۂ راہداری پر کوئی اعتماد نہ کیا۔ وہ آدھی رات کے وقت اپنی والدہ اور ساتھیوں کے ساتھ شہر سے کھسک گیا۔ اس کا خیال اوراتیپہ جانے کا تھا جس کو وہ اپنے ماموں خان سے مانگ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اندھیرے میں راستے سے بھٹک گیا[3] اور ابھی بمشکل ہی خطرے سے باہر ہوا تھا کہ دن نکل آیا۔ بابر نے ان حالات میں بھی خوش طبعی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور تھکا دینے والے راستے میں تفریح پیدا کرنے کے لیے قاسم بیگ دقبر علی کے ساتھ مقابلے کی دوڑ لگائی اور ضمناً ایک بار بُری طرح گرا بھی۔ وہ لکھتا ہے:

"میرا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ میں نے پیچھے مڑکر اُن کے گھوڑوں کو دیکھنے کی کوشش کی۔ شاید زیربند ڈھیلا ہوچکا تھا، میری زین گھوم گئی اور میں سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اگرچہ میں فوراً ہی اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوگیا لیکن

---

[1] اے۔ایس۔بیورج، ص ۱۴۷۔ پی۔ڈی کورٹیل، اول، ص ۱۳۵ (الفنسکی، ص ۱۱۶)

[2] شیبانی نامہ، باب ۳۹۔ حبیب السیر، دوم، ص ۳۱۰۔ گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، ورق ۳۶ (ایڈیشن: اے۔ایس۔بیورج، ص)

[3] رات غیر معمولی طور پر تاریک تھی۔ (شیبانی نامہ، اے۔ایس۔بی، ص ۱۴۷، نوٹ)

میرا دماغ شام تک سنبھل نہ سکا۔"

رسد کی کمی کی وجہ سے ایک گھوڑے کو مارنے کی ضرورت پیش آگئی جس کا گوشت سیخ پر چڑھاکر کباب بنائے گئے۔ بابر زیادہ دیر ٹھہرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ ابھی تک وہ دشمنوں کی زد میں تھا۔ تمام رات تھکی ماندی جماعت چلتی رہی یہاں تک کہ جب پو پھٹی تو انھوں نے خود کو درست علاقے میں پایا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ویزک پہنچے۔ بابر کہتا ہے:

"وہاں کئی قسم کا فربہ گوشت تھا ـــــ نفیس آٹے کی روٹیاں تھیں، بہ افراط شیریں تربوز تھے اور بکثرت بہترین انگور تھے ـــــ ہم کیسی بے سرو سامانی و عُسرت سے کیسی بہتات و یُسرت میں جا پہنچے تھے! کیسی سختیوں سے کیسی راحتوں میں!!"[1]

اب بابر کو موسم سرما کے لیے جائے پناہ کی ضرورت تھی جو تیزی سے قریب آرہا تھا۔ اپنے ساتھ جو کچھ سامان تھا، اس کو اوراتیپہ کے گاؤں دیخ کات میں رکھ کر وہ اپنے ماموں محمود خاں اور ان کے گھر والوں سے ملنے روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خان اس سے مہربانی سے پیش آیا اور اوراتیپہ اپنے بھانجے کو دینے کا نیم وعدہ بھی کرلیا لیکن جب بابر محمد حسین مرزا کے پاس قیام کرنے کے لیے گیا جو اس شہر پر قابض تھا تو اس پر قبضہ پانا ناممکن نظر آیا۔ اس لیے اوراتیپہ میں چند دن گزارنے کے بعد اس نے موجودہ حالات پر صابر و شاکر رہنے اور دیخ کات پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسی کہ اس کی فطری خصوصیت تھی اُس نے ایک پُرخلوص طریقے پر خود کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ اپنے تمام دعوؤں کو ترک کردیا اور محض ایک سادہ مہمان کی طرح گاؤں کے مقدّم کے گھر رہنے لگا۔ یہاں ایک ایسا سابقہ پڑا جس کے متعلق قسمت نے یہ طے کردیا تھا کہ جس سے بابر کی آئندہ زندگی کی تشکیل پر ایک اعلاترین اثر پڑے گا۔ مقدّم کی عمر ستّر یا اسّی برس کی تھی مگر اس کی ماں جس کی عمر ایک سو گیارہ سال تھی، ابھی بقیدِ حیات تھی۔ بابر کہتا ہے:

"معلوم ہوا ہے کہ اُس کے کچھ رشتہ دار تیمور بیگ کے لشکر کے ساتھ ہندوستان گئے تھے۔ یہ بات اس کے ذہن میں تھی اور وہ اس کا قصہ

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۴۷، ۱۴۸

سنایا کرتی تھی "۔[1]

اس نے بابر کے مورثِ اعلیٰ کے کارناموں کی جو کہانیاں سنائیں اُنھوں نے نوعمر شہزادے کے تخیلات میں ایک جوش و ہیجان پیدا کر دیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس وقت سے ہی ہندوستان میں تیمور کی فتوحات کو تازہ کرنے کا خواب اس کے ذہن کے پسِ منظر میں مسلسل قایم رہا ـــــ لیکن اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے سے پیشتر بہت سے مصائب کو بہادری سے برداشت کرنا تھا ـــــ بہت سی دُشواریوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس دوران وہ ایک پہاڑی باشندے کی سی معمولی زندگی بسر کرتا رہا:

" میں برابر آس پاس کے پہاڑوں میں گشت لگایا کرتا تھا۔ عام طور سے ننگے پاؤں ہی جاتا، بہت زیادہ ایسا کرنے سے میرے پیر اس قدر سخت ہوگئے کہ چٹانوں و پتھروں سے اُن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا "۔[2]

یہ تھی وہ حالتِ زار جس میں سابق سلطانِ سمرقند مبتلا تھا۔ لیکن اُس کی شگفتگیِ طبع میں ذرا سی بھی کمی نہ آئی۔ وہ بڑی شادمانی سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح اس کے ایک ساتھی نے ایک دہقانی کو لاجواب کر دیا جس نے اجنبیوں کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی تھی۔ ایک پہاڑی پگڈنڈی کے متعلق یہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کہ کدھر جاتی ہے، بابر نے ایک گلّہ بان سے تحقیق کی۔

" میرے بیل کے پیچھے پیچھے چلے آؤ " اس شخص نے مسکرا کر کہا " اور دیکھو جب تک بیل نہ رُکے تم بھی نہ رُکنا "

" لیکن فرض کرو کہ بیل اس پگڈنڈی سے کھسک جائے ـــ تب؟ " خواجہ اسداللہ جواب میں کہتا ہے اور دہقانی خفّت سے مُنھ کھولے رہ جاتا ہے۔

جاڑے کے آنے پر بابر کے کئی سپاہیوں نے اپنے اہلِ خاندان سے ملنے کے لیے

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۵۰۔ پی۔ ڈی کورٹیل، اول، ص ۲۱۰ (المنسکی، ص ۱۱۸)
دہلی پر چونکہ ۱۳۹۸-۱۳۹۹ء کے موسم سرما میں قبضہ ہوا تھا، اس لیے وہ اس وقت بہت چھوٹی تقریباً پانچ سال کی ہوگی۔ بلاشبہ کہانی کو بار بار دہرانے سے اس کی یادوں میں کمی نہ آئی ہوگی۔

[2] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۵۰۔

اندجان جانے کی اجازت مانگی۔ اس وقت اس چیز کو ایک دانش مندانہ چال خیال کیا گیا کہ اُن کے ذریعے جہانگیر کو جو کہ اب فرغانہ کا حکمران تھا اور اُس کے دستِ راست، تنبل کو تحائف بھیجے جائیں۔ اس تجویز کے مطابق بابر نے اپنے چھوٹے بھائی کو خودِ اپنی سموری ٹوپی اور تنبل کو ایک بڑی تلوار بھیجی جو بابر کے خاص دوست نویان کلکدش نے سمرقند میں تیار کرائی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ بارہ مہینے کے اندر ہی ایک موقع ایسا آیا جب کہ یہ تلوار اپنے معطی کی زندگی کا تقریباً خاتمہ ہی کر دیتی۔

جلد ہی ایک ایسی خبر آئی جو بابر کو گوشہ نشینی کی زندگی سے باہر کھینچ لائی۔ شیبانی نے دریائے خجند کو پار کر لیا تھا اور اب وہ شاہ رُخیہ اور بشکنت کے اضلاع لوٹ رہا تھا۔ اپنے حریف پر ایک ضرب لگانے کا موقع پانے کی اُمید میں بابر فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ لیکن یہ مُہم ناکام رہی۔ بابر کے پہنچنے سے پہلے ہی ازبک واپس لوٹ گئے تھے۔ موسم اتنا سخت تھا کہ سردی سے بابر کے کئی آدمی مر گئے اور واپسی میں اُس کے عزیز دوست اور سمرقندی تلوار کے مالک نویان کلکدش کی ایک ذاتی دشمن کے گھر کے نزدیک مشتبہ حالت میں موت واقع ہو گئی۔[۱] اس آخری المناک واقعے نے بابر کو بہت بُری طرح متاثر کیا۔ وہ کہتا ہے:

"اس کی موت نے مجھے کچھ عجیب طرح افسردہ کر دیا، بہت کم لوگوں کے لیے میں نے ایسا غم محسوس کیا ہے ـــــ میں ہفتہ عشرہ تک مستقل روتا رہا۔"[۲]

بہار آئی اور اُس کے ساتھ ہی شیبانی کا ایک اور دھاوا اس مرتبہ اوراتیپہ کے گرد و نواح پر ہوا۔ بابر نے ایک دفعہ پھر اس پر ضرب لگانے کی کوشش کی اور ایک دفعہ پھر وہ بچ نکلا۔ اب بابر بے عملی سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کسی ملک یا جائے رہائش کے بغیر یوں بے در، بے گھر ہو کر پہاڑوں پہاڑوں گھومنے میں پسندیدگی کی کوئی بات نہیں۔ میں

---

[۱] وہ ایک پہاڑی نالہ کی تہہ میں مُردہ پایا گیا اور کہانی یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنے دشمن کے گھر کی ایک تقریب سے واپس لوٹتے ہوئے نشے کی حالت میں نیچے گر پڑا۔ بابر اس پر یقین نہیں کرتا ـــــ اور وہ اس پوزیشن میں تھا کہ معاملے کا اندازہ لگا سکے۔

[۲] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۵۲

نے اپنے آپ سے کہا 'سیدھے خان کے پاس جاؤ'۔"

اور فوراً ہی اس پر عمل کیا۔ بابر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اپنے ماموں سے تاشقند میں آملا۔ خان اس وقت تنبل کے خلاف جو کہ اوراتیپہ پر حملہ کرتا رہا تھا، اپنی قوت کے مظاہرے میں مشغول تھا۔ بابر ٹھیک ایسے وقت وہاں پہنچا کہ جھنڈوں کے استقبال کی عجیب وغریب منگول رسم کو دیکھ سکے جس کا اس نے کچھ تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، لیکن یہ معلوم کرکے اس کو نفرت سی ہوگئی کہ اس کا ماموں اس دشمن کے خلاف کوئی حقیقی اقدام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ لکھتا ہے:

"خان کا یہ اقدام کچھ غیر نفع بخش تھا۔ کوئی قلعہ فتح کیے بغیر—— کسی دشمن کو شکست دیے بغیر وہ آگے بڑھا اور واپس چلا آیا۔"[1]

بابر کو اب اس تلخ ترین شے کا تجربہ کرنا پڑا جو بدقسمتی ایک حساس شہزادے پر نازل کرسکتی ہے—— یعنی رشتہ داروں کی خیرات پر بھروسا۔ وہ لکھتا ہے:

"تاشقند کے دوران قیام میں مجھے بہت نکبت و ذلت برداشت کرنا پڑی۔ نہ کوئی علاقہ تھا اور نہ اس کی امید۔ میرے بیشتر ہمراہی منتشر ہوگئے۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ اپنی محتاجی و بے نوائی کی وجہ سے میرے ساتھ نقل و حرکت کرنے سے معذور تھے۔ اگر میں اپنے ماموں کے دروازے پر جاتا تو کبھی میرے ساتھ ایک آدمی ہوتا کبھی دو۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ کوئی اجنبی نہ تھا بلکہ میرا رشتہ دار تھا۔"[2]

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ خان نے بظاہر اپنے بھانجے پر مہربان ہونے کی کوشش کی۔ بابر ہمیشہ اس کا ذکر نہایت محبت سے کرتا ہے اور اس کے لیے 'دادا' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ نوعمر شہزادے کی بیشتر پریشانیوں کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قوت و توانائی کا کوئی مصرف موجود نہ تھا۔ وہ بے عملی سے تنگ آچکا تھا اور اگرچہ اب اس نے شاعری شروع کردی تھی مگر وہ بھی باعث تسکین نہ تھی۔ اس بے مقصد زندگی سے تو کچھ بھی کرنا بہتر تھا۔ مہم جوئی کے فطری شوق میں اس نے چین جانے کا ارادہ کرلیا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جہاں جانے کی اس کو ہمیشہ سے خواہش رہی تھی کیوں کہ وہ بہت دور تھا اور سفر بڑا خطرناک —— مشکل

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۵۷ [2] ایضاً، ص ۱۵۷

تو رشتہ داروں سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا جو بابر کی ہر ایک خواہش سفر کو اس امر کی ایک علامت سے تعبیر کرتے تھے کہ اُن کی میزبانی میں کچھ کمی رہ گئی ہے اور اس لیے وہ دونی خاطر مدارات کرنے لگتے تھے۔ آخر اس نے اپنے ماموں احمد "خان اصغر" سے ملاقات کا عذر سوچا جو بیس برس سے شمالی مغلستان کے قلعوں میں الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا۔ (بابر کا) مقصد یہ تھا کہ اس کو شیبانی کے خلاف اپنے بھائی کے ساتھ شریک ہونے پر تیار کیا جائے۔ قسمت کی بات کہ ٹھیک اسی وقت احمد خاں نے خود ہی آنے کا ارادہ کرلیا اور بابر کا عذر بے کار گیا۔

بابر نے اپنے اس نئے عجیب ماموں کا، جسے عرصے سے کسی نے نہیں دیکھا تھا نہایت شاندار و کامیاب خاکہ کھینچا ہے۔ بابر لکھتا ہے:

> "وہ نرالے اطوار کا انسان تھا ــــ تلوار کا زبردست دھنی اور بہادر....
> وہ اپنی شمشیرِ آبدار سے کبھی جُدا نہ ہوتا تھا ــــ یا تو وہ اس کی کمر پر ہوتی یا ہاتھ میں۔ ایک الگ تھلگ مقام میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ کسی قدر اُجڈ اور بات چیت میں اکھڑ تھا۔"[1]

اس کے باوجود احمد آداب و مراسم کا سخت قائل تھا، اس لیے جب اتفاقاً ایک اسپ سواری کے دوران بابر اس سے بے تکلفانہ ملا تو اُسے یہ بات بہت گراں گزری۔ اپنی قدیم وضع کی لمبی منگولی پوشاک میں ملبوس اور اپنے سپاہیوں کے حلقے میں محصور جن کی وردیاں کشیدہ کاری سے آراستہ چینی اطلس کی تھیں اور گھوڑوں کی سبز زین کیمخت کی تھی۔ یہ شخص بابر کی نظروں کو بہت شاندار و باا ثر معلوم ہوا۔ مگر اس نے اپنے بھانجے کا شفقت سے استقبال کیا اور اسے خود اپنی ایک پوشاک عطا کی جس کو پہن کر اس کی شکل وصورت اتنی مکمل طور پر بدل گئی کہ جیسا خود بابر مسرور انداز میں بیان کرتا ہے۔ خواجہ ابوالمکارم بھی اس کو اس وقت نہ پہچان سکا جب وہ اپنے ماموں کے ساتھ گھوڑے پر جا رہا تھا اور دریافت کرنے لگا "یہ سلطان معظم کون ہے؟"[2]

دونوں بھائی، خاقانِ اعظم و خاقان آخاچی بڑے اہتمام سے ملے۔ بعدہٗ دونوں نے آپس میں مشورے کے بعد یہ عزم کرلیا کہ تنبل کو جو جہانگیر کے نام پر فی الواقعہ فرغانہ کا مالک

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۹۸ [2] ایضاً، ص ۱۶۰، ۱۶۱

بن گیا تھا نکال باہر کیا جائے اور بابر کو بحال کیا جائے۔ تیس ہزار کی ایک متحدہ فوج کے ساتھ بقول میر خواند[1] وہ ۲۱ جولائی ۱۵۰۲ء کو تاشقند سے اندجان کے لیے روانہ ہوئے۔ طے یہ ہوا کہ بابر ایک مضبوط فوجی دستے کے ساتھ اوش و اوزقند کے گرد گھوم کر تنبل کی پُشت پر پہنچ جائے اور اسی دوران (دونوں) خان خاص فوج کے ساتھ اس پر سامنے سے حملہ آور ہوں۔ اس نقل و حرکت سے شاندار نتیجے کی اُمید تھی۔ اوش نے خوشی خوشی ہتھیار ڈال دیے۔ دو ایک دن بعد مرغلان نے بھی اس کی مثال پر عمل کیا اور تمام دیہاتی علاقے نے بہت جوش و خروش سے بابر کو خوش آمدید کہا۔ دریا کے جنوب میں دارالسلطنت اندجان ہی مقابلے پر ڈٹا رہا۔ لیکن شمال کی طرف تنبل کی اب بھی حکومت تھی اور وہ اخسی کے نزدیک ایک مضبوط قیام گاہ سے (دونوں) خان کی نگرانی احتیاط سے کر رہا تھا۔ دو مرتبہ بابر نے اندجان کو لینے کی کوشش کی جو صرف تنبل کی قلعے بند فوج کی وجہ سے واپس بابر کی اطاعت میں آنے سے رُکا ہوا تھا ـــــ اور ہر مرتبہ سوئے اتّفاق سے ناکامی ہوئی۔ پہلے موقعے پر اندھیرے میں "لفظ شناخت" کی غلطی سے حملہ آور جماعت کے دو حصّے آپس ہی میں ٹکرا گئے۔ دوسرے موقعے پر اور زیادہ ہی تباہی ہوئی۔ حالات کچھ اس طرح تھے: ـــــ تنبل کے معاملات بگڑے ہوئے تھے۔ اندجان میں اس کی قلعے بند فوج منتشر ہو رہی تھی، دوست پست ہمت ہو چکے تھے اور سب لوگوں نے بابر کو یقین دلایا تھا کہ دارالخلافہ اُس کا ہے۔ لہٰذا نوجوان شہزادہ آگے بڑھا۔ رات ہوتے اُن مٹھی بھر سپاہیوں کو منتشر کر دیا جو اس کی راہ میں حائل ہوئے تھے اور دوسرے دن اطمینان سے شہر میں داخلے کے لیے تیار ہو کر رات میں شہر کے مضافات میں پڑاؤ ڈال دیا اپنی فتح کا اُسے اتنا یقین تھا کہ اس نے ہموار زمین پر پڑاؤ ڈالا اور بیرونی چوکی پر نگہبان بھی مقرر نہ کیے۔

اس درمیان جنوب میں بابر کی کامیابی سے ششدر و دہشت زدہ ہو کر تنبل نے یہ دیکھنے کا ارادہ کر لیا کہ وہاں خود اس کی موجودگی جنگ کا نقشہ پلٹ سکتی ہے یا نہیں۔ وہ اخسی کے نزدیک سے اپنا پڑاؤ اُٹھا کر تیزی سے اندجان روانہ ہو گیا۔ اگرچہ بابر کو اپنے حریف کی نقل و حرکت کی اطلاع مل چکی تھی پھر بھی ناتجربہ کارانہ جلد بازی میں اُس نے احتیاطی تدابیر

---

[1] روضۃ الصفا

نہ کیں۔ تنبل ٹھیک اس وقت پہنچا جب اُس کے آنے کی سب سے کم توقع تھی اور بابر کے غافل پڑاؤ پر اچانک ٹوٹ پڑا۔

بابر کی فوج منتشر ہوگئی۔ اندجان پر اس کے قبضے کا موقعہ جاتا رہا اور اس کے پاس سوائے ماموؤں کے پاس جانے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ دونوں خان تنبل کے تعاقب میں اخسی سے دُور نکل چکے تھے اور اب اندجان کے نزدیک تھے۔ وہ بابر سے بہت مہربانی سے پیش آئے۔ احمد خاں نے اس کی بہادری پر اُسے خاص طور سے مُبارکباد دی اور اس کے زخموں کے علاج کے لیے اپنا خاص جراح بھیجا۔ لیکن بابر یہ دیکھ کر بہت گھبرایا کہ جن مقامات نے ہتھیار ڈال دیے تھے وہ ان کے جائز مالک یعنی خود اس کو نہیں بلکہ "خانِ اصغر" کو عطا کیے جا رہے تھے۔ اخسی کا علاقہ جو بہت غریب تھا بابر کو ملا اور جنوبی زرخیز علاقہ احمد کے حصے میں آیا۔ خاقانِ اعظم نے بہت صفائی سے کہہ دیا کہ اس کا بھائی خود اپنی سرزمین سے دور ہے اور اس لیے اُسے ایک مستقر کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ وہ لوگ پوری تیاری کے بعد سمرقند سے شیبانی کو نکال کر بابر کو بحال کر دیں گے اور فرغانہ اپنے انعام کے طور پر خود لے لیں گے۔ بظاہر یہ منصوبہ غیر معقول نہ تھا مگر بابر کو اپنے ماموؤں پر اعتماد نہ تھا۔ بہرحال ایسا تو ہونا ہی تھا۔ بابر کے کچھ آدمیوں نے تو اسے کھلے بندوں مشورہ دیا کہ وہ تنبل سے صلح کر کے ملک بانٹ لے اور منگولوں کو نکال باہر کرے۔ لیکن بابر نے اپنی شرافت اور عالی ظرفی کے تحت اس خیال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ـــــ اس نے کہا:

> "کیا یہ صحیح ہوگا؟ دونوں خان میرے ساتھ خونی رشتہ رکھتے ہیں! ان کی خدمت تنبل کی عطا کردہ حکومت سے کہیں بہتر ہے۔"[1]

ان خیالات کے تحت بابر اخسی کو تسخیر کرنے کے لیے روانہ ہوگیا اور (دونوں) خان نے اندجان کا محاصرہ کرلیا ـــــ اس طرح فوجی کارروائیوں کا سابقہ نقشہ عجیب طریقے پر اُلٹ گیا۔

دونوں میں سے کسی بھی جماعت کو کوئی بہت نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ اندجان والوں کی اطاعت پر ان دونوں خانوں کا کوئی حق نہ تھا اور وہ لوگ ان کے سامنے

---

[1] اے۔ ایس۔ بیوریج، ص ۷۰

سر تسلیم خم کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ بابر کو اچانک حملے سے اخسی فتح کرنے میں ناکامی ہوئی، اور پپ نامی مقام بھی اس کے ہاتھ سے تقریباً نکل گیا جہاں اس کے آدمی سپہ سالار کی غفلت سے داخل ہوگئے تھے۔ لیکن تنبل کے معاملات اتنے غیر اُمید افزا تھے کہ اس نے اپنے حریفوں کے [illegible] ڈالنے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ بابر سے کوئی سمجھوتہ کر سکے تو خانوں کے پاس اپنے جنگی ارادوں پر قائم رہنے کی کوئی وجہ نہ رہے گی اور یا تو وہ واپس لوٹ جائیں گے یا اپنی اس نیت کا اعلان کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے بھانجے کو اس کے علاقوں سے محروم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تجویز کے مطابق تنبل کے بھائی بایزید نے جو اخسی میں سپہ سالار تھا بابر کو وہاں آنے کا زوردار دعوت نامہ بھیجا۔ لیکن بابر نے خانوں کو اشارہ دے دیا کہ دشمن کے اغلب ارادے کیا ہیں اور انھوں نے بابر پر زور دیا کہ وہ اخسی جائے اور پہلے موقعے پر ہی بایزید کو گرفتار کرے۔ بابر نے اپنے احساسِ شرافت اور عزتِ نفسی کے تحت ایسا کرنے سے انکار کر دیا لیکن اخسی میں داخل ہو کر اس کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کرنے پر رضامند ہوگیا۔ چنانچہ بابر نے بایزید کی تجاویز منظور کرلیں۔ وہ اخسی میں داخل ہوگیا اور اسے بیرونی حصار (قلعہ) میں پڑاؤ ڈالنے کی جگہ دی گئی۔

لیکن تنبل کے پاس ابھی ایک تُرپ کا پتہ باقی تھا۔ اس نے شیبانی سے مدد کی درخواست کی۔ سمرقند کے حکمراں اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ تنبل کی تباہی کے معنی یہ ہوں گے کہ فوراً بعد ہی خود اس پر بھی حملہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہ خود جارحیت پر تیار ہوگیا۔ اس نے تنبل کو جلد ہی اپنے پہنچنے کی اطلاع دے کر دشمن کے سامنے جمے رہنے کی ہمّت دلائی۔ خانوں نے جو ایسے خطرناک دشمن کے مقابلے کو تیار نہ تھے، ابتری کی کیفیت میں فوراً اپنا پڑاؤ اُٹھالیا اور شیبانی سے تصادم کے بغیر خود اپنے ملک میں پہنچنے کے لیے مرغیلان کے گرد گھومتے ہوئے کوچ کر دیا۔ تنبل قریب ہی اُن کے تعاقب میں لگا ہوا تھا اور دیہاتی علاقے کے لوگ جن کے ساتھ وحشی منگول سپاہیوں نے بہت بُرا سلوک کیا تھا، ان کے عقب میں ہر طرف بغاوت پر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس تباہی کا ذکر کریں جو اُن پر نازل ہوئی ہم اُن کے بھانجے کی زندگی کے نشیب و فراز کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک صبح جب کہ بابر گرم حمام میں تھا، وہاں وارد ہوا تو کون؟ ـــــ خود اس کا بھائی جہانگیر ـــــ جہانگیر جو تنبل اور اس کے حلیف خوفناک شیبانی سے جان بچاکر فرار ہوا تھا۔ اس نے بابر کو خانوں کی پسپائی کی اطلاع دی اور زور دیا کہ وہ اپنے میزبان بایزید کو گرفتار کرلے اور اخسی کی مدافعت کرے۔ بابر نے جو عزت و شرافت کا ایک پاکیزہ احساس رکھتا تھا، ان حالات میں بھی اپنے وعدے کو توڑنے سے انکار کردیا، حالانکہ اس طرح بایزید کو اتنا وقت مل گیا کہ قلعے میں بند ہوجائے اور اس پر اپنے بھائی کی خاطر قبضہ قایم رکھے۔ کچھ گھنٹے بعد تنبل دو تین ہزار چیدہ سپاہیوں کی مضبوط جمعیت کے ساتھ یہاں آپہنچا۔ نقصان تو ہو ہی چکا تھا لیکن بابر نے اپنے سو سوا سو (ایک سو بیس) آدمیوں کے ساتھ شہر کی مدافعت کا ارادہ کرلیا۔ ایک وقت تو ایسا معلوم ہوا کہ جنگ سے بچا جاسکے گا، کیوں کہ شیخ بایزید اپنے گھوڑے کو مہمیز کرتا ہوا صلح کی بات چیت کرنے آپہنچا اور بابر نے بھی مجلسِ مشاورت کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔ لیکن بالکل آخری وقت میں جہانگیر نے ایلچی کو دغابازی سے اغوا کرلیا جس پر بابر بہت برہم ہوا اور اس طرح وہ لڑائی شروع ہوگئی جس سے دونوں ہی حریف بچنے کی خواہش رکھتے تھے۔ بابر کی فوجیں آخر کس طرح شہر سے نکالی گئیں، اس کا حال خود بابر نے بہت وضاحت سے بیان کیا ہے:

"شہر کا ایک پہلو جہانگیر مرزا کی سپردگی میں دے دیا گیا تھا اور چونکہ اُس کے پاس چند ہی آدمی تھے اس لیے اُس کی مدد کو میں نے کچھ اپنے آدمی بھیج دیے۔ پہلے میں نے اس کی طرف جاکر سپاہیوں کو جنگ کے لیے اپنی اپنی جگہ پر متعین کیا۔ پھر شہر کے دیگر حصوں میں گیا۔ اخسی کے وسط میں ایک کھلی ہوئی قدرے ہموار جگہ ہے۔ میں یہاں جانبازوں کی ایک ٹکڑی کو تعینات کرکے آگے بڑھا ہی تھا کہ دشمن کی ایک بڑی پیدل اور سوار جماعت ان پر حملہ آور ہوئی اور انھیں ان کے مورچے سے دھکیل کر ایک تنگ گلی میں ٹھونس دیا۔ ٹھیک اسی وقت میں (گلی پر) آپہنچا اور اپنا گھوڑا دوڑا کر انھیں حالتِ فرار میں منتشر کردیا۔ جب میں اُنھیں اس طرح گلی سے میدان میں بھگا رہا تھا اور میری تلوار اپنا کام کررہی تھی، انھوں نے میرے گھوڑے کی ٹانگ میں تیر مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور مجھے اُن کے درمیان پھینک دیا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر ایک تیر چلایا۔ میرے

ہمرکاب خادمِ کابل، کے پاس ایک کمزور سا ٹٹو تھا، وہ خود اُتر گیا اور اُسے میرے پاس لے آیا۔ اس پر سوار ہو کر میں گلی کے دوسرے ناکے کی طرف روانہ ہوا۔ سلیمان محمد ویس نے میرے رہوار کی کمزوری کو محسوس کیا تو اپنے گھوڑے سے اُتر کر مجھے پیش کر دیا۔ میں اس گھوڑے پر سوار ہوا۔ اسی وقت قاسم بیگ کا بیٹا قنبر علی، زخمی حالت میں جہانگیر مرزا کے پاس سے آیا اور کہا کہ ابھی کچھ دیر پہلے مرزا پر حملہ ہوا تھا اور سراسیمگی میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوا وہ صاف نکل گیا تھا۔ ہم پر بجلی سی گر پڑی! اسی وقت پپ کا کماندار سید قاسم آ پہنچا! اس کا آنا بہت ہی ناوقت تھا کیوں کہ اس نازک مرحلے میں ایسا مضبوط قلعہ ہمارے قبضے میں بہت ہی اچھا تھا۔ میں نے ابراہیم بیگ سے کہا ' اب کیا کیا جائے؟' وہ کچھ زخمی تھا، یا تو اسی وجہ سے یا بدحواسی کے باعث وہ کوئی موزوں جواب نہ دے سکا۔ میرا خیال یہ تھا کہ پُل پار کر کے اُسے تباہ کر دیا جائے اور اندجان چلا جائے۔ اس موقع پر بابا شیرزاد نے اچھا جواب دیا' ہم اچانک دروازے پر حملہ کر کے ایک دم سے نکل جائیں گے'۔ اس کے مشورے پر ہم دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس نازک وقت میں خواجہ میر میران نے بھی بہادری کی بات کی۔ ایک گلی میں جب کہ میں ابراہیم بیگ اور مرزا قلی کلکدش کے ساتھ آگے آگے جا رہا تھا، سید قاسم اور ناصر دوست نے ایک ہی وار میں باقی خز (Baqi Khiz) کا سر اُڑا دیا۔ جیسے ہی ہم دروازے کے سامنے پہنچے۔ ہم نے شیخ بایزید کو دیکھا جو اپنی صدری پر پوری آستین کی قمیص پہنے تین چار سواروں کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ جب اُسے میری مرضی کے خلاف گرفتار کیا گیا تھا تو اُسے قیدی بنا کر جہانگیر مرزا کے آدمیوں کے پاس رکھا گیا ہوگا اور جب وہ بھاگے تو اُسے بھی ساتھ لے گئے ہوں گے۔ انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کو ہلاک کرنا ہی اچھا رہے گا لیکن پھر انھوں نے اُسے زندہ ہی آزاد کر دیا۔ جب وہ مجھے دروازے پر اتفاقیہ ملا اُسی وقت اس کو رہا کیا گیا تھا۔ میں نے انگوٹھے پر رکھ کر ایک تیر چھوڑا۔ وہ اُس کی گردن سے رگڑتا ہوا نکل گیا۔ نشانہ خوب تھا! وہ گھبراہٹ میں دروازے کے اندر داخل ہو گیا اور داہنی طرف مُڑ کر ایک گلی میں بھاگ گیا۔

ہم نے فوراً اس کا پیچھا کیا۔ مرزا قلی کلکدش نے اپنے خاردار گرُز سے ایک آدمی کی خبر لی اور آگے بڑھ گیا۔ ایک اور شخص نے ابراہیم بیگ پر نشانہ باندھا لیکن جب بیگ ' ہائے ہائے ' چلّایا تو اُسے گزر جانے دیا اور اتنے نزدیک سے جتنا کہ ایک پھاٹک سے اس کا پہریدار کھڑا ہوتا ہے، اس نے میری بغل میں نشانہ مارا۔ میری زرۂ قلماق کی دو کڑیاں کٹ گئیں۔ وہ بھاگا اور میں نے اُس پر نشانہ لگایا۔ اس کے بعد میں نے دمدموں پر ایک شخص کو فرار ہوتے دیکھا اور فصیل کے مقابل اس کی کلاہ پر نشانہ باندھا۔ تیر سے چھد کر اس کی کلاہ فصیل پر ٹنگی رہ گئی اور وہ ہاتھوں میں اپنی پگڑی کے پیچ و خم سنبھالتا ہوا بھاگ گیا۔ پھر ایک اور آدمی میرے پاس سے گلی میں بھاگتا ہوا گزرا جس سے کہ شیخ بایزید گیا تھا۔ میں نے اپنی تلوار سے اس کے سر کے پیچھے کچوکا لگایا۔ وہ گھوڑے پر سے جُھک گیا کہ گلی کی دیوار سے جا لگا لیکن وہ گھوڑے کی پیٹھ پر جما رہا اور آخر بہ مشکل نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہم نے دشمن کے سب آدمیوں کو دروازے پر سے بھگا دیا تو خود اس پر قبضہ کرلیا ـــــ لیکن یہ معاملہ خارج از بحث تھا، کیوں کہ قلعے کے اندر وہ لوگ تقریباً دو تین ہزار تھے اور ہم بیرونی قلعے میں صرف سو دو سو ہی تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اتنی دیر پہلے جتنی دیر میں دودھ اُبلتا ہے، جہانگیر مرزا کا پیچھا کیا تھا اور اُس کے ساتھ میرے بھی نصف آدمی چلے گئے تھے۔ اس کے باوجود، جب ہم پھاٹک میں تھے تو ہم نے اس کے پاس یہ کہنے کے لیے ایک آدمی بھیجا ' اگر قریب ہو تو آجاؤ۔ آؤ ہم پھر سے حملہ کریں '۔ لیکن معاملہ اس حد سے آگے بڑھ چکا تھا! ابراہیم بیگ نے یا تو اپنے گھوڑے کی واقعی کمزوری یا خود اپنے زخم کی وجہ سے کہا ' میرا گھوڑا تھک گیا ہے '۔ اس موقع پر محمد علی مبشّر کے ایک ملازم سلیمان نے بڑی جرأت کا کام کیا، کیوں کہ جب ہم پھاٹک میں منتظر تھے تو صورتِ حال کی نزاکت کے باوجود اور کسی مجبوری کے بغیر ہی وہ اپنے گھوڑے سے اُتر پڑا اور اُسے ابراہیم بیگ کے حوالے کردیا۔ جب ہم پھاٹک میں تھے تو کچک علی نے بھی جو اب حاکم کوئیل تھا بڑی ہمت دکھائی۔ وہ سلیمان محمد وَیس کا ایک رسالدار تھا اور اس نے

دو مرتبہ یہاں اور اوش میں نمایاں کام کیے۔ ہم اس وقت تک پھاٹک میں ٹھہرے رہے جب تک کہ جہانگیر مرزا کے پاس بھیجے ہوئے آدمیوں نے لوٹ کر اطلاع نہ دے دی کہ وہ بہت پہلے جاچکا ہے۔ اب اس قدر دیر ہو گئی تھی کہ وہاں ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ہم عجلت سے سوار ہوئے۔ ہم نے اتنی دیر ٹھہر کر بھی غلطی ہی کی تھی۔ میرے ساتھ صرف بیس یا تیس آدمی تھے، جیسے ہی ہم بہ عجلت پھاٹک سے نکلے۔ بہت سے مسلح آدمی ٹھیک ہمارے سر پر آ پہنچے، جیسے ہی ہم نے پُل پار کیا وہ اس کے شہر والے سرے پر پہنچ گئے تھے۔ قاسم بیگ کے بیٹے حمزہ کے نانا نے ابراہیم بیگ سے پُکار کر کہا 'تم ہمیشہ اپنی جوشِ ہمت کی ڈینگ مارتے ہو! آؤ تلوار کے دو دو ہاتھ ہو جائیں!' ابراہیم بیگ نے میرے پہلو سے کہا 'کیا مضائقہ ہے؟ —— چلے آؤ!' —— ان ناسمجھ لوگوں کو ایسی تباہی کے وقت اپنی بہادری دکھانے کی سوجھ رہی تھی! —— بے موقعہ بہادری۔ یہ مقابلہ یا توقف کرنے کا کوئی وقت ہی نہ تھا! ہم تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ دشمن پیچھا کر رہا تھا اور ہمارے آدمی گھوڑوں سے گر رہے تھے۔"[1]

تنبل کے آدمی سخت تعاقب میں لگے تھے اور بابر گھوڑے پر سرپٹ جارہا تھا۔ ایک ایک کرکے اس کے بہت سے ساتھیوں کو جن کے گھوڑے زیادہ بے حال تھے، دشمنوں نے آلیا اور گھوڑوں سے گرادیا گیا۔ اور آخرکار وہ تنہا رہ گیا جب کہ اس کا تعاقب کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر دو رہ گئی۔ اس کو انتہائی اقدام پر مجبور کرتے ہوئے وہ ڈرتے تھے، اس لیے انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اُسے اُس کے ماموں خان صاحبان کے پاس لے جائیں گے، لیکن غداری کرکے اُنھوں نے اخسی کے حکام کو نوعمر شہزادے کے پتہ سے مطلع کردیا۔ اس دوران اُنھوں نے بابر کو پوشیدہ رکھا۔ ظاہر یہ کیا کہ تعاقب کی وجہ سے ایسا کیا جارہا ہے لیکن دراصل اس کو اس کے دوستوں کی جماعتوں سے پوشیدہ کیا جارہا تھا جو بابر کی تلاش میں تھیں۔ آخر بایزید کا کمیدان (کمانڈنٹ) یوسف اس کو گرفتار کرنے کے لیے ایک جماعت کے ساتھ آپہنچا۔

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۶۳ – ۱۶۹

بابر جو موت کے لیے پہلے سے تیار تھا، باغ کے ایک گوشے میں دو زانو ہو گیا جہاں وہ پوشیدہ تھا اور اس زندگی سے رخصت ہونے کے لیے مناسب مذہبی رسوم ادا کیں۔

کیسی ترسانے والی بات ہے کہ ٹھیک اس لمحے سے اگلے سولہ مہینے تک کے واقعات 'تزکِ بابری' سے غائب ہیں۔ کسی شخص نے ـــــ غالباً بابر کے پڑپوتے شہنشاہ جہانگیر نے برہمی کے تحت اس داستانِ شجاعت کا ایک طویل و بسیط انجام لکھ دیا جو کہ متن کا حصہ بن گیا ہے اور پاوے ڈی کورٹیل اور لین پول نے اسے مکمل نقل بھی کر دیا ہے۔ اس کے مطابق بابر کے دوستوں نے موقعے پر پہنچ کر اُسے قتل سے بچا لیا۔ اس کے قید کرنے والوں کو گرفتار کر لیا اور اُسے صحیح سلامت خان کے پاس اندجان پہنچا دیا۔ بدقسمتی سے اس عبارت اور بقیہ تزک کے اسلوبِ نگارش میں شدید تناقص ہی نہیں بلکہ اس میں زبردست تاریخی اور واقعاتی غلطیاں بھی ہیں ـــــ خان اس وقت اندجان میں تھے ہی نہیں۔ بابر کے نجات دہندوں کے نام اور کسی بھی جگہ بیان نہیں کیے گئے۔ اور بابر کی بعد کی نقل و حرکت سے متعلق تفصیلات غلطیوں سے لبریز ہیں۔[1]

اس کو واقعی بچا تو لیا گیا تھا لیکن تفصیلات کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ اُس کے آیندہ سولہ مہینے کے حالات کے لیے ہمیں معلومات کے دوسرے ماخذوں کا سہارا لینا پڑتا ہے، جس میں 'شیبانی نامہ' خاص ہے۔[2] وہ اپنے (دونوں) ماموؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور ہزار آدمیوں کی کمان اُسے ملی۔ اب فرغانہ مکمل طور پر شیبانی کے ہاتھ میں تھا مگر خان صاحبان خاموشی سے اس ضرب کو برداشت کرنے والے نہیں تھے جو اُن کے غرور پر لگائی گئی تھی۔ ساری سردیوں اپنے وسائل جمع کرنے کے بعد ان کا ارادہ ایک متحدہ

---

[1] اس حصّے کو جو کہ 'المنسکی' اور حیدرآباد' دونوں مخطوطوں میں پایا جاتا ہے مگر پارسی ترجمے میں شامل نہیں، جعلی ثابت کرنے کا سہرا مسز بیورج کے سر ہے۔ ملاحظہ ہو ان کے 'بابرنامہ' ورق اوّل کا ضمیمہ ج جس میں یہ سوال تفصیلی طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

[2] مزید معلومات 'تاریخ رشیدی'، 'حبیب السیر' و 'عالم آرائے عباسی' سے حاصل ہوئی ہیں اور اُنھیں کی بنیاد پر 'فرشتہ' (دوم، ص ۲۲) و خفی خان ('منتخب اللباب' ببلیو تھیکا انڈیکا ایڈیشن جلد اول وغیرہ) نے مربوط تذکرے دیے ہیں۔

مہم شروع کرنے کا تھا۔ شیبانی یہ اندازہ کرکے کہ یہ کش مکش بڑی مہلک قسم کی ہوگی، مقابلے کے لیے اپنے معاملات کی تنظیم کرنے سمرقند واپس چلا گیا۔ بابر کے بھائی جہانگیر نے اس کی اس واپسی سے فائدہ اُٹھا کر خجند پر قبضہ کرلیا۔

۱۵۰۳ء کی مُہم کا سب سے پہلا واقعہ شیبانی کا خجند پر محاصرہ ڈالنا اور زبردست کش مکش کے بعد اُس پر قبضہ کرلینا تھا۔ اسی دوران خان صاحبان اور بابر بڑھ کر فرغانہ میں داخل ہوچکے تھے اور اب اخسی کے نواح میں تھے۔ اُن کا منصوبہ سیدھے اندجان جانے کا تھا جو ایک دفعہ پھر تنبل کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ ان کی بیشتر فوجیں شیبانی پر نظر رکھنے کے لیے تاشقند میں چھوڑ دی گئی تھیں اور وہ خود ہلکی سی فوج کے ساتھ سُرعت سے آگے بڑھ گئے۔ مزید احتیاط کے طور پر اوراتیپہ کو محمد حسین گورگان کی حفاظت میں دے دیا گیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ ممکنہ دیر تک شیبانی کو روکے رکھے ـــــ لیکن اپنی بدقسمتی سے وہ اخسی کے قریب کچھ دن ٹھہرے رہے جہاں بایزید بلاشبہ شیبانی کے اشارے پر ہتھیار ڈالنے کی بات چیت کر کے اُن کو روکے ہوئے تھا۔ دوسری طرف شیبانی کمالِ ہوشیاری کے ساتھ اُن فوجوں کے درمیان سے گزر کر جو کہ اس پر نگاہ رکھنے کو معین تھیں، ایک بے پناہ قوّت سے، بجلی کی طرح دونوں خان صاحبان پر ٹوٹ پڑا۔[1] اس کی نقل و حرکت اتنی تیز تھی کہ وہ اُن ہرکاروں کے ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچ گیا جو اُس کے حریفوں کو خطرے سے آگاہی دینے کے لیے رواں دواں آئے تھے۔ فیصلہ کن جنگ 'آرچیاں' کے مقام پر ہوئی۔[2] خان صاحبان کو شکست فاش ہوئی، ان کی فوج منتشر ہوگئی۔ وہ خود گرفتار کرلیے گئے اور شیبانی کے سامنے لائے گئے۔ اس نے کم از کم فی الوقت اُن کی جاں بخشی کردی اور ایک شانِ لطف و کرم کے ساتھ اُن کو چھوڑ دیا۔ روایت ہے کہ اس نے کہا:

> "تمھاری امداد و اعانت سے میں نے اپنا اقتدار جیتا ہے۔ میں نے تمھیں گرفتار کیا مگر قتل نہیں کرتا۔ میں تمھیں آزاد کرتا ہوں۔"

بدقسمت بھائیوں پر بعد میں کیا بیتی، اس کا بھی مختصر بیان ضروری ہے ـــــ چھوٹا بھائی احمد

---

[1] کہا جاتا ہے خان کے پندرہ ہزار آدمیوں کے مقابلے میں اس کے پاس تیس ہزار تھے۔

[2] 'تاریخ رشیدی'۔ جنگ (سرطان) ۹۰۸ھ میں لڑی گئی۔ (جون ۱۵۰۳ء)

منگولستان چلا گیا اور کچھ عرصے بعد انتہائے خجالت میں جان دے دی۔ اس کی داستان میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ غم میں گھلتا جا رہا تھا تو اُس کے ملازم سمجھے کہ شیبانی نے اُسے زہر دے دیا ہے اور اُسے تریاق استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ خان نے آہ بھر کر کہا :

" واقعی شیبانی نے مجھے زہر دے دیا ہے —— ذلّت کی ایک پست گہرائی سے اُس نے خود کو ایسی بلندی پر پہنچا دیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو قید کرنے اور پھر آزاد کرنے کے قابل ہوگیا۔ اسی تذلیل میں میری بیماری کا راز ہے۔ اگر اس طرح کے زہر کا تمھارے پاس کوئی تریاق ہے تو وہ یقیناً کارگر ہوگا۔"[1]

بڑا بھائی بھی اسی سنسان ویرانے میں واپس چلا گیا اور شیبانی نے بطور حقارت اس کو وہاں بے ضرر رہنے دیا۔ لیکن غداروں نے اس کو ترغیب دے کر اس کی پناہ گاہ سے فرغانہ بُلا لیا اور وہ معہ پانچ بیٹوں کے بڑے کمینہ پن کے ساتھ شیبانی کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اس تباہ کن جنگ سے پانچ سال بعد ہوا۔

اس عرصے میں بابر پر کیا بیتی ؟ چونکہ 'تزکِ بابری' سے ہمیں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی اس لیے مجبوراً معلومات کے دوسرے ماخذوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آرچیاں کی شکستِ فاش میں وہ شیبانی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور بہت تھوڑے سے ہمراہیوں کے ساتھ اوزقند جانے والا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنی راہ مسدود پائی۔ شیبانی نے اُس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا اور اس راستے پر جانا انتہائی خطرناک ہوتا۔ اس لیے وہ اُلٹے پیروں واپس ہوا اور بہت پُرپیچ راستوں سے آخر کار سوخ اور ہوشیار کے پہاڑی علاقے میں جا پہنچا۔ تقریباً ایک سال تک وہ نہایت اذیت و مصیبت کی حالت میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور اس دوران اُس کی سلامتی کا دار و مدار اس علاقے کے نیم وحشی قبیلوں کی دوستی پر تھا۔[2]

یہاں سے تزک کا سلسلہ پھر سے جاری ہو جاتا ہے اور بابر ہمیں اپنی زندگی کے اس دور کا مشاہدہ کراتا ہے جب کہ وہ خانماں برباد ہو کر اِدھر اُدھر گھومتا ہے اور

---

[1] 'تاریخ رشیدی'

[2] 'حبیب السیر' دوم، ص ۳۱۸

دشمنوں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے صرف تین سو ہمراہی تھے نیم برہنہ۔ صرف لاٹھیوں سے مسلح ـــــ پاؤں میں خام چمڑے کے سخت جوتے اور جسم چیتھڑوں میں ملبوس ـــــ پوری جماعت کے پاس صرف دو خیمے تھے۔ بابر نے اپنا (خیمہ) اپنی والدہ کو دے دیا جو کسی طرح شیبانی سے بچ کر اپنے بیٹوں سے آملی تھی[1] ان تمام اذیت کے باوجود جس میں نہ جانے کتنے آدمی دل چھوڑ بیٹھتے بابر کی شگفتگی باقی رہی۔ بدبختی کے دو مسلسل تجربے بھی اس کو مغلوب نہ کرسکے۔ ان میں سے پہلا تجربہ اپنے بھائی جہانگیر کی بے وفائی تھی جو اس کو چھوڑ کر خراساں بھاگ گیا تھا ـــــ اور دوسرا تھا سلطان حسین مرزا بیقرہ کی بُزدلی جس نے بجائے اس کے کہ شیبانی کے خلاف زندہ بچے ہوئے تیموریوں کی قیادت کرتا جیسا کہ بابر کو اُمّید تھی ایک لمبا چوڑا پیغام اس مضمون کا بھیج دیا تھا کہ وہ مدافعانہ جنگ پر ہی قایم رہے گا۔

بابر مایوس ہوکر بیٹھ رہتا تو بیجا نہ تھا لیکن اس کے مصائب نے اُس کے اس ارادے کو مضبوط ہی کیا کہ وہ قسمت کے خلاف جنگ کرتا ہی رہے گا۔ اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ کس طرح اُس کی ہمّت اور مستقل مزاجی نے ایک بار پھر وہ انعام حاصل کیا جس کی وہ مستحق تھیں اور کس طرح محض حسنِ اتفاق سے اُس کے قدم اُس راہ پر مضبوطی سے جم گئے جو اس کو سیدھی 'سلطنتِ ہندوستان' تک پہنچانے والی تھی۔

---

[1] جیسا کہ مسز بیورج کا خیال ہے، شاید اس کی بیٹی اور شیبانی کی بیوی خانزادہ نے مدد کی ہوگی۔

باب چہارم

کابُل

اسناد : 'بابر نامہ'، 'حبیب السیر'، 'تاریخ رشیدی'۔ 'احسن التواریخ'، 'فرشتہ'،
'شیبانی نامہ'۔

جدید تصانیف : 'ارسکن'، 'لین پول'۔

سلطان حسین مرزا بیقرہ کے بے حس اور غیر ہمدردانہ رویّے کا بابر کی آئندہ زندگی پر بڑا اثر پڑا۔ اس نے بابر کو فیصلہ کن عمل پر اُکسایا اور اس کی مسلسل دشت نوردی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا، کیوں کہ اُسے نہ صرف یہ احساس ہوگیا کہ کلّی طور پر خود اپنی قوّتِ بازو پر بھروسا کرنا چاہیے بلکہ اس کی دور بیں نظروں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ شیبانی جلد ہی خاندانِ تیموریہ کی باہمی شکر رنجیوں سے فائدہ اٹھاکر اس کے ایک ایک فرد کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تنبل سے اندجان لینے کے بعد یہ ازبک سردار پہلے ہی حصار و قُندُز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور انتہائی معمولی دانش مندی کا بھی تقاضا یہی تھا کہ بابر خود کو دشمن کے قُرب سے جتنی دور ہو سکے ہٹا لے۔

بظاہر ایک ہی سلطنت ایسی نظر آتی تھی جو ایک مُلکِ بے مُلک کو کوئی موقع فراہم کر سکتی تھی اور اسی کی طرف بابر اب متوجہ ہوا۔ کہا جاتا ہے[1] کہ اپنی جہاں گردیوں

---

[1] مکمل کہانی کے لیے ملاحظہ ہو: 'فرشتہ' دوم، ص ۲۰۳

کے دوران وہ ترمذ میں ایک شخص امیر محمد بکر سے ملا تھا جس نے ازبکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بے چین ہوکر آدمیوں اور روپیے پیسے سے اس کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔

بابر" شاہِ شطرنج کی طرح بساط پر خانہ بخانہ گھومنے سے " تنگ آچکا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے میزبان سے بہت صفائی سے پوچھا کہ اس کے خیال میں ازبکوں کے خلاف جنگی کارروائیاں عمل میں لانے کے لیے سب سے زیادہ اُمید افزا مرکزی مقام کون سا ہوسکتا ہے۔ امیر محمد بکر نے اُتنی ہی صفائی سے جواب دیا کہ فرغانہ کے متعلق سوچنا بالکل بے کار ہے، کیوں کہ اور ریاستوں کی طرح یہ بھی اب شیبانی کے مکمل قبضے میں ہے اور تجویز پیش کی کہ نوعمر شہزادہ بابر اب کابل میں قسمت آزمائی کرے۔

جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں، کابل بابر کے چچا الغ بیگ مرزا کی ملکیت میں تھا جہاں پہلے اُس نے شہزادے کی حیثیت سے اور بعدہٗ اپنے باپ ابوسعید مرزا کے انتقال کے بعد خودمختار بادشاہ کی طرح حکومت کی۔ ۱۵۰۱ء میں الغ بیگ کی وفات ہوگئی تھی اور اس نے ایک طفلِ شیرخوار عبدالرزّاق جانشین چھوڑا تھا۔ نتیجتاً ملک میں ایک بار پھر طوائف الملوکی پھیل گئی ـــــــ جو شخص بھی فوجیں جمع کرسکتا تھا اُس نے آزادی کا اعلان کردیا۔ اقتدار پر سب سے پہلے ایک شخص ذاکر بیگ قابض ہوا، جس نے ایسی من مانی سے حکومت کی کہ جلد ہی قتل کردیا گیا۔ اس کی وجہ سے اندرونِ ملک نئے سرے سے بدنظمی پھیل گئی جس نے بیرونی دشمنوں کو حملے کی دعوت دے دی۔ گرم شیر کے قریبی ضلع پر ذُوالنون بیگ ارغُن کی حکومت تھی جو سلطان احمد مرزا کا قدیم رسالہ دار تھا اور بابر کے خلاف کس طرح اُس نے اوراتیپہ کی مدافعت کی تھی، یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں ـــــ کابل کے حالات سے فائدہ اٹھاکر ذُوالنون کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد مقیم نے ہزارہ کے سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ مُلک پر حملہ کردیا اور حقیقی وارث عبدالرزاق کو افغانوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ جب بابر نے سب سے پہلے کابل پر نظر ڈالنی شروع کی تو محمد مقیم نہ صرف پُرامن طریقے پر دارالخلافہ پر قبضہ کرچکا تھا بلکہ اُس نے سابق حکمران کی ایک بیٹی سے بھی شادی کرلی تھی۔ یہ عہدہ سنبھالے ہوئے اُسے دوسال ہوچکے تھے اور وہ خود کو مقابلتاً محفوظ محسوس کررہا تھا[1]۔

---

[1] 'فرشتہ' دوم، ص ۲۴

بابر کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ کابل کو جس کی طاقت میں پہلے ہی سنگین کمی پیدا ہوگئی تھی، اپنے خاندان کی گرفت سے نکل جانے دے۔ اگرچہ اس وقت اُس کے وسائل بہت تھوڑے تھے لیکن کرایہ کے منگول سپاہی جو خسروشاہ کی ملازمت میں تھے، بہت مرتبہ اس کی خدمت میں آنے کی خواہش ظاہر کر چکے تھے۔ یہ لوگ جن کو ہمیشہ اپنی ہی حفاظت کا بہت خیال رہتا تھا، اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اُن کا نو دولتا آقا اگرچہ قابل ہے لیکن شیبانی کے سامنے وہ محض ایک پرکاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور شیبانی بہت جلد اس کو کسی کوشش کے بغیر ہی اپنی راہ سے ہٹا دے گا۔ دوسری طرف بابر نہ صرف ایک خاندانی شہزادہ اور مشہور نبرد آزما تھا بلکہ اُس کے متعلق یہ بھی معلوم تھا کہ وہ عمل کے لیے ایک ایسا میدان ڈھونڈھ رہا تھا جو کہ اُسے فی الحال ازبکوں کی رسائی سے باہر رکھے۔ جب قندز کی طرف شیبانی کی پیش قدمی کی خبر ملی اور اس کے باعث خسروشاہ اپنے علاقے چھوڑ کر کابل کی سمت چل دیا تو خسرو کا ساتھ چھوڑ دینے کے متعلق ان منگولوں کا ارادہ اور بھی قوی ہوگیا۔

بابر اگرچہ منگولوں کو سخت ناپسند کرتا تھا مگر ان کی اِس غدّاری کا فائدہ اٹھانے کی فطری خواہش سے ارفع نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ خسروشاہ سے نفرت کرتا تھا، نہ صرف اس لیے کہ وہ بابر کے ایک چچازاد کا بائسنغر کا قاتل تھا اور دوسرے چچازاد بھائی سلطان علی کو اندھا کر چکا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک ابن الوقت قسم کا شخص تھا جس کو نہ تو اعلا حسب و نسب نصیب تھا اور نہ عُمدہ تعلیم و تربیت۔ اور جس نے ایک مرتبہ جب بابر چند ساتھیوں کے ساتھ قندز کے علاقے سے اتفاقیہ گزر رہا تھا تو نہایت بداخلاقی کا ثبوت دیا تھا۔ لہٰذا جب خسرو کے ساتھیوں نے بابر کا ساتھ دینے کی خواہش کی تو اسے قبول کرنے میں اس کو کوئی اخلاقی پس و پیش نہ ہوا اور اس طرح ان لوگوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے قدیم آقا کا ساتھ چھوڑ کر ایسی حالت کر دی کہ اس کے پاس ایک بھی شخص ایسا نہ رہا جس پر وہ اعتماد کر سکتا۔ چار و ناچار وہ بابر کی خدمت میں اس شرط پر داخل ہونے کو تیار ہوگیا کہ اُس کی جان بخشی کی جائے اور ذاتی املاک کا احترام کیا جائے[1]

---

[1] 'شیبانی نامہ' سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے خسرو کے جواہرات چھین لیے تھے لیکن یہ الزام قابلِ اعتنا نہیں۔

بابر ذاتی عزت و شرافت کے تحت اپنے عہد پر مضبوطی سے قایم رہا اور جب نوعمر ویس مرزا نے اپنے بدقسمت بھائیوں پر ڈھائے گئے مظالم کے سلسلے میں قصاص خون کا باضابطہ مطالبہ کیا تو بابر نے خسرو کو اُس کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ اور خسرو کو ایک حفاظتی دستے کے سپرد کر کے رخصت کر دیا گیا اور سونا، چاندی اور جواہرات سے لدے ہوئے اونٹوں کی تین چار قطاریں ساتھ کر دی گئیں۔ اس کا خیمہ اور ساز و سامان بابر کے پاس رہے لیکن اس میں زرہ بکتروں اور گھوڑوں کے ساز کے علاوہ کوئی مفید و قیمتی شے برآمد نہ ہوئی اور ان چیزوں کو بے سرو سامان سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

بابر جلد سے جلد دوشی کے علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا جہاں وہ اس وقت موجود تھا، کیوں کہ ازبکوں کے ہراول دستے پہلے ہی اس کے آدمیوں کے متصل آ چکے تھے۔ چنانچہ وہ غوربند کے درمیان سے گزرتا ہوا کابل کی سمت میں بڑھ گیا ——— ارغون فرقے پر اس نے مکمل طور پر غیر متوقع اور اچانک حملہ کر کے کامیابی حاصل کی[1] مقیم کا خاص سردار شیرک بابر کی راہ میں حائل تھا، اس لیے نہیں کہ اُسے بابر کی پیش قدمی کی خبر مل گئی تھی بلکہ اس لیے کہ عبدالرزاق کو کابل کے علاقے میں دوبارہ داخل ہونے سے باز رکھا جا سکے۔ بابر نے اُسے آسانی سے ہرا دیا اور شیرک اپنے فاتح کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ بعدہٗ کابل پر چڑھائی کی گئی اور مقیم نے محض ایک نمائشی مدافعت کے بعد اُسے بابر کے سپرد کر دیا۔ غاصب کو اپنے ساز و سامان اور سپاہیوں کے ساتھ باہر نکلنے اور امن و سکون سے اپنے باپ اور بھائیوں کے پاس قندھار جانے دیا گیا۔ حسبِ معمول منگول دستوں نے (قندھار پر) قبضے کے درمیان مصیبت پیدا کر دی۔ اس سے قبل بابر نے ضروری سمجھ کر ان کے ایک جوان کو تیل کا ایک مرتبان زبردستی چُرانے پر پیٹتے پیٹتے مار ڈالا تھا اور اب انھوں نے مقیم کو پسپائی کے وقت لوٹ لیا۔ جہانگیر مرزا و ناصر مرزا جن کو محافظ کے طور پر ان واپس ہوئے سرداروں کے ساتھ جانے کے لیے انتخاب کیا گیا تھا، اس ہنگامے کو دبانے میں ناکام رہے۔ مجبوراً بابر کو خود گھوڑے پر سوار ہونا پڑا اور اس نے سب سے زیادہ

---

[1] 'احسن التواریخ' (ورق ۱۰۶ ب) میں بابر کے کابل پر قبضے کا جامع حال دیا گیا ہے۔

سرکش نصف درجن سپاہیوں کو گولی سے اُڑا دیا یا ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا۔ بہرحال کابل پر تسلط کے سلسلے میں اس کو صرف ایک یہی زحمت ہوئی :

" ربیع الثانی کے آخری عشرہ (اکتوبر ۱۵۰۴ء) میں بغیر کسی جنگ، بغیر کسی جدوجہد کے اور صرف خُدا کے فضل و کرم سے میں نے کابل، غزنی اور اس کے ماتحت علاقوں کو حاصل کرلیا اور محکوم بنالیا۔"[1]

بابر کو کابل کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا۔ اس علاقے کا مالک بننے کے بعد وہ یا تو مغرب میں سمرقند یا مشرق میں ہندوستان کی طرف نگاہ ڈال سکتا تھا۔ وہ لکھتا ہے : " کابل، ہندوستان اور خراسان کا نقطۂ وسطی ہے " —— اس پر قبضے کے بعد اُس کے پاس پھر ایک ایسا مستقر آگیا جہاں سے وہ اپنے ازبک دشمنوں کے خلاف کارروائی شروع کرسکتا تھا۔ ان کے خلاف کامیابی حاصل کرنا ہی وہ واحد مسئلہ تھا جس میں وہ کچھ مدت تک اُلجھا رہا کیوں کہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے جب تک مغرب میں اس کے تمام منصوبے انجام کار خاک میں نہ مل گئے، اس وقت تک یعنی تقریباً بارہ یا اس سے بھی زیادہ سال تک، اس نے آئندہ اپنی تمام تر توجہ امور ہندوستان کی طرف منعطف کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ لیکن ازبکوں کے خلاف قدم اٹھانے کے لیے بابر خود کو اس وقت تک کافی طاقت ور نہیں سمجھتا تھا جب تک اپنے گھر کو دُرست نہ کرلے۔ تقریباً اگلے ایک سال تک وہ اپنی نئی سلطنت کے معاملات میں پوری طرح مشغول رہا۔

پہلا قدم تو مالِ غنیمت کو تقسیم کرنا تھا۔ جہانگیر مرزا کو غزنی اور اس کے ماتحت علاقے دیے گئے اور ناصر مرزا کو ضلع ننگ نہار کے ساتھ کچھ اور غیر اہم مقامات بھی ملے۔ چند امیروں کو بطور جاگیر گاؤں دیے گئے لیکن بابر نے نہایت احتیاط پر عمل کرتے ہوئے دارالخلافہ اور اس کے تابع تمام ضلع جو کابل تومان کہلاتا تھا خود اپنے ہاتھ میں رکھا۔

شاید اس حکمتِ عملی کے باعث یا شاید ملک کے محدود وسائل کی وجہ سے،

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج

مالِ غنیمت ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھا جو بابر کے جھنڈے تلے اُمنڈ آئے تھے۔ اس لیے اس نے محاصل کے ذریعے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی نئی مملکت کے وسائل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس نے ناقابلِ برداشت حد تک بھاری ٹیکس لگائے۔ نتیجتاً بغاوتیں ہونے لگیں۔ قبیلہ ہزارہ کے لوگوں نے خاص طور سے نافرمانی کی۔ بابر نے انھیں دوسروں کے لیے باعثِ عبرت بنانے کا ارادہ کیا لیکن اس کی مُہم زیادہ کامیاب نہ رہی۔ اب کہیں نہ کہیں سے سامان فراہم کرنا ضروری تھا؛ اس لیے اس نے ہندوستان کی سمت دھاوے کا ارادہ کیا۔ وہ پشاور اٹک کی سیدھی سڑک پر بڑھا۔ درۂ خیبر کو پار کیا اور بعدہٗ دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بجائے سیدھے کوہاٹ پر دھاوا کیا۔ یہاں اُسے مویشی اور غلّہ کثرت سے ملے جن پر قبضہ کرلیا گیا۔ اس کے بعد مستقل طور پر افغانوں سے جھڑپ کرتا ہوا ـــــ ان کے 'سنگوروں' پر یلغار کرتا ہوا اور ان کی کھوپڑیوں کے مینار بناتا ہوا بنگش کی سمت بڑھا لیکن اس کا زیادہ تر مالِ غنیمت ضائع ہوگیا اور اچانک حملوں کے خلاف فوجوں کو مستقل طور پر مستعد رکھنا ضروری ہوگیا ہر رات لشکر کو جنگ کے لیے آراستہ و صف بستہ کیا جاتا تھا ـــــ میمنہ، میسرہ، قلب اور ہراول ـــــ بابر خود اپنے عملے کے اراکین کے ساتھ گشت لگاتا رہتا تھا۔ صورتِ حال کے خطرے کا احساس دلانے کے لیے جو سپاہی اپنی جگہ سے غیر حاضر پائے جاتے تھے ان کی ناک کاٹ لی جاتی اور اُن کے ساتھیوں کے لیے ایک انتباہ کے طور پر اُن کو اسی حالِ ابتر میں سپاہیوں کی قطاروں کے سامنے گھمایا جاتا تھا۔ پوری فوج چھ رسالوں میں منقسم تھی جس میں سے ہر ایک رسالے کو ایک دن اور ایک رات عقب کی حفاظت کے لیے فوج ساقہ کا فرض انجام دینا ہوتا تھا۔ حفظِ ماتقدم کی ان تدابیر کی ہی یہ برکت تھی کہ بابر کسی سنگین تباہی کے بغیر نہایت خطرناک علاقوں سے گزر گیا۔ وہ دشت میں داخل ہوا۔ پھر جنوب میں مہترسلیمان کے کنارے کنارے بڑھتا ہوا آخرکار بیلاہ کے مقام پر دریائے سندھ تک جا پہنچا جو کہ مُلتان کا ایک ماتحت علاقہ تھا۔ یہاں ایک سازش کا انکشاف ہوا جس کا سرغنہ باقی چغانیانی تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ بابر کو ہٹا دیا جائے جس کی حاکمیت و آقائیت ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے زیادہ حوصلہ پرست تابعین کو ناپسند و ناگوار تھی اور اس کی جگہ اس کے بھائی جہانگیر مرزا کو تخت نشین کیا جائے۔

لیکن جہانگیر نے ایک فرض شناس بھائی کی طرح سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس کے نتیجے میں وہ ناکام ہوگئی اور فوج غزنی کے راستے کابل واپس آگئی ـــــ لیکن جہاں ایک بھائی نے پسندیدہ سلوک کیا تھا وہاں دوسرا بھائی بابر کے لیے بہت کچھ اندیشہ و تشویش کا باعث بن رہا تھا۔ ناصر کو بابر کے احکام یہ تھے کہ اس کے پیچھے پیچھے بڑھتا چلا آئے لیکن ناصر نے ایسا کرنے کے بجائے اپنی فوج کو وادیٔ نور کے لوگوں کے خلاف ایک ذاتی چھاپہ مار مُہم پر بھیجنا زیادہ مناسب سمجھا۔ یہ جماعت اپنے سالار کی نااہلیت کی وجہ سے بالکل تباہ ہوگئی۔ ناصر اپنی واجبی سرزنش سے بچنے کی فکر میں بابر کی ملاقات سے گریز کا کوئی موقع تلاش کر ہی رہا تھا جب کہ اُسے اچانک اطلاع ملی کہ بدخشاں کا علاقہ ازبکوں کے خلاف باغی ہوگیا ہے۔ بلاتاخیر وہ اس سمت روانہ ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس کی مڈبھیڑ خسرو سے ہوگئی جو کہ کچھ عرصے تک ایک جلاوطن کی حیثیت سے ہرات کے سلطان حسین مرزا بیقرہ کے دربار میں رہنے کے بعد ناصر کی طرح بدخشاں کی بغاوت سے فائدہ اُٹھانے نکلا تھا۔ بڑی مشکل سے ناصر نے خسرو کو اپنا ارادہ بدلنے پر تیار کیا اور یہ مہم پسند انسان اپنے مُٹھی بھر مایوس و جانباز ساتھیوں کو لے کر قندز پر حملہ آور ہوا۔ وہاں اس کا وہی انجام ہوا جس کا وہ کافی مستحق تھا۔ اسے ازبکوں نے گرفتار کرلیا اور بعدہٗ ہلاک کر دیا۔ دوسری طرف بدخشانیوں نے بڑی خوشی سے ناصر کا استقبال کیا اور چند مشکلات کے بعد وہ خود کو وہاں کا حکمران بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ واقعات ۱۵۰۵ء کے موسم گرما میں پیش آئے۔ اسی زمانے میں بابر نے ایک اور مہم کا ارادہ کیا لیکن پہلے تو اس کی والدہ کے انتقال کی وجہ سے، پھر خود اس کے اپنے بُخار کی وجہ سے اور آخر میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے جس میں کابل کو بہت نقصان پہنچا تھا[۵] اس کے منصوبے میں تاخیر ہوگئی۔ آخر کار وہ نقل و حرکت کے لیے آزاد ہوگیا مگر جہانگیر اور باقی چغانیانی کی پُرزور درخواست پر قندھار کی بجائے جو اس کی اوّلین منزل تھی

---

[۵] فرشتہ لکھتا ہے کہ اس تباہ کن سانحے کے وقت بابر کے طرزِ عمل نے اس کو اپنی نئی رعایا میں ہر دل عزیز بنا دیا لیکن بابر کے کردار سے جو توقعات کی جاسکتی ہیں اُن کے علاوہ مجھے فرشتہ کے اس بیان کی تصدیق میں کوئی قدیم سند نہیں مل سکی۔

وہ قلات کی طرف بڑھا۔ کچھ پریشانی کے بعد اس جگہ پر قبضہ ہوگیا لیکن یہ دیکھ کر وہ بڑا بدمزہ ہوا کہ جن دو اشخاص نے یہ مہم تجویز کی تھی اُن میں سے کوئی بھی اپنی فوج کو اس دور افتادہ علاقے میں حفاظت و تصرّف کے لیے رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اب بابر کے لیے واپسی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بابر نے پہلے ہی موقع پر باقی چغانیانی سے نجات حاصل کرلی جس کی گستاخی برداشت سے بالکل باہر ہوتی جاتی تھی۔ اپنی قوت اور وقار کا پورا شعور رکھنے کی وجہ سے اس امیر کا طریقہ یہ تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے عہدے سے استعفیٰ دیتا رہتا تھا لیکن اگلی مرتبہ جب اس نے استعفیٰ پیش کیا تو بابر نے اسے منظور کر کے اُس کو حیران کر دیا۔ اس پر حیرت زدہ وزیر نے اپنے آقا کو ایک وعدہ یاد دلایا کہ جب تک اس سے نو غلطیاں سرزد نہ ہوں گی اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ جواب میں بابر نے (غالباً بہت خوشی خوشی) اس کے گیارہ جرائم کی فہرست بھیج دی جو سب کے سب ناقابلِ انکار اور سنگین تھے۔ تب باقی نے دیکھا کہ اس کا کھیل ختم ہوچکا ہے اور وہ اپنی ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی بہت سی دولت لے کر ہندوستان کی سمت چلا گیا۔ لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اُسے اپنے بُرے اعمال کی سزا مل گئی کیوں کہ اس کے ایک ذاتی دشمن نے اُسے قتل کر ڈالا اور اس کا تمام سامان قاتل کے حصّے میں آیا۔

اگلے کوئی ایک مہینے تک بابر کی توجّہ ہزارہ قبیلے کے خلاف ایک تعزیری مہم پر لگی رہی کیوں کہ ان لوگوں نے مختلف قسم کی گستاخیاں کی تھیں اور سڑکوں کو غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ ایک چھوٹی سی فوج لے کر اُس نے اُن پر اچانک حملہ کر دیا اور اس تنگ گھاٹی کو پار کر کے جو کہ ان کے سرمائی مستقر کے راستے کی حفاظت کرتی تھی، خود اُن کے پڑاؤ میں بھگدڑ مچادی۔ بڑی تعداد میں گھوڑے اور بھیڑیں پکڑ کر لائی گئیں۔ اگرچہ اس مہم کے مقاصد میں کامیابی ہوئی تھی لیکن اس کا ایک نتیجہ بابر کے لیے بہت ناخوشگوار ہوا۔ اُس جیسے آہنی جسمانی نظام کے انسان کے لیے بھی وہاں کی سردی اور مشقت و سختی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کی وجہ سے اُس پر عرق النّسا کا شدید حملہ ہوا جس نے اُسے چالیس دن تک بستر پر دراز کیا —— پھر بابر کی تکالیف صرف جسمانی ہی نہیں تھیں۔ وہ اُس زمانے میں اپنے بھائی جہانگیر کے رویّے سے بہت پریشان تھا۔ جہانگیر

کو چونکہ یہ احساس تھا کہ اس کا اپنا طرزِ عمل قصور و خطا سے پاک و صاف نہیں رہا ہے، اس وجہ سے وہ اس بالکل بے بنیاد شک و شبہ میں مُبتلا تھا کہ اس کا بھائی بابر اس کی تباہی کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس نِکمّے اور پکّے شرابی نوجوان نے اچانک بابر کو چھوڑ کر کہیں اور قسمت آزمائی کا ارادہ کر لیا۔ وہ راستے میں قتل و غارت گری کرتا ہوا تیزی کے ساتھ غزنی پہنچا اور پھر پلٹ کر ہزارہ کے علاقے سے گزرتا ہوا 'زائی' اور اس کے ارد گرد گرما کے مرغزاروں میں بسنے والے منگول قبیلوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس اقدام سے بابر کو بہت پریشانی ہوئی۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اُس کے دشمن کس قدر شوق سے جہانگیر کا خیر مقدم کریں گے اور بازیِ سیاست میں ایک مہرے کی طرح اُسے استعمال کریں گے۔ ابھی شہزادہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے بھائی جہانگیر کے اس اقدام کا توڑ بہترین طریقے پر کیسے کرے کہ اس حرکت و عمل کا پیغام ملا جس کے لیے وہ اتنی مدّت سے تیاری کر رہا تھا۔ سلطان حسین مرزا بیقرہ نے جو اب بیدار ہو گیا تھا[1] خاندانِ تیموری کو ازبک دشمن کے خلاف متحدہ حملے کے لیے اپنی قیادت میں جمع ہونے کی دعوت دی۔

شاہ کابل تو اس دعوت پر لبیک کہنے کو بے قرار ہی تھا۔ وہ کہتا ہے:

"اگر اور لوگ پیروں پر چل کر گئے تو اُن کے ساتھ میرا سر کے بل جانا بھی زیبا تھا، اگر دوسرے شیبانی کے خلاف لاٹھیاں لے کر گئے تو میرا جانا فرض تھا چاہے پتھر لے کر ہی جاتا۔"

یہ صرف شیبانی کی نفرت ہی نہ تھی جس نے اُسے اُکسایا تھا۔ اس طرح کا اشتراکِ عمل جس میں خاندانِ تیموری کے دوسرے افراد بھی شامل ہوں، جہانگیر کی سازشوں کا بہترین ممکن جواب تھا۔ لیکن ایک دفعہ پھر اُس کی کوششوں کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ ابھی بمشکل ہی سلطان حسین ازبکوں کے خلاف اپنی فوج لے کر باہر نکلا تھا کہ اچانک ۵ مئی کو اس کا انتقال ہو گیا[2]۔

---

[1] اس بیداری کا سبب غالباً یہ تھا کہ شیبانی نے خوارزم کا محاصرہ کر لیا تھا اور دس ماہ تک ایک دلیرانہ دفاع کا مقابلہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔

[2] ۱۱ ذی الحجہ ۹۱۱ھ۔ بابر نے اس کے دربار کی شان و شوکت اور تہذیب کا بہت طویل حال لکھا ہے جو 'حبیب السیَر' کے بیان پر مبنی ہے۔

بابر سلطان حسین کے ساتھ شامل ہونے کے لیے روانہ ہو چکا تھا کہ اس کی موت کی اطلاع آئی۔ لیکن علاقہ چھوڑنے سے پہلے وہ جہانگیر مرزا کی شرآفریں قوت کو کم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہلکے سواروں کا ایک دستہ لے کر اس نے اچانک چھاپہ مارا۔ بالکل بے خبری میں جہانگیر کو جالیا اور اس کو اس قدر ہراساں کر دیا کہ اس کی سپاہ برف کی طرح پگھل کر نابود ہوگئی۔ شہزادہ بابر اس معرکے سے لوٹا ہی تھا کہ ہرکارے مختلف طرح کی خبریں لے کر آئے۔

اس نے سلطان حسین مرزا بیقرہ کی موت کی خبر بڑی مایوسی سے سنی۔ لیکن اس خبر کا کسی قدر ازالہ اس اطلاع سے ہوگیا کہ ناصر مرزا نے ازبکوں کی ایک طاقت ور فوج کے خلاف جو کہ بدخشاں فتح کرنے کی کوشش کر رہی تھی ایک شاندار فتح حاصل کی۔ بابر نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اپنے ابتدائی منصوبوں پر عمل کرے گا اور شیبانی کے خلاف ہرات کی فوج سے مل جائے گا کیوں کہ اس نے سنا تھا کہ بدیع الزّماں مرزا اور مظفر حسین مرزا جن کے متعلق سلطان حسین مرزا کے مشترک جانشین ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا، اُس مہم کو پھر شروع کرنے کے لیے بے چین تھے جس کا سلسلہ اُن کے باپ کی موت نے توڑ دیا تھا۔ وہ اس وقت تک ہرات سے نکل کر مرغاب پہنچ چکے تھے۔ اُدھر جہانگیر کو بہلا پھسلا کر اطاعت پر راضی کرلیا گیا اور اس کے بھائی بابر نے بہ رضا و رغبت معاف کر دیا۔ اس کے بعد بابر بھی مرغاب کے مقام پر بدیع الزّماں مرزا اور مظفر حسین مرزا سے آملا۔

بابر میں اور اس کے ان دو چچازاد بھائیوں میں جو ہرات کے مشترک حکمران تھے بڑا تضاد پایا جاتا تھا۔ بابر اگرچہ ابھی صرف ۲۴ سال ہی کا تھا مگر وہ ایک آزمودہ مردِ میدان اور بہت تجربے کار بادشاہ تھا۔ دونوں مرزا بابر سے ذرا بڑے تھے اور انتہائی نفاست و شائستگی اور مسحور کن شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن اُن میں ایک سلطنت پر حکومت کرنے کی صلاحیت برائے نام ہی تھی اور ایک جنگی مہم کا اہتمام کرنے کی اہلیت تو بالکل تھی ہی نہیں۔ ابتدا میں شاید محض کاہلی و آرام طلبی کے باعث وہ بابر کے ساتھ ایک متکبرانہ سرد مہری کا رویّہ اختیار کرنے پر مائل نظر آتے تھے لیکن بابر کے ایک زوردار احتجاج کے بعد انھوں نے اس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا۔ اس کی خوب شان دار مدارات ہوئیں اور ہر ایک نے اس کو بہت کچھ بڑھایا چڑھایا۔ لیکن وہ اس جبریہ بے عملی کی وجہ سے بہت پیچ و تاب میں تھا کیوں کہ جیسا کہ وہ خود تلخ الفاظ میں کہتا ہے۔ اُدھر مرزا صاحبان دعوتیں

اُڑا رہے تھے اور اُدھر اسی وقت شیبانی بلخ کو تسخیر کر رہا تھا۔ شاید یہ دونوں مرزا اپنے اس جنگجو عم زادہ سے قدرے رقابت و حسد کرتے تھے۔ اپنی بے حسی کے باوجود انھوں نے اس کو یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ وہ ازبک چھاپہ ماروں کے ایک دستے کو مار بھگائے جو توہین آمیز حد تک لشکرگاہ کے قریب آگیا تھا ـــــ اور چونکہ موسم سرما نزدیک آرہا تھا، انھوں نے بابر سے اپنے ساتھ ہرات واپس چلنے پر اس طرح اصرار کیا کہ انکار ناممکن ہوگیا۔ اس امر کے باوجود کہ بابر کابل سے ایک لمبی غیر حاضری کے سیاسی اثر سے خائف تھا پھر بھی وہ ہرات جانے پر راضی ہوگیا۔ یہاں اُس نے بیس دن کی چھٹی بہت خوش گوار انداز میں گزاری۔ وہ ہر رات باہر ضیافت میں جاتا تھا اور وہاں کے سارے ہی مناظر دیکھتا تھا، جن کا حال وہ ایسی دیانت دارانہ تفصیل سے لکھتا ہے کہ موجود دور کے امریکی سیاح کے دل میں بھی اسے دیکھ کر شوقِ تقلید پیدا ہوسکتا ہے ـــــ یہی وہ مقام تھا جہاں وہ اپنی عم زاد معصومہ سلطان کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہوگیا۔

لیکن جلد ہی اس کے دل میں زندگی کے ٹھوس اور سنجیدہ معاملات کا احساس ایک بار پھر جاگ اُٹھا۔ کابل کے اندیشوں نے اس کو افسردہ و فکرمند کرنا شروع کر دیا تھا اور خود اپنے مُلک کو واپس لینے کی خواہش تیز تر ہوگئی تھی جس کا ایک سبب تو اس کا یہ علم تھا کہ اُس کے آرام طلب چچازاد بھائی ازبکوں کے خلاف کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوں گے اور دوسرا سبب اس کا یہ احساس تھا کہ میزبانی کے دریادِلانہ مظاہروں کے باوجود انھوں نے اس کے لیے ایک مناسب سرمائی قیام گاہ کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ پہاڑوں سے گزرتا ہوا کابل کے پُرخطر سفر پر روانہ ہوگیا۔ جن مشکلات اور صعوبتوں سے اسے گزرنا پڑا وہ بڑی خوف ناک تھیں اور وہ سردی کے شدید اثرات کی زد میں آکر موت سے بال بال بچا۔ اس سلسلے میں اس کا اپنا بیان ایسا جان دار ہے کہ یہاں اس کو پیش کرنا مناسب ہوگا:

> "میر غیاث کے لنگر سے روانہ ہوکر ہم غرجستان کے سرحدی دیہات کے قریب سے گزرتے ہوئے چچ چرن پہنچے۔ لنگر سے غرجستان تک ایک مسلسل برف کی چادر تھی۔ آگے بڑھ کر یہ اور بھی دبیز ہوگئی تھی۔ خود چچ چرن کے نزدیک یہ گھوڑوں کے گھٹنوں سے بھی اوپر تھی۔ چچ چرن ذالنون ارغن کے زیرِ حکومت

تھا۔ اب اس کا رسالدار میرجان ایردی وہاں رہتا تھا۔ اس سے ہم نے ذالنون ارغن کی رسد کا تمام ذخیرہ خرید لیا۔ ایک دو منزل آگے برف بہت دبیز تھی یعنی گھوڑوں کی رکاب سے بھی اونچی۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے مقامات پر تو گھوڑوں کے سُم زمین پر بھی نہ لگتے تھے۔

" میرغیاث کے لنگر پر ہم نے یہ مشورہ کرلیا تھا کہ کابل واپس جانے کے لیے کونسی سڑک اختیار کی جائے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ اس بات پر متفق تھے کہ یہ سردی کا موسم ہے، پہاڑی سڑک دُشوار و خطرناک ہے۔ اگرچہ قندھار کی راہ ذرا طویل ہے لیکن محفوظ اور آسان ہے۔ قاسم بیگ نے کہا' وہ سڑک طویل ہے، آپ کو اس سڑک سے جانا ہوگا۔' اور جب اس نے بہت بحث کی تو ہم نے پہاڑی سڑک ہی اختیار کی۔ ہمارا رہنما ایک پاشائی مسمّی پیر سلطان تھا۔ خواہ اس کی وجہ اس شخص کی سن رسیدگی ہو یا کم ہمتی یا گہری برف ـــــ بہرحال وہ راستہ بھول گیا اور ہماری رہنمائی نہ کرسکا۔ چونکہ قاسم بیگ کے اصرار کی وجہ سے ہم نے یہ راستہ اختیار کیا تھا اس لیے وہ اور اس کے بیٹے ـــــ اس کے نام کی خاطر گھوڑے سے اُتر پڑے۔ برف کو پیروں سے روند کر راستہ ڈھونڈھ نکالا اور رہنمائی کرنے لگے۔ ایک دن تو برف اتنی دبیز اور راستہ اتنا غیر یقینی تھا کہ ہم آگے نہیں بڑھ سکے۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر ہم واپس لوٹے اور ایک مقام پر جہاں آگ روشن کرنے کے لیے لکڑیاں موجود تھیں گھوڑوں سے اُتر پڑے اور ساٹھ ستّر آدمیوں کو چن کر راہ میں پڑنے والی ایک وادی میں بھیجا کہ وادی کے نشیب میں سردیاں گزارنے والے قبیلۂ ہزارہ کے کسی آدمی کو پکڑ لائیں جو ہمیں راستہ دکھا سکے۔ اس مقام کو ہم اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے تھے جب تک کہ تین چار دن میں ہمارے آدمی واپس نہ لوٹ آئیں۔ وہ کوئی راہبر ساتھ نہ لائے۔ ایک دفعہ پھر ہم نے سلطان پاشائی کو آگے بھیجا اور خدا پر بھروسا کرکے پھر اسی راہ پر روانہ ہوئے جس پر چل کر ہم اس جگہ تک واپس آئے تھے جہاں سے راستہ بھولے تھے۔ اُن چند دنوں میں اتنی مصیبت و صعوبت اُٹھانی پڑی کہ زندگی میں کبھی نہیں اُٹھائی تھی۔ اسی پریشانی میں میں نے مندرجہ ذیل مطلع کہا:

(ترجمہ) : 'کیا تقدیر کی کوئی ایسی بے رحم گردش باقی ہے جو میں نے نہ دیکھی ہو؟
کیا کوئی ایسا درد و غم ہے جس سے میرا قلب فگار بچ گیا ہو؟'

"ہم برف کو روندتے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ چلتے رہے مگر ایک دن میں دو یا تین میل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ برف کو روندنے والوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرے علاوہ اُن میں میرے خاندان کے دس پندرہ افراد۔ قاسم بیگ۔ اس کے بیٹے تنگری بردی اور قنبر علی اور دو تین اُن کے جلودار شامل تھے۔ مذکورین سات آٹھ گز تک برف دباتے چلے جاتے تھے اور ہر قدم پر کمر یا سینے تک دھنس جاتے تھے۔ چند قدم کے بعد سب سے آگے چلنے والا شخص محنت سے تھک کر ساکت کھڑا رہ جاتا تھا اور ایک اور آدمی آگے بڑھتا تھا۔ جب دس، پندرہ یا بیس آدمی برف روند چکتے تو وہ اس قابل ہو جاتا تھا کہ اس پر سے ایک گھوڑا گزارا جا سکے۔ گھوڑے کو بڑھایا جاتا تو وہ رکاب تک دھنس جاتا اور دس بارہ قدم سے آگے نہ چل سکتا۔ تب اس کو ایک طرف ہٹا کر دوسرے کو بڑھنے کا موقع دیا جاتا۔ جب ہم دس، پندرہ، بیس آدمی برف کو دبا چکتے اور گھوڑوں کو اس طریقے پر آگے لے جاتے تو بعدہٗ بہت ہی مضبوط قسم کے بہادر سپاہی اور نام آور لوگ اس دبے دبائے راستے پر سر جھکائے آگے بڑھتے۔ یہ موقع کسی پر زور دینے یا جبر کرنے کا نہ تھا! ایسے کاموں کے لیے جو شخص پختہ عزم و ہمت اور جفاکشی کا مالک ہوتا ہے وہ خود ہی درخواست کر کے ان کو سرانجام دیتا ہے۔ اس طرح برف روندتے ہم تین چار دن میں اس مقامِ عقوبت سے باہر نکل آئے اور درّہ زریں کے نیچے ایک غار پر پہنچے جو 'خوال قوتی' (مبارک غار) کے نام سے معروف تھا۔

"اس رات جسم کے پار ہو جانے والی ہوا کے ساتھ ایسا حیرتناک طوفان آیا کہ ہر شخص کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ جب ہم 'خوال' پہنچے جو کہ ان اطراف کے لوگوں کی زبان میں پہاڑی غار یا جوف کو کہتے ہیں تو اس وقت تک طوفان انتہائی شدید ہو گیا تھا۔ ہم اُس کے دہانے پر اُتر پڑے —— چاروں طرف گہری برف! —— راستہ ایسا کہ صرف ایک شخص چل سکے۔

اور راستے کی اس دبی دبائی اور رندی ہوئی برف میں بھی قدم قدم پر گھوڑوں کے لیے خطرناک پوشیدہ گڑھے ! ــــ دن کا وقت مختصر ترین ـ سب سے پہلے آنے والے لوگ دن کی روشنی میں غار پر پہنچے ۔ دوسرے لوگ نمازِ مغرب سے لے کر عشا کے وقت تک آتے رہے ۔ اس کے بعد والے جہاں بھی تھے وہیں اُتر گئے ۔ جب صبح صادق ہوئی تو اس وقت تک بہت سے لوگ گھوڑوں پر ہی تھے ۔

" غار چھوٹا لگ رہا تھا اس لیے میں نے بیلچہ لے کر اُس کے دہانے کے قریب اپنے لیے نشست بھر جگہ صاف کرلی، اگرچہ میں نے سینے کی اونچائی تک کھودا پھر بھی زمین تک نہ پہنچ سکا ۔ جب میں اس کے اندر بیٹھ گیا تو ہَوا سے تھوڑی سی پناہ مل گئی ۔ اگرچہ لوگ کہتے رہے ' اندر آجایئے ' مگر میں غار میں نہیں گیا کیوں کہ میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ میرے کچھ آدمی تو برف وطوفان میں ہوں اور میں ایک گرم گھر کے آرام وراحت میں ! تمام جماعت باہر مصیبت وتکلیف میں ہو اور میں اندر خواب و راحت میں ! ــــ یہ شیوۂ مردانگی سے بہت بعید ہوگا ــــ یہ رفاقت سے بالکل مختلف کچھ اور شے ہوگی ! ــــ جو بھی صعوبت وآفت درپیش ہے میں اُس کا مقابلہ کروں گا ۔ جو کچھ ایک طاقت ور آدمی برداشت کرسکتا ہے میں بھی برداشت کروں گا، کیوں کہ جیسا کہ ایک فارسی مثل ہے : ' مرگِ انبوہ جشنے دارد ' ــــ میں عشا کے وقت تک برف اور ہَوا کے اس طوفان میں گڑھے کے اندر بیٹھا رہا ۔ باہر برف باری اتنی زبردست ہورہی تھی کہ میرا سر، پُشت اور کان چار بالشت برف سے ڈھک گئے تھے ۔ اس رات کی سردی نے میرے کانوں پر بُرا اثر ڈالا ۔ عشا کی نماز کے وقت کسی نے زیادہ غور سے غار کو دیکھا تو چلاّ پڑا ' یہ تو بہت کشادہ غار ہے '، اس میں ہر ایک کے لیے جگہ ہے ! ' یہ سُن کر میں نے برف کی سقف بندی کو جھٹک کر اپنے اوپر سے ہٹا دیا اور اپنے قریب والے جانبازوں سے بھی آنے کو کہہ کر اندر چلا گیا ۔ وہاں تو پچاس ساٹھ کے لیے جگہ تھی ! لوگوں

نے اپنا راتب نکالا ـــــ ٹھنڈا گوشت۔ بھُنے ہوئے چنے وغیرہ جو کچھ بھی ان کے پاس تھا ـــــ کہاں وہ سردی اور طوفان اور کہاں یہ گرم و راحت رساں اور پُرسکون مقام!

"اگلے دن برف باری اور تیز ہَوا کے رُک جانے پر ہم سویرے ہی روانہ ہوگئے اور پھر برف روند کر راستہ بناتے ہوئے ہم درہ تک پہنچ گئے۔ اصلی سڑک پہاڑ کے پہلو پر گھومتی ہوئی اوپر جاتی تھی اور وہاں اس درہ سے گزر کر جو درہ زریں کے نام سے معروف ہے آگے اور زیادہ بلندی کی طرف چلی جاتی۔ بجائے اس سڑک کے ہم سیدھے وادی گل (قل؟) سے ہوکر گئے۔ رات ہوچکی تھی جب ہم درہ بگک کے دوسرے سرے پر پہنچے۔ یہ رات ہم نے وادی کے دہانے میں گزاری ـــــ ایک شدید سردی کی رات جو بڑی اذیت و مصیبت سے بسر ہوئی! ـــــ بہت سے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں کو پالا مار گیا۔ اس رات کی ٹھنڈ سے کیپا کے دونوں پاؤں۔ سندوک ترکمان کے دونوں ہاتھ اور آہی کے دونوں پاؤں بے کار ہوگئے۔ دوسری صبح سویرے ہی ہم وادی سے اُترے، خُدا پر بھروسا کر کے ہم نہایت خراب ڈھلانوں اور خطرناک نشیبوں پر گزرتے ہوئے سیدھے نیچے کی طرف بڑھتے رہے، یہ دیکھتے اور جانتے ہوئے کہ یہ صحیح راستہ نہیں ہوسکتا۔ نمازِ مغرب کا وقت ہوچکا تھا جب ہم اُس وادی سے نکلے۔ کسی بھی طویل الحافظہ بوڑھے شخص کو یاد نہ تھا کہ کبھی کوئی شخص اس درہ کو ایسی گہری برف میں پار کرتے سُنا گیا ہو یا کبھی کسی شخص کے دل میں سال کے اِس زمانے میں اس کو پار کرنے کا خیال ہی آیا ہو۔ اگرچہ چند دن برف کی دبازت سے ہمیں بہت مُشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن اسی دبازت کی وجہ سے آخر کار ہمیں منزل پر پہنچنے میں مدد ملی ـــــ یہ کیسے؟ ـــــ یہ موٹی برف نہ ہوتی تو اور کس طرح بے راہ ڈھلانوں اور اچانک نشستوں کو عبور کرسکتے تھے؟

"تمام بُرائیوں اور تمام اچھائیوں کا اگر حساب لگایا جائے اور صحیح نظر سے دیکھا جائے تو اچھائیاں ہی اچھائیاں نکلیں گی!

" یاکاؤلنگ کے لوگوں کو فوراً ہماری آمد اور مصیبتوں کا حال معلوم ہوگیا اور پھر گرم گھروں، موٹی بھیڑوں، گھوڑوں کا گھاس دانہ، وافر پانی، بکثرت جلانے کی لکڑی اور کنڈوں (اُپلوں) کی کمی نہ رہی! سردی اور برف سے بچ کر ایک ایسے گاؤں اور اتنے گرم گھروں میں پہنچ جانا کس قدر راحت کی چیز تھی، یہ بات صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں ہماری طرح آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہو اور اس سکون و آرام کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو ہماری طرح سختیاں جھیل چکے ہوں۔ ہم اطمینانِ دل اور سکونِ دماغ کے ساتھ ایک دن یاکاؤلنگ ٹھہرے رہے۔ اگلے دو یگاچی (تقریباً دس بارہ میل) چل کر گھوڑے سے اُترے۔ دوسرے دن رمضان (شروع) تھا۔ ہم بامیاں سے گزرتے ہوئے شبرتو کو پار کر کے جنگ لیک پہنچنے سے پہلے ہی اُتر پڑے۔"[1]

اپنی فوجوں کو آرام دینے اور تازہ دم کرنے کے بعد بابر کا ارادہ پریشان کن ترکمانی ہزارہ (قبیلے) کے مستقر سرِ آب پر حملہ کرنے کا تھا جو بابر کی موجودگی سے بے خبر اس کی راہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے اچانک حملہ کر کے ان کو منتشر کر دیا، متعدد کو گرفتار کر لیا اور بڑی تعداد میں گھوڑوں اور بھیڑوں کو ساتھ لے گیا۔

جس وقت بابر اس مہم میں مشغول تھا، اسے کابل سے ایک خبر ملی جس کو سُن کر اس کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ وہ موسم کی دشواریوں کے باوجود برابر آگے بڑھتا آیا تھا۔ اس خبر سے معلوم ہوا کہ محمد حسین مرزا نے جو ازبک طوفان سے بچنے کے لیے بابر کے پاس پناہ گزیں ہوا تھا، بغاوت کی آگ بھڑکانے کے لیے اپنے میزبان کی عدمِ موجودگی سے انتہائی احسان فراموشانہ طریقے پر فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ہرات کے مرزاؤں کے ہاتھوں بابر کے اغوا کی افواہ بڑی جانفشانی سے پھیلا کر اس نے کابل کے منگول دستوں کو سلطان محمود مرزا کے سب سے چھوٹے بیٹے وئیس مرزا کو بادشاہ بنانے کے منصوبے میں اپنی مدد کے لیے تیار کر لیا ـــــ شہر باغیوں کے ہاتھوں میں تھا مگر قلعہ وفادار مُلّا بابا پاشغر کی قیادت میں ابھی بابر کے ساتھ تھا۔

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۳۰۶ــ ۳۱۱

اس شہزادے نے حسبِ معمول بڑی سرگرمی و قوت سے عمل کیا۔ وفادار قلعہ بند فوج سے یہ طے کر کے کہ جب اُس کے آدمی قریبی پہاڑی پر آگ جلائیں تو وہ قلعے سے نکل کر دشمن پر چھاپہ ماریں۔ وہ خود حملہ کرنے کو آگے بڑھا۔ ایک تیز مگر بے ترتیب و بے قاعدہ جھڑپ کے بعد باغی مکمل طور پر منتشر کر دیے گئے اور بابر پھر مالک بن گیا۔ خاص مجرم اُس کے اپنے رشتے دار تھے، اگرچہ اس نے حسبِ معمول نرمی کا ثبوت دیا لیکن اُن کی غداری پر اُسے بڑی تلخ مایوسی ہوئی۔

جب یہ پریشان کن معاملہ طے ہوگیا تو بابر نے باغی قبیلوں کے خلاف، جن کی بداعمالیوں سے اُس کی سلطنت میں خلل پڑتا تھا، تعزیری مہمات کی قیادت کا سلسلہ حسبِ معمول پھر شروع کر دیا۔ تقریباً اسی زمانے میں بابر کی حالت اپنے دو بھائیوں پر نازل ہونے والی آفتوں کے باعث کافی مضبوط ہوگئی جن کے متعلق یہ امکان ہمیشہ ہی لگا رہتا تھا کہ اس کے حریف اور اس کے دشمنوں کے ہاتھوں کے مہرے بن سکتے ہیں۔ بڑا بھائی جہانگیر کثرتِ شراب نوشی سے اچانک چل بسا اور چھوٹا (بھائی) ناصر خود اپنی حماقت کے نتیجے میں اپنی نئی بدخشاں کی سلطنت سے باہر نکال دیا گیا اور ذلیل و پشیماں ہوکر ملازمت و معافی کی خواہش میں اس کے پاس واپس آگیا۔

اسی درمیان خراسان میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے، شیبانی نے اپنے حریفوں کی حیثیت کا اندازہ کر کے براہِ راست سلطنت پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، جو ایک ایسی چیز تھی کہ اس کی جرات وہ سلطان حسین مرزا بیقرہ کے زمانے میں کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ دربارِ ہرات میں ابتری و انتشار کا دور دورہ تھا۔ دونوں بھائی اگرچہ توقع سے زیادہ دوست تھے مگر ایک دوسرے سے اتنی رقابت بھی رکھتے تھے کہ اُن میں موثر اشتراکِ عمل بہت مشکل تھا۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ اپنی موسم گرما کی پناہ گاہ باباخاکی میں پڑے تھے اور اب تک یہ نہ طے کر پائے تھے کہ دشمن پر حملہ کریں یا ہرات کی مدافعت کریں۔ ان کے پاس سب سے زیادہ طاقت ور شخص قندھار کا حاکم ذوالنون ارغن تھا مگر وہ بدقسمتی سے سب سے زیادہ دانش مند نہ تھا۔ اپنی حاکمیت و اقتدار کی حفاظت کا ایسا متوالا تھا کہ جب ایک واقف کار و ذہین شخص نے جنگی مہم کی ایک معقول اور ٹھوس تجویز پیش کی یعنی یہ کہ ہرات میں ایک دفاعی فوج چھوڑ کر ایک طاقت ور لشکر کے زیرِ حفاظت پہاڑوں

میں چلا جائے تو ذوالنّون احمقانہ پیشین گوئیوں[1] پر اعتماد کر کے خود ہی حملہ آوروں کو مار بھگانے پر تُل گیا۔ اس نے کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں ـــــ کسی طرح کے احکامات صادر نہ کیے اور جب شیبانی نے چالیس پچاس ہزار جنگ آزمودہ ازبکوں کے ساتھ ہرات پر چڑھائی کی تو ذوالنّون ارغن نے ایسی حماقت دکھلائی کہ کوئی ڈیڑھ سو سپاہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ فطری طور پر میدانِ جنگ سے اس کا صفایا ہوگیا۔ وہ پکڑا گیا اور ہلاک کر دیا گیا۔ مرزا صاحبان پرلے درجے کے بزدلوں کی طرح اپنی عورتیں، بچّے اور ساز و سامان حملہ آوروں کی مرضی پر چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خراسان کا تمام علاقہ عملی طور پر بلا مزاحمت ہی شیبانی کے ہاتھوں میں آگیا۔ ازبک سردار کی فتح مکمل تھی۔ اس کی طاقت اپنے پورے عروج پر تھی، اس نے تیموریوں کو کچل دیا تھا اور کابل کے علاوہ اُن تمام سلطنتوں کے تخت پر متمکن ہوگیا تھا جو اُن کے قبضے میں رہی تھیں۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے قدرے متکبّرانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ دربارِ ہرات کو سابقہ برسوں میں جو ثقافتی شہرت حاصل رہی تھی اس کو قایم رکھنا اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس نے تلوار سے قلم کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ وہ مشہور ماہرینِ خطاطی کی تحریروں اور مشہور مصوّروں کی تصویروں میں اصلاح کرنے لگا۔ مذہبی عُلما کو دینیات و تفسیر کے باب میں ہدایت دینے لگا اور بابر کی نظر میں اس کا سب سے بڑا جُرم یہ تھا کہ اس نے انتہائی خراب اشعار کا ایک دفترِ بے معنی اپنی یادگار کے لیے جمع کر دیا!

شاید بابر کو اپنے اس زبردست حریف کی ادبی کاوشوں کو تعصب کی نظر سے دیکھنے پر معاف کیا جاسکتا ہے۔ شیبانی کی کامیابی اب اتنی مکمل تھی کہ شاہِ کابل کی حالت انتہائی خطرے میں پڑگئی۔ صرف یہی نہیں کہ کم از کم فی الحال اپنی پُرانی سلطنت کو واپس لینے کی اُمیدیں بالکل ہی تباہ ہوگئیں بلکہ اس خدشے کا معقول سبب بھی پیدا ہوگیا کہ اس کے نئے مقبوضات بھی یہ خوف ناک ازبک چھین لے گا۔ اب تک ایک کمزور تر فریق ہونے کی وجہ سے بابر کے پاس یہ سوچنے کا معقول سبب موجود تھا کہ اس کے لیے کامیاب مدافعت کا

---

[1] اسے بتایا گیا کہ کچھ نجومی ستاروں کا مطالعہ کر رہے ہیں، انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ اسد اللہ کے خطاب سے سرفراز ہوگا اور ازبکوں پر غالب ہوگا۔

واحد امکان صرف ایک پُرسرعت جارحیت میں ہی مضمر ہے۔ چنانچہ جب بدقسمت ذوالنّون ارغن کے جانشینوں شاہ بیگ ارغن اور مقیم بیگ ارغن نے بابر کو یہ دعوت دی کہ قندھار کی اطاعت پذیری کو شرفِ منظوری عطا کرے اور ازبکوں کے خلاف ایک متحدہ مہم کی سربراہی کرے تو اُس نے اِس پیش کش کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا۔ اپنے اُمرا سے مشورے کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو تیار کیا اور قندھار روانہ کردیا۔ راستے میں ایک حادثہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصر دوسرے نبرد آزماؤں سے اس کی اُفتادِ طبع کس قدر متضاد تھی

"قلات میں فوج کی مڈبھیڑ ہندوستانی تاجروں کی ایک جماعت سے ہوئی جو خرید و فروخت کی غرض سے آئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگے جانے سے معذور تھے۔ عام رائے ان کے متعلق یہ تھی کہ جو لوگ ایسے زمانۂ جنگ میں ایک دشمن مُلک میں آرہے ہیں اُنھیں لوٹ لینا چاہیے۔ لیکن میں اس بات سے متفق نہ ہوا۔ میں نے کہا 'تاجروں کا کیا جُرم ہے؟ اگر ہم خدا کی رضا پر نظر کرکے اس چھوٹے سے نفع کو چھوڑدیں تو خدائے تعالا ہمیں (بڑی) جزا دے گا ــــ یہ بالکل ایسا ہی موقع تھا جیسا کچھ عرصے پہلے جب ہم غلجی پر حملہ کرنے روانہ ہوئے تھے، پیش آیا تھا۔ اس وقت تم سب کی رائے تھی کہ مہند افغانوں پر ــــ ان کی بھیڑوں اور سامان پر ــــ ان کے اہل و عیال پر دھاوا بولا جائے صرف اس لیے کہ وہ تم سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر تھے! آج کی طرح اس وقت بھی میں تم سے متفق نہ تھا۔ دوسرے ہی دن خدائے تعالا نے افغان دشمنوں کی اتنی بھیڑیں تمھیں عطا کیں جتنی کہ کبھی فوج کے حصے میں نہیں آئیں! جب ہم قلات کے دوسری طرف اُترے تو سب تاجروں سے پیش کش کے طور پر کچھ لے لیا گیا۔"[1]

جب وہ قلات سے کابل کی طرف بڑھ رہا تھا تو دو جلاوطن شہزادے اس سے آکر ملے جو اس کی دائمی و غیر متغیر کرم فرمائیوں کا تجربہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اُن میں سے ایک تو وَیس خاں تھا جس کو کابل میں بابر کی جگہ غصب کرنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۳۳۱

خراسان جانے دیا گیا تھا۔ دوسرا (شہزادہ) اُس ملک کے سابق حکمران کا بیٹا عبدالرزاق مرزا تھا جو اکثر لوگوں کی نظروں میں (کابل کا) حقیقی وارث تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ان دونوں پناہ گزینوں کی خوف ناک حیثیت کے باوجود ان کا بہت محبت آمیز خیر مقدم ہوا اور ان کے ساتھ طرزِ عمل میں ہر طرح کا لحاظ رکھا گیا۔

جیسے جیسے بابر نزدیک آتا گیا قندھار کے ارغن اس کے لیے اپنا رویّہ بدلتے گئے۔ غالباً معاونت و اشتراک کی درخواست کے ایسے بھرپور جواب کی اُن کو توقع نہیں تھی۔ ممکن ہے انھیں اندازہ ہوگیا ہو کہ جس جن کو اُنھوں نے مدد کے لیے بلایا ہے وہ اس قدر طاقت ور ہے کہ اس سے ان کا بناہ نہیں ہوسکتا اور یہ طے کرلیا ہو کہ دور اُفتادہ شیبانی کی ماتحتی ایک بابر سے بہتر ہے جو بالکل قریب ہو۔ بابر نے جب اُن سے ملاقات کی درخواست کی تاکہ ازبکوں کے خلاف اقدامات کا منصوبہ طے کیا جاسکے تو اُنھوں نے بڑے ہی غیر دوستانہ جواب دیے اور اپنے خطوط میں بابر سے اس طرح خطاب کیا گویا وہ اُن سے کم رُتبہ شخص ہے۔[1] اُس نے کئی مرتبہ ان سے سمجھوتے کی کوشش کی لیکن جب اس کی سلسلۂ جنبانیوں کو مسلسل رد کیا گیا تو وہ اس طرح ایک بے نتیجہ اور احمقانہ زحمت کے لیے یہاں بُلائے جانے پر برافروختہ ہوگیا اور اُن پر حملے کا فیصلہ کیا۔ وہ قندھار کی پہاڑیوں کے کنارے کنارے اپنے آدمیوں کو آرام دیتا ہوا اور تازہ دم کرتا ہوا بڑھا۔ جب اُس کی مختصر سی دو ہزار فوج کے نصف آدمی گھوڑوں کا چارہ حاصل کرنے کے لیے اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے تھے تو یکایک ارغنوں نے چھ سات ہزار آدمیوں کے ساتھ خیمہ گاہ پر ہلّہ بول دیا۔ دو چیزوں نے بابر کو بچالیا ــــ ایک تو اس کی فوج کا عمدہ انضباط۔ اور دوسرے یہ امر کہ اس کا میسرہ پیڑوں سے پٹی ہوئی آب گزاروں کے پیچھے محفوظ تھا جن کو دشمن اپنی زبردست کثرتِ تعداد کے باوجود پار نہ کرسکا۔ کسی انتشار کے بغیر بابر کے آدمی اپنے اپنے مقررہ سرداروں کے تحت صف بستہ ہوگئے کیوں کہ ہر ایک کو ہراول، قلب، میمنہ و میسرہ میں اپنا صحیح مقام معلوم تھا۔ محض اپنی بہادری کے بل

---

[1] شاہ بیگ نے یہ گستاخی بھی کی کہ اپنی مہر پُشتِ خط کے 'درمیان' لگائی۔ عام طور سے جب کوئی بڑا امیر معمولی بیگ کو خط لکھتا تھا تو اس جگہ مہر لگاتا تھا۔

پر میمنہ و قلب نے اپنے مقابل کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا اور پھر اس دستے کی اعانت کو بڑھے جو کہ بائیں طرف والے دشوار راستوں کی حفاظت میں دشمن سے بری طرح دبا ہوا تھا۔ جب عام پیش قدمی کا حکم دیا گیا تو دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بھاگ پڑا۔ ان کی تباہی اتنی مکمل تھی کہ قندھار کی حفاظت کا وقت بھی نہ ملا اور آخرکار کچھ بات چیت کے بعد شہر نے بابر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ایک زبردست خزانہ فاتحین کے ہاتھ آیا۔ بدخشاں کی تلافی کے طور پر یہ علاقہ ناصر مرزا کو دے دیا گیا اور بابر اپنے بیشتر لشکر کے ساتھ مالِ غنیمت سے لدا پھندا واپس ہوا۔

مہم کی کامیابی کے بعد جس وجہ سے بابر واپس لوٹ گیا، اُسے مختصر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اُسے شیبانی کا خوف تھا۔ جیسا کہ اسے بخوبی علم تھا کہ شاہ بیگ اور مقیم نے لڑائی شروع ہونے پر خود کو ازبک سردار کے آغوش میں ڈال دیا تھا۔ ان کی درخواست پر شیبانی بابر پر اچانک ٹوٹ پڑنے کی اُمید میں قندھار پر تیزی سے آپہنچا۔ اس مقصد میں ناکام ہونے پر اُس نے شہر کا محاصرہ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا مگر قلعہ ناصر مرزا کی قیادت میں مقابلے پر ڈٹا رہا۔ جب حالات مایوس کن ہوگئے تو ناصر چپکے سے نکل کر غزنی چلا گیا اور کچھ معتمد سرداروں کو یہ ہدایت دے کر چھوڑ گیا کہ جب تک ہو سکے مقابلہ کیا جائے۔ عین اس وقت جب کہ یہ قلعہ تسخیر ہونے والا تھا شیبانی اچانک محاصرہ اُٹھا کر چلا گیا کیوں کہ اُسے خبر ملی تھی کہ اس کے حرم کو جسے اُس نے نراحتو میں چھوڑا تھا کچھ باغیوں کی نقل و حرکت سے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

شیبانی کی مہم کی ناکامی کے باوجود قندھار جیسے قریبی مقام پر ازبک کی موجودگی بابر کے لیے ایک سنگین خطرہ تھی۔ اس نے بہت سمجھ داری سے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اور دشمن کے درمیان زیادہ سے زیادہ ممکن فاصلہ پیدا کر دیا جائے۔ اس لیے ستمبر ۱۵۰۷ء میں کچھ مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ وہ ہندوستان کا قصد کرے لیکن یہ فیصلہ جلد ہی ترک کر دیا گیا کیوں کہ کچھ ہی دن بعد یہ خبر ملی کہ شیبانی واپس چلا گیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہی، کہ اس قسم کی مہم کا منصوبہ بنایا گیا تھا، واضح طور پر اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح حالات کے جبر سے بابر کے مقاصد و عزائم کا رُخ مغرب سے مشرق کی سمت رفتہ رفتہ بدلتا جارہا تھا۔

ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ گاہے گاہے دوسرے امور پر متوجہ ہو جانے کے باوجود بابر نے کس طرح اپنے مستقر کابل سے قدم بہ قدم چل کر اپنے لیے وہ راستہ تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کے ذریعے مناسب موقع پر وہ 'سلطنتِ ہندوستان' کے حصول کے لیے آگے بڑھ سکے!

باب پنجم

دوبارہ سمرقند میں

اسناد : 'بابر نامہ'۔ 'تاریخ رشیدی'۔ 'احسن السیر'۔ 'حبیب السیر'۔ 'شیبانی نامہ'۔
'عالم آرائے عباسی'۔ 'فرشتہ'۔ 'فیضی'۔ خافی خاں۔
جدید تصانیف : ارسکن ۔ لین پول۔

قندھار سے شیبانی کی واپسی نے جب تمام فوری خطرہ دُور کر دیا تو اس وقت بابر نے یہ فیصلہ کیا کہ آلِ تیمور کے سربراہ ہونے کی جو حیثیت اس کو فی الحقیقت ایک طویل مدّت سے حاصل رہی تھی اب اس کا باضابطہ اعلان بھی کر دے۔ بابر کہتا ہے :

" اس زمانے تک تیمور بیگ کے خلاف، حکمران ہونے کے باوجود 'مرزا' ہی کہلاتے تھے۔ اب میں نے حکم دیا کہ لوگ مجھے پادشاہ کہا کریں۔"

اس خطاب کا اختیار کرنا بہت معنی خیز ہے۔ اس کے معنی تھے اقتدارِ اعلا کا دعوا نہ صرف اُن تمام چغتائی اور منگول قبائیلیوں پر جو کسی زمانے میں اس کے دادا اور نانا کے زیرِ حکومت رہے تھے بلکہ ان تمام شہزادوں پر بھی جو کہ اسی نسل سے تھے اور اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ بابر کے کارنامے اس کے اس دعوے کو جائز و درست ثابت کرتے تھے۔ حالیہ برسوں کے تمام عظیم واقعات میں اس نے جو نمایاں حصّہ لیا تھا اس سے قطع نظر وہ اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور تھا۔ ملک کے باہر اُس نے ارغنوں کو شکست دی تھی، اندرونِ ملک اس نے بغاوت کو کچل دیا تھا اور اب کابل کے مقامِ تفوّق پر مضبوطی سے قدم جما چکا تھا۔

لیکن اپنے نئے اعزاز سے پُرامن طریقے پر زیادہ مدت تک لطف اندوز ہونا اس کی قسمت میں نہ تھا، کیوں کہ جب وہ حسب معمول اپنی ایک مہم پر گیا ہوا تھا تو آخری حکمران کابل کے بیٹے عبدالرزاق کی حمایت میں ایک خوف ناک بغاوت کی سازش تیار کی گئی۔ شاید بغاوت کا فوری سبب بابر کے ایک وارث کی ولادت تھی۔ بعد میں یہ بچّہ بادشاہ ہمایوں کے نام سے مشہور ہوا۔ اس ولادت نے الغ بیگ مرزا کے گھرانے کو دوبارہ تخت شاہی حاصل کرنے کے تمام امکان سے محروم کر دیا[1] تجویز یہ تھی کہ عبدالرزاق کو نہ صرف کابل و غزنی کا بلکہ بدخشان، قندز اور ان تمام علاقوں کا بھی حکمران بنا دیا جائے جو کہ پہلے خسروشاہ کے قبضے میں تھے۔ حسبِ معمول بے چینی کرایہ کے منگول سپاہیوں سے شروع ہوئی۔ ان موقع پرست سپاہیوں نے جو خسرو کی مصیبت میں اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، اب یہ دیکھا کہ ان کا نیا آقا ان کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ وہ بہت سخت تھا۔ اس نے لوٹ مار پر شدید پابندی لگا دی تھی اور وہ احکام کی بے چون و چرا تعمیل کا خواہش مند تھا۔ مئی ۱۵۰۸ء میں جب بابر واپس آیا تو اُسے کئی مرتبہ انتباہ دیا گیا کہ ان میں سرکشی پھیل رہی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصل بغاوت کا آغاز بابر کے لیے خلاف توقع ثابت ہوا۔ ایک شام جب وہ چارباغ کے دیوانِ عام میں بیٹھا ہوا تھا تو مرزا خواجہ اس کے پاس آیا اور بتایا کہ منگول سپاہی بلا شک و شبہ منحرف ہو چکے ہیں، اگرچہ یہ یقینی نہیں کہ عبدالرزاق شریک جرم ہے یا یہ کہ بغاوت جلد ہوگی۔ بابر نے اس معاملے کو نظرانداز کر دیا اور بظاہر اُسے اہمیت نہ دیتے ہوئے معمول کے مطابق حرم میں چلا گیا۔ سنگین گڑبڑ کے متعلق پہلا انتباہ یہ تھا کہ اس کے نوعمر خدّام اور پہریدار سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ کر چل دیے۔ اُس وقت اُسے اپنے خطرے کا احساس ہوا لیکن اس سے قبل کہ اس کے ذاتی محافظین نے اس کے گرد جمع ہو کر اس کو بچایا وہ تقریباً گرفتار ہی ہو گیا تھا۔ عملی طور پر تمام ہی منگول امدادی سپاہ سازباز میں شریک ہو چکی تھی، کیوں کہ آخر میں اس کے ساتھ صرف پانچ سو وفادار ساتھیوں کی مختصر جماعت رہ گئی

---

[1] اس بغاوت کے حالات کے لیے سب سے اہم ماخذ 'تاریخ رشیدی' ہے۔ مختصر و مربوط بیان 'فرشتہ' (دوم، ص ۳۰) اور 'خافی خاں' میں بھی موجود ہے۔ 'حبیب السیر' بہت کام کی ہے۔ 'تاریخ رشیدی' اور یہ، دونوں بعد کی تمام تاریخوں کی بنیاد ہیں۔

اور مقابل میں تین ہزار سے زیادہ باغی تھے۔ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہونے کی بجائے بابر نے حسب معمول اپنے پُرجوش جذبۂ عمل کے تحت ایک برملا اور آزادانہ جنگ میں اپنے تخت و جان کی بازی لگانے کا ارادہ کرلیا۔ یہ اس کی عظیم ترین جنگوں میں سے ایک تھی اور خود بابر کے قلم سے اس معرکے کا ایک دلچسپ و واضح بیان سُننے کے لیے ہم بہت کچھ قیمت ادا کرسکتے تھے۔ بدقسمتی سے، اس زمانے سے عین قبل، یعنی مئی ۱۵۰۸ء سے 'تزک بابری' سے گیارہ سال تک کے واقعات غائب ہیں لیکن متوازی ماخذوں، خصوصاً 'تاریخ رشیدی' اور 'حبیب السیَر' سے واقعات کا بہت کافی صحیح اندازہ ہوجاتا ہے۔ مقابلہ بہت ہی جانبازانہ اور زوردار تھا، لیکن آخرکار بادشاہ کی ذاتی شجاعت کی وجہ سے انجام دشمنوں کے خلاف رہا۔ اس نے خود اپنی تلوار سے باغیوں کے پانچ نامور مردانِ پیکار کو مقابلے میں یکے بعد دیگرے شکست دی[1] یہ اس کے حریفوں کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا اور وہ میدان سے بھاگ نکلے۔ آیے فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور بدقسمت عبدالرزاق کی گرفتاری سے اس کی کامیابی میں چارچاند لگ گئے۔ اپنی سعادت و اقبال مندی کے ان اوقات میں بابر اپنی فطری رحمدلی کو نہ بھولا۔ باغی سردار کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا گیا اور اُسے آزاد کردیا گیا[2]

۱۵۰۸ء کے باقی ماندہ زمانے میں اور ۱۵۰۹ء کے پورے سال کے دوران بابر کی مشغولیات کے متعلق ہماری معلومات بہت مختصر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مختصر سلطنت کے اندرونی معاملات کی تنظیم میں مشغول رہا اور پردۂ تقدیر سے جو کچھ بھی غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہوسکتا تھا اس کے لیے خود کو تیار کرتا رہا۔ اُس وقت اس کی عملی قوتوں کے لیے کوئی دوسری نکاس کی راہ نہ تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا سوال تھا، ابھی مناسب موقع نہ آیا تھا اور سمرقند کا جہاں تک سوال تھا، شیبانی اب بھی ہمیشہ کی طرح طاقتور تھا۔ چنانچہ ۱۵۰۹ء میں ایک انتہائی ناخوشگوار واقعے نے بابر کے ذہن میں اس بے رحم دشمن کی یاد

---

[1] 'فرشتہ' نے ان کے مندرجہ ذیل نام دیے ہیں: علی شب کور، علی سیستانی، نظر بہادر ازبک یعقوب تیز جنگ اور ازبک بہادر۔ اس میں سے صرف پہلے کا ذکر 'تاریخ رشیدی' میں ہے

[2] بعد میں اس نے پھر بغاوت کی۔ اب کی بار اُسے گرفتار کرکے پھانسی دے دی گئی۔ (فرشتہ، دوم)
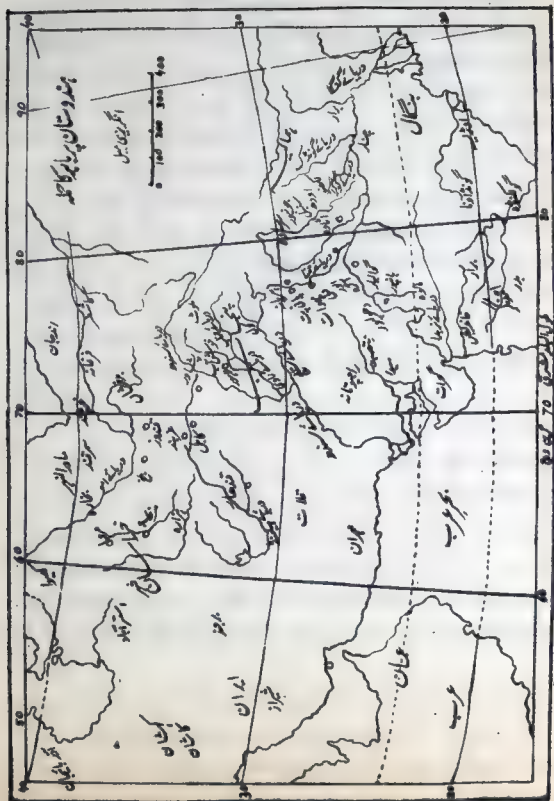
کو تازہ کر دیا۔ دو تباہ حال پناہ گزیں بابر کے پاس آئے۔ یہ دونوں اُس کے رشتے کے بھائی تھے جو شیبانی کے حکم پر نازل ہونے والی موت سے بال بال بچ کر نکلے تھے۔ ایک اس میں سے سلطان احمد خاں کا اکیس سالہ بیٹا سلطان سعید خاں چغتائی تھا، دوسرا ایک گیارہ سالہ لڑکا حیدر مرزا دوغلت تھا جو کہ بعد میں 'تاریخ رشیدی' کے مصنّف کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ ان کا استقبال اسی مہربانی اور خوش اخلاقی سے کیا گیا جو کہ اب تقریباً ضرب المثل بنتی جا رہی تھیں ـــــ حیدر مرزا لکھتا ہے:

> " اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ افلاس، مصیبت، اذیت اور صعوبت کی اُس کیفیت سے نکل کر جس نے طائر روح کو قفس پیکر کی قید و بند سے بیزار کر دیا تھا اس قدر اچانک طور پر آرام و راحت اور سکون و فراغت کی کیفیت میں منتقل ہو جانا میرے لیے کیا کچھ باعثِ لطف و مسرّت ثابت ہوا ہو گا۔ بھلا میں اپنی ممنونیت کا کافی اظہار کبھی بھی کیسے کر سکوں گا؟ ـــــ خدا اس کو اپنی نعمتوں سے نوازے۔ اس طرح پادشاہ کی خدمت میں ایک طویل عرصہ میں نے مکمل مسرّت و بے فکری میں گزارا اور وہ کبھی نرمی و شفقت سے اور کبھی سزا کا خوف دلا کر حصولِ تعلیم کے لیے میری ہمّت افزائی کرتا رہا۔ کبھی اگر وہ میری کوئی معمولی سی خوبی یا کوئی ہُنر دیکھتا تو اعلاترین الفاظ میں تعریف کرتا۔ ہر ایک سے اس کا تذکرہ کرتا اور اُن سے اس کی داد طلب کرتا۔ اس تمام عرصے میں پادشاہ نے میرے ساتھ اُسی شفقت و مہربانی کا برتاؤ کیا جس کا مظاہرہ ایک باپ اپنے بیٹے اور وارث سے کرتا ہے۔ وہ دن میرے لیے سخت بدبختی کا دن تھا جب میں اپنے باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گیا لیکن شہنشاہ کی بابرکت عنایات کی وجہ سے مجھے تنہائی کی تلخی بمشکل ہی محسوس ہو سکی"۔[1]

لیکن جلد ہی بابر کو مصیبت زدگان کی امداد سے زیادہ سرگرم و دلچسپ ایک مشغلہ ملنے والا تھا۔ ۱۵۰۹ء کے آخر میں ایک ایسی خبر کابل پہنچی جس نے یقیناً طبلِ جنگ کی طرح اس کو

---

[1] 'تاریخ رشیدی' مترجم از الیاس ورس ـــــ حیدر مرزا بابر کا شکرگزار ہونے کے باوجود اسمٰعیل کے شاہ اسمٰعیل سے تعلقات معاف نہیں کر سکتا۔ اس میں اُس نے اپنے محسن کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔

بیدار کر دیا ہوگا۔ مغرور، بے ایمان، ظالم شیبانی اپنے اقتدار کے شباب میں ایک قدم اپنی حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے خوف ناک شاہ اسماعیل صفوی کے مذبۂ مخاصمت کو بیدار کر دیا تھا جو نوشباب یافتہ ایرانی سلطنت کا مطلق العنان حکمراں اور شیعہ فرقے کا میر میدان تھا[1]۔ ان دو اشخاص کی باہمی جنگ کی داستان مشرقی تاریخ کی سب سے مشہور کہانیوں میں سے ہے۔ شیبانی کے کچھ فوجی دستوں نے شاہ اسماعیل کے علاقوں کی سرحد پر لوٹ مار کی تھی۔ جو ایلچی حرجانہ طلب کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے انھیں شیبانی نے بہت اہانت آمیز جواب دیا اور علاوہ ازیں اسماعیل کے پاس ایک کشکول گدائی بھیجا۔ یہ ایک کنایہ تھا اس مقدس فقر و ناداری کی طرف جو ہمیشہ سے اس خاندان کا طرّہ امتیاز تھی جس سے متعلق ہونے کا یہ شاہِ ایران دعوا کرتا تھا۔ اسماعیل نے ازبک سردار کے اس طنز کو ظاہری انکساری سے برداشت کیا اور کہا کہ اس کا ارادہ روضۂ امام رضا کی زیارت کو جانے کا ہے اور یہ کہ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر وہ خان کی خدمت میں بھی حاضر ہوگا۔ اس کے تحفے کے جواب میں اس نے ایک تکلہ اور تکوا اس پیغام کے ساتھ بھیجا:

> " دیکھ! میں ایک مہلک جنگ کے لیے کمربستہ ہوں اور رکابِ نصرت میں پائے عزم رکھ لیا ہے۔ اگر تو ایک مرد کی طرح میدانِ جنگ میں میرے روبرو آئے گا تو ہمارے تنازعہ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر تو ایک گوشے میں چھپ جانا ہی بہتر سمجھے تو میں نے تیرے لیے جو کچھ بھیجا ہے وہ کام آئے گا!"

شاہ اسماعیل اپنے قول کا پکا تھا۔ اس نے اپنی فوجوں کو حرکت دی، اپنے حریف کو اچانک جا لیا اور شیبانی کو خراسان کے شمال میں ایک شہر مرو میں دھکیل دیا۔ اس نے ایک اور امدادی فوج کو بھی شکست دی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ازبک قلعہ بند فوج شیبانی کی قیادت میں پُرجوش مزاحمت کر رہی ہے، اس نے ایک چال چلنے کا ارادہ کیا۔ اس نے لکھا کہ اُسے افسوس ہے کہ بعض حالات کی وجہ سے اُسے واپس جانا ضروری ہے اور وہ شیبانی سے ملنے کے لیے فی الحال زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔ لیکن اُمید کرتا ہے کہ

---

[1] ان دو اشخاص کی باہمی کش مکش کے لیے ملاحظہ ہو 'حبیب السیر'، 'عالم آرائے عباسی' اور 'تاریخ رشیدی' ارسکن۔

آئندہ کسی موقع پر اُسے ملاقات کی سعادت حاصل ہوگی۔ اس نے اس طرح کوچ کیا گویا پوری طرح پسپا ہورہا ہے۔ پیچھا کرنے کے لیے شیبانی تیزی سے مرو سے نکلا اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کے ایک سلسلے میں پھنس کر جس کا انتظام بڑی ہوشیاری سے اس کے لیے کیا گیا تھا، وہ اپنی محفوظ پناہ گاہ سے دس بارہ میل دُور نکل آیا اور پھر اچانک اُس نے خود کو ایک دریا اور پوری ایرانی فوج کے درمیان پایا۔ اس کے پیچھے والے پُل پر گھات میں بیٹھے دستوں نے قبضہ کرلیا تھا اور سامنے سے ازبک (شیبانی) پر شاہ اسماعیل کی سترہ ہزار جنگ آزمودہ سوار فوج نے حملہ کردیا۔ ایسے حالات میں مقابلے کا بس ایک ہی نتیجہ ہوسکتا تھا۔ جان توڑ مزاحمت کے بعد شیبانی کی فوج کو شکست ہوگئی۔ وہ اور اس کے تمام سپاہی ایک سرائے میں دھکیل دیے گئے جہاں اُنھیں گھیر لیا گیا۔ ان کا ایک ایک آدمی ختم ہوگیا۔ یہ واقعہ دسمبر ۱۵۱۰ء کے شروع میں پیش آیا۔[1]

شاہ اسماعیل اور شیبانی کی باہمی کش مکش کے اختتام اور اپنے ہیبت ناک حریف کی آخری تباہی کی خبر بابر کو اس مہینہ (دسمبر) کے خاتمہ سے پہلے ہی مل گئی۔ یہ خبر اسے اپنے چچازاد بھائی سے ملی تھی جو کچھ عرصے سے بدخشاں میں اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھا۔[2] ابتدا میں خبر غیر یقینی تھی۔ ویس مرزا نے لکھا تھا:

> "یہ معلوم نہیں کہ شاہی بیگ خاں زندہ ہے کہ مارا گیا۔ تمام ازبکوں نے اموکو پار کرلیا ہے۔ تقریباً بیس ہزار منگول جنھوں نے ازبک کا ساتھ مرو میں چھوڑ دیا تھا قندز آگئے ہیں۔ میں بھی وہاں آگیا ہوں۔"

---

[1] اس جنگ کا ایک عمدہ بیان 'عالم آرائے عباسی' (ورق ۳۱ الف) میں موجود ہے۔

[2] ناصر مرزا کے نکالے جانے کے بعد، اپنی ماں شاہ بیگم کے اصرار پر ویس مرزا نے بدخشاں میں قسمت آزمائی کا ارادہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ ملک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں تین ریاستیں (قایم) ہوگئی تھیں۔ اور ہر ایک ریاست چند طاقت ور اور بہت سے چھوٹے چھوٹے سرداروں کے تحت تھی۔ بہت سی ناکامیوں کے بعد، جن کے دوران اس کی ماں کا انتقال ہوگیا اور وہ خود جیل میں زندہ رہا، اسے اپنے دعوے میں کامیابی ہوئی اور وہ وہاں کا بادشاہ مان لیا گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۹۲۶ھ (۱۵۲۰ء) میں اس کا انتقال ہوا اور پھر بدخشاں بابر کے قبضے میں آگیا۔ (تاریخ رشیدی)

پھر اس نے مشترکہ آبائی ملکتوں کو واپس لینے کی کوشش میں بابر کو شرکت کی دعوت دی تھی۔
. بر کو کسی تحریک کی ضرورت نہ تھی۔ جیسے ہی اسے خبر ملی اس نے کابل کو ناصر مرزا کی
سپردگی میں دیا۔ موسم سرما کے باوجود اپنے دو کم سن بیٹوں ہمایوں اور ناصر مرزا کو ساتھ
لے کر پہاڑوں کو پار کیا اور جنوری ۱۵۱۱ء میں مرزا کے پاس قندوز پہنچ گیا۔ یہاں اس کو
وہ منگول سپاہ ملی جس کا تذکرہ پیشتر کیا جاچکا ہے۔ اس کی زبردست تعداد بابر کے
پانچ ہزار کے مقابلے میں بیس ہزار تھی، اس لیے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے اس
کو تخت سے اُتار کر اس کے مہمان سلطان سعید کو تخت نشین کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لیکن
اپنے محسن کو نقصان پہنچانے میں سلطان سعید نے کسی طرح کا حصہ لینے سے انکار کردیا۔
(وہ رقم طراز ہے:)

"شاہی بیگ خاں کی فتوحات کے طوفان کے دوران جب کہ آفت و تباہی
اور جنگ و جدل کی زبردست لہروں نے منگول خاقانوں کی حیات و
اقبال مندی کے سفینے کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈالا تھا۔ میں نے پوشیدگی و گمنامی
کے تختے پر اپنی جان بچائی اور آخرکار کابل کے جزیرے میں آپہنچا جس کو
بابر بادشاہ نے واقعات کے تیز و تند تھپیڑوں سے اپنے حسنِ تدبیر کے ذریعے
بچالیا تھا اور جہاں وہ خود بھی موجود تھا۔ اس جزیرے میں بابر نے اپنے
انتہائی لُطف و کرم کے تحت میری حفاظت کی۔ اب جب کہ مجھے ساحل برومندی
مل گیا ہے یہ کس قدر احسان فراموشی ہوگی کہ میں ایسا ذلیل کام کروں!"[1]

اس کی اپنی درخواست پر، اُسے اور اس کے حد سے زیادہ پُرجوش تابعین کو اندجان بھیج
دیا گیا جہاں مرزا حیدر کا چچا ازبکوں کو باہر نکالنے میں مشغول تھا اور مدد کے لیے بُلا رہا تھا۔
بابر خود حصار کی طرف بڑھا اور دریائے امو کو پار کیا لیکن اُسے معلوم ہوا کہ اپنی
شکست کے باوجود اس علاقے کے ازبک اب بھی بہت طاقت ور ہیں۔ اس لیے حلیفوں
کی جستجو میں وہ بغیر جنگ کیے واپس قندوز لوٹ آیا۔ جس موقع کی وہ تلاش میں تھا وہ جلد ہی
آپہنچا۔ جب وہ قندوز میں تھا تو شاہ اسماعیل کی ایک فوجی جماعت بدرقہ کی حیثیت سے

---

[1] 'تاریخ رشیدی' [2] ایضاً

بابر کی بڑی بہن خانزادہ بیگم کو بہت احترام کے ساتھ لے کر آئی جو کہ یکے بعد دیگرے اپنے دونوں شوہروں شیبانی اور سیّد ہادی کے لڑائی میں کام آنے کے بعد ایرانیوں کے ہاتھ پڑ گئی تھی۔ اسی وقت شاہ اسماعیل کا ایک سفارتی وفد دوستی کی پیش کش لے کر آیا۔ اس طرح آخرکار اسے وہ حلیف مل گئے جن کی وہ تلاش میں تھا۔ بابر نے فوراً وَیس مرزا کو تحائف و شکریے کے ساتھ بھیجا۔ یہی وہ تحفے تھے جن کو ایرانی درباری مورّخین خواندمیر، مرزا برخوردار ترکمان اور مرزا سکندر ایسا خراج تصوّر کرتے ہیں جو ایک سیاسی ماتحت اپنے آقا کو پیش کرتا ہے[1]

شاہ اسماعیل سفیروں سے بہت مہربانی سے پیش آیا اور مطلوبہ امداد فراہم کرنے پر تیّار ہوگیا — لیکن ایک قیمت پر[2] — یہ قیمت قدرے گراں تھی۔ بابر کو اپنے بجائے شاہ کا نام خطبے میں شامل کرنا تھا — سکّوں پر بھی اُسی (شاہ) کا نام کندہ ہونا تھا اور سب سے زیادہ سخت بات یہ کہ سمرقند کی کٹّر سُنّی مملکت میں جہاں بھی بابر نئے علاقے فتح کرے وہاں شیعہ عقاید کی تبلیغ کی ہمّت افزائی کرنی تھی۔ جیساکہ ہم دیکھیں گے یہ آخری شرط ہی وہ چٹان تھی جس سے ٹکراکر بابر کے مقدرات کا سفینہ ٹوٹ گیا۔ اگرچہ شرائط سخت تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وَیس مرزا نے اپنے آقا کی طرف سے اُنھیں قبول کرلیا کیوں کہ فوراً ہی ایک چھوٹی سی کمک اُسے دے دی گئی اور اسماعیل فوج کی ایک بڑی جماعت کو احمد بیگ صفوی، علی خاں استلجو (؟ استاجلو) اور شاہرخ سلطان[3] افشار کی کمان میں تیّار

---

[1] ہندوستانی مورخوں مثلاً ابوالفضل، فرشتہ، و خافی (خوافی) خاں کی پُرزور تردید کے باوجود یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر تعجب کا اظہار کیا جائے۔ اسماعیل کے پاس بابر کی مدد کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ان میں کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ ایک طاقت ور شہنشاہ تھا، دوسرا صرف ایک معمولی حکمراں۔ لیکن اگر بابر ایرانی بادشاہ کو اپنا آقا تسلیم کرلے تو معاملہ ایک دم بدل جاتا تھا۔ اسماعیل پر اپنے باجگزار (ماتحت) کی مدد فرض ہو جاتی تھی۔ ایرانی درباری مورخوں کی کہانی خاص خاص واقعات کی حد تک نہایت معقول معلوم ہوتی ہے اور اس اتحاد کا افسوسناک خاتمہ اس باب میں بابر کی خاموشی کی مکمل توضیح کرتا ہے۔

[2] ایرانی مورخ اس کو بڑے واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی مورخوں نے اور 'تاریخ رشیدی' نے بھی جہاں تک ممکن ہوا اس بات کو ٹال دیا ہے۔

[3] 'حبیب السیر' اور 'احسن السیر' دونوں ہی اسے شاہرخ بیگ کہتے ہیں۔

رہنے کا حکم دے دیا گیا تاکہ معاہدے کی توثیق ہوتے ہی بابر کی مدد کرے۔

اسی درمیان شہزادہ (بابر) بطور خود کام کر رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر حصار کے خلاف بڑھا اور وخش کے نواح میں سرخاب کے نزدیک پڑاؤ ڈالا۔ جہاں دریا پار سے ایک طاقت ور ازبک فوج اس پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

وہ ایک مہینے تک کمک کے انتظار میں پڑا رہا۔ پھر ویس مرزا کچھ ایرانی دستوں کے ساتھ آپہنچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل کے ساتھ معاہدے کی خبر جلد ہی ازبکوں کو مل گئی تھی کیوں کہ انھوں نے ایرانی کمک کے پہنچنے سے پہلے ہی حملے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ایک صبح ازبک دریا پار کر کے بابر پر ٹوٹ پڑے۔ جو فوراً ابدرا کے نزدیک ایک مستحکم مورچے پر ہٹ آیا۔ انھوں نے اس کے میسرہ پر جو کہ ایک پہاڑی پر متعین تھا ایک زوردار حملہ کیا لیکن ایک مختصر سی کامیابی کے بعد کوئی خاص نتیجہ پیدا کرنے سے قاصر رہے[1] تب وہ اُلٹے قدموں واپس لوٹے کیوں کہ پانی کی غیر موجودگی کی وجہ سے پڑاؤ ڈالنے کا سوال نہ تھا اور جیسا کہ عام طور سے مشرقی فوجوں میں ہوتا ہے۔ پسپائی نے تعاقب کی وجہ سے بھگدڑ کی صورت اختیار کرلی۔ تمام فوج منتشر ہوگئی، خاص خاص بیگ گرفتار ہو گئے اور بابر نے اُنھیں فوراً قتل کرادیا۔ اس کے بعد وہ حصار کی طرف بڑھا۔

اب پادشاہ (بابر) کو اپنے نئے حلیف اور آقا شاہ اسماعیل کا خیال آیا۔ اس نے فوراً مجوزہ معاہدے کی توثیق کرتے ہوئے ایک فوری و موثر اعانت کی درخواست کی اور یہ اُمید ظاہر کی کہ پورے ماوراءالنہر پر بہت جلد قبضہ ہوجائے گا۔ نیز یہ وعدہ کیا کہ نہ صرف سکوں پر بارہ اماموں کی شبیہ کندہ کی جائے گی بلکہ وہ خود شیعہ لباس بھی پہنے گا۔ اس کے بدلے میں شاہ اسماعیل نے ایک طاقت ور فوج بھیجی جو اسی مقصد کے لیے تیار ہوئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کردی کہ بابر معمول کے مطابق، اپنی

---

[1] حیدر مرزا نے ابدرا کی جنگ کا دل چسپ حال دیا ہے جو چشم دید ہے۔ وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ جب بابر کے میسرہ کو جو ویس مرزا کی قیادت میں تھا ازبکوں نے پہاڑی پر چڑھ کر پیچھے دھکیل دیا تو اس کے سپاہیوں کے ایک دستے نے جان احمد اتکہ کی سرداری میں توازن قایم کیا۔

—— 'تاریخ رشیدی'

'موروثی مملکتوں' یعنی بظاہر فرغانہ اور کابل میں اپنے نام سے ہی سکے چلائے[1] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو علاقے فی الحال ازبکوں کے قبضے میں تھے اُن میں سے جو علاقے بابر واپس لے گا صرف اُن میں ہی وہ شاہ اسماعیل کا باجگزار ہوگا۔

اپنے حلیفوں و معاونوں کی طاقت ور جماعت کے ساتھ بابر سیدھا بُخارا کی طرف بڑھا۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا راستے سے ازبکوں کو ہٹاتا گیا۔ مگر اس کا اپنا نام اس کے لیے بہت سی فوجوں سے زیادہ کام کر رہا تھا۔ شہر و دیہات کے لوگوں نے یکساں طور پر انتہائی پُرجوش خیر مقدم کیا۔ بُخارا نے آسانی سے اطاعت قبول کر لی اور بابر نے اب خود کو اتنا طاقت ور محسوس کیا کہ اپنے ایرانی مددگاروں کو شکریہ و انعام کے ساتھ واپس بھیج دے۔ یہ لوگ چونکہ کٹر شیعہ تھے اس لیے غیر مصالحت پسند سُنّیوں کے اس ملک میں بابر کے لیے ان ایرانی اتحادیوں کی موجودگی لازمی طور پر تشویش کا باعث رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ ان کا وجود بابر کو مستقل طور پر یاد دلاتا رہتا تھا کہ وہ شاہ اسماعیل کا باجگزار ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سمرقند میں اپنے 'ورودِ مسعود' کی عظمت و شوکت کو جس کا وہ مدت سے متمنی تھا، اپنے ایرانی دوستوں کی موجودگی سے تباہ کر دے۔ لیکن اگرچہ وہ چلے گئے مگر اپنے پیچھے اپنے آقا کے نمایندے محمد جان کو چھوڑ گئے جس کا احساس بابر کو جلد ہی کچھ نقصان اُٹھا کر ہونے والا تھا۔ بہر حال فی الوقت آسمان پر کوئی بادل نہ تھا۔ فتح و نصرت کے ان اوقات میں بابر اپنے چچازاد بھائی ونیس مرزا کے حقوق کو نہ بھولا اور اسے حصار، شادماں، ختلان اور بدخشاں کی حکومت کے منصب پر مستقل کر دیا۔

بُخارا سے بابر سیدھا شہرِ تیمور گیا جس نے اس کی بہت سی کامیابیاں و ناکامیاں دیکھی تھیں۔ وہ اکتوبر ۱۵۱۱ء میں نو سال کی غیر حاضری کے بعد پھر سمرقند میں داخل ہوا۔ لوگوں نے خلوص دل سے خوشیاں منائیں۔ جیسا کہ مرزا حیدر کہتا ہے:

> "ماوراء النہر کے شہروں کے تمام باشندے اعلا و ادنا، امیر و غریب، اکابرین و اہلِ حرفہ، شہزادے اور کسان، سبھی نے شہنشاہ کی آمد پر اپنی مسرّت کا ثبوت دیا۔ اُمرا نے اس کا استقبال کیا جب کہ دوسرے طبقات کے لوگ

---

[1] 'حبیب السیر' و 'احسن السیر'۔

شہر کو سجانے میں مشغول تھے۔ سڑکیں اور بازار زربفت و کمخواب سے
ڈھک دیے گئے اور ہر طرف نقوش اور تصویریں آویزاں کی گئیں۔ وسط
رجب ۹۱۷ھ میں بادشاہ ایسی شان و شوکت کے درمیان شہر میں داخل
ہوا جو اس سے پہلے یا اس کے بعد نہ کسی نے کبھی دیکھی نہ سنی۔ فرشتوں نے
ندا دی 'اُدْخُلُوْا مِنْ سَلَامَتی' (امن و سلامتی سے داخل ہو) اور لوگوں
نے صدا دی' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن'۔ ماوراالنہر کے لوگ، خاص طور
سے سمرقند کے باشندے برسوں سے اس کی آمد کے آرزومند تھے تاکہ اس کا
ظلِ عاطفت ان پر پڑے۔"

یں ہمہ تخریب کے عناصر پہلے ہی موجود تھے۔ مرزا حیدر آگے لکھتا ہے:

"اگرچہ وقتِ ضرورت بادشاہ نے شیعوں کا لباس پہن لیا تھا جو کہ خالص
رفض و بدعت بلکہ تقریباً کفر ہے، تاہم لوگوں کو اُمید تھی کہ جب وہ سمرقند
کے تخت پر متمکن ہوگا اور سر پر مقدس سُنّت محمدیؐ کا تاج رکھے گا تو شاہ
کا نشان اُتار پھینکے گا۔ لیکن اہلِ سمرقند کی اُمیدیں بر نہ آئیں کیوں کہ ابھی
شہنشاہ خود کو شاہ اسماعیل کی اعانت سے بے نیاز ہونے کا اہل نہیں محسوس
کرتا تھا اور نہ خود کو اتنا طاقت ور ہی محسوس کرتا تھا کہ تن تنہا ہی ازبکوں
سے نپٹ سکے۔ اس لیے لگتا تھا کہ وہ شیعوں کی فاش غلطیوں کو نظرانداز کر رہا
تھا۔ اسی سبب سے ماوراالنہر کے باشندوں کے دلوں میں بابر کے لیے وہ
شدید اشتیاق باقی نہ رہا جو وہ اس کی عدمِ موجودگی کے زمانے میں محسوس
کرتے تھے۔ اس کے لیے ان کی عقیدت ختم ہوگئی۔"[1]

مرزا حیدر نے سمرقند میں بابر کی حالت کے کمزور پہلو پر اُنگلی رکھ دی ہے ——— بادشاہ
واقعی ایک دُشوار صورتِ حال سے دو چار تھا۔ ازبک اب بھی طاقت ور تھے اور ازبکوں کے
خلاف کسی پیش قدمی کا تو ذکر ہی کیا! خود اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی واحد
اُمید اس پر منحصر تھی کہ یا تو خود اپنے سمرقندی عوام کے ساتھ یا پھر شاہ اسماعیل اور اس کے

---

[1] 'تاریخ رشیدی' مترجم الیاس اور راس۔

ایرانیوں کے ساتھ ایک قریبی اور گہرا اتحاد قایم کرے۔ لیکن ان دونوں راستوں میں سے ہر ایک میں ناقابلِ عبور دشواریاں حائل تھیں۔ بابر اپنی بات کا پکّا تھا۔ وہ شاہ سے عہد و پیمان کر چکا تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین بات یہ کہ اس نے شاہ کے مذہب کی حمایت کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ خود کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا کہ اسماعیل کے مذہبی تبلیغی جوش کا ایک اطاعت شعار آلۂ کار بن کر خود اپنے عوام کی نفرت کا نشانہ بن جائے۔ شیعوں کا لباس پہننا اور شیعہ نشانات اپنے سکّوں پر کندہ کرانا بھی کافی خراب بات تھی۔[1] اُس نے (سُنّیوں کو) اذیت پہنچانے سے انکار کر دیا اور یہ ایذا رسانی ہی وہ واحد ذریعہ تھی جو اس کو اپنے آقا کی نظروں میں حقیقی الطاف کا مستحق بنا سکتا تھا ـــــ وہ آقا جس نے مخالف فرقے کے صُلحا و عُلما کے ساتھ اپنے وحشیانہ سلوک سے دُنیا کو دہلا دیا تھا۔ اگر بابر اپنے عہد و پیمان کو توڑنے پر تیار ہو جاتا تو شاید سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ یہ کسی خطرے کا خیال نہ تھا جس نے اس کو ایسا کرنے سے باز رکھا بلکہ بات صرف یہ تھی کہ اس نے قول دے دیا تھا۔ بایں ہمہ اگرچہ وہ شاہ اسماعیل کے ساتھ عہد و پیمان میں بندھا ہوا تھا تاہم اس کو جو تحقیر آمیز حیثیت دے دی گئی تھی اس پر اس نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا جو یقیناً غیر فطری نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کے زمانے میں انگلستان کے جیمس دویم کی طرح بابر کو ایک غیر مقبول طاقت کے ساتھ اتحاد کی ساری عوامی نفرت تو برداشت کرنا ہی پڑی لیکن اُس کی خودداری نے اس اتحاد کے فوائد کو قبول کرنے سے اسے باز رکھا۔

اس طرح اگر ایک طرف ایران سے تعلقات کی بنا پر سمرقندیوں میں اس کی مقبولیت مستقل طور پر کم ہوتی گئی تو دوسری طرف شاہ ایران بھی اس سے اس بنا پر ناراض ہو گیا کہ اس نے ایرانی ایلچی محمد جان کے ساتھ کچھ ایسا خود مختارانہ اور آزادانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس کو اس غیظ آلود سردار نے بڑھا چڑھا کر ارادی و دانستہ اہانتوں کے ایک سلسلے سے تعبیر کیا۔ ایرانی دربار کو اطلاع دی گئی کہ نیا حکمراں مغرور اور عہد شکن ہے اور اپنے حکمرانِ اعلا کے خلاف باغیانہ ارادوں کی پرورش کرتا ہے ـــــ شاہ اسماعیل نے سخت عتاب کے عالم میں مُجرم کو فرماں برداری کا سبق سکھانے کے لیے اپنے مشہور

---

[1] ملاحظہ ہو آر. ایس. پول: ایرانی سکّوں کا کیٹلاگ۔ ۱۸۸۷ء، ص ۲۴

سالار میر نجم ثانی[1] کو روانہ کردیا۔

لیکن اس سے قبل کہ گیارہ ہزار سپاہیوں کی ایرانی تعزیری فوج ضرب لگانے کے حدود میں داخل ہو سکے معاملات کی شکل و صورت پر ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ ازبک سرداروں خصوصاً عبیداللہ خاں نے ایرانی افواج کی واپسی سے اور ایک طرف بابر اور سمرقندیوں کے درمیان اور دوسری طرف بابر اور شاہ کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی سے ہمت افزائی پاکر از سرنو اپنے حملے شروع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے ایک زبردست فوج جمع کرلی اور اچانک ایک آڑن دستے کو بخارا کی طرف بھیج دیا۔ بابر نے اپنے چند وفادار ساتھیوں کو لےکر، جن کے علاوہ سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا دشمن پر جانبازانہ حملے کا ارادہ کرلیا۔[2] اس معاملے میں بابر نے محمد فرید ترخان کے مشورے کے خلاف عمل کیا جس نے توقف کرنے کی صلاح دی تھی۔ لیکن شہزادہ اس قدر بے تاب تھا کہ مزید انتظار نہ کرسکتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ازبکوں کی تعداد کم ہے۔ وہ بخارا کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن جب وہ اس کے نواح میں کُل مُلک پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ ازبک ہراول لشکر کی مدد کو ایک طاقت ور فوج محمد تیمور سلطان، جانی بیگ اور عبیداللہ خاں کے زیر کمان پہنچ گئی ہے۔ وہ پوری طرح پھنس گیا تھا لیکن اپنی قسمت کو آزمانے پر تُلا ہوا

---

[1] اس شخص کی شان و شوکت، شاہ خرچی اور شاندار حرم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'حبیب السیر' اور 'احسن السیر'۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے حرم کا کھانا پکانے میں روز ۱۳ خالص چاندی کی کیتلیاں (دیگچی؟) ضایع ہوتی تھیں۔ 'احسن السیر' میں مندرجہ ذیل کہانی درج ہے:

"اپنے ایک دیانت دار دوست سے سننے میں آیا کہ دریا کے دوسری طرف میر نجم کے باورچی سے کسی نے پوچھا کہ دشمن کے مُلک میں تُمہیں کہاں سے اتنے مسالے مل جاتے ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا کہ خدا کے فضل سے میرے پاس بکریاں، مُرغیاں، شکر، چاول اور پکانے کے برتن بے شمار ہیں مگر چونکہ مجھے روز دس من دار چینی، زعفران، ادرک، سویا، دھنیا اور دوسرے مسالے درکار ہوتے ہیں، اس لیے کبھی کبھی دقت ہوجاتی ہے۔"

[2] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدر مرزا نے اپنے مذہبی جوش میں گمراہ ہوکر یہ دعوا کیا ہے کہ تعداد میں بابر کی فوج ازبکوں سے زیادہ تھی۔ 'حبیب السیر' اور 'احسن السیر' دونوں نے اس نکتے پر زور دیا ہے۔

تھا۔ ہمارے پاس کُل مَلِک کی اس جنگ کا کوئی اطمینان بخش تذکرہ نہیں ہے[1] لیکن یہ ظاہر ہے کہ بابر نے حسب معمول اپنی بہادری کا ثبوت دیا اور اس امر سے کہ وہ بُخارا میں واپس آجانے اور بعدہٗ کسی نقصان کے بغیر پسپا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بابر کی فوج کی تعداد کم ہونے کے باوجود مقابلہ غیر مساویانہ نہیں تھا۔ لیکن وہ پُر سرعت مرحلوں میں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔ نہ صرف بُخارا بلکہ سمرقند بھی اس کی گرفت سے نکل گیا اس لیے وہ اپنے متعلقین کو لے کر حصار چلاگیا۔ یہاں اُس نے اپنے کو مضبوطی سے قلعہ بند کرلیا۔ شہر کے چاروں طرف خندق کھودنے کا حکم دیا اور سڑکوں کو الگ الگ حصّوں میں بانٹ کر ہر ایک پر نگراں مقرر کر دیے۔ اس کو بہرام بیگ کی طرف سے ایک مختصر سی کمک ملی جس نے امیر سلطان محمد شیرازی کو تین سو سپاہیوں کے ساتھ بھیجا تھا۔

ازبکوں نے اُس پر (بابر پر) حملہ نہیں کیا بلکہ سمرقند پر دوبارہ قبضہ کرکے مطمئن ہوگئے۔ چنانچہ جب نجم ثانی خراسان کی سرحد پر پہنچا تو یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ جس باغی شہزادے کو وہ سزا دینے آیا تھا وہ اب مفرور تھا۔ ازبک لوگ شاہ اسماعیل کے بھی اتنے ہی دشمن تھے جتنے بابر کے تھے۔ اس لیے بابر کے خلاف آنے والی اس تعزیری فوج کو اس کی ایک امدادی فوج میں تبدیل ہونا پڑا[2] جب ان اتحادیوں کی فوجیں آپس میں مل گئیں تو وہ بُخارا کی طرف بڑھیں اور خضر پر قبضہ کرلیا۔ بابر کے لیے یہ امر غم و غصے کا باعث تھا کہ ایرانی فوج جس علاقے سے گزرتی وہاں کے بدقسمت باشندوں پر شدید سزائیں نازل کرتی تھی۔ جب قرشی کا دفاع توڑ کر اس پر یلغار کی گئی تو ایرانیوں نے صرف ازبک حفاظتی فوج کو تلوار کے گھاٹ اُتارنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام آبادی کا قتلِ عام شروع کر دیا گیا۔ بابر جو ایرانی ہاتھوں میں عملی طور پر ایک قیدی تھا چار و ناچار اس المیے کا

---

[1] 'حبیب السیر' و 'احسن السیر'۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ کُل مَلِک میں بابر کو فتح ہوئی لیکن ستاروں کے منحوس اثر کی وجہ سے پسپا ہونا پڑا۔

[2] میر نجم نے اپنے مخصوص تکبّر سے کام لے کر مستقر سے اپنے احکام کی تصدیق آنے کا انتظار کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بلا ٹک اور سوچے سمجھے بغیر" اس خطرناک اور نہایت مصیبت ناک مہم کو ایک آسان و معمولی معاملہ شمار کر کے" تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

تماشائی بنا رہا۔ نجم ثانی اب بُخارا کی طرف ایک اور منزل بڑھا لیکن غزدواں جیسے چھوٹے سے شہر کی حفاظتی فوج کی جانبازانہ مزاحمت نے اس کو روک دیا۔ خواجہ کمال الدین محمد (؟ کمال الدین) کے مشورے کے خلاف جو ازبک طریقۂ جنگ سے واقف تھا، نجم نے محاصرہ جاری رکھنے کا تہیہ کرلیا محافظ فوج کے پاس وافر سامانِ ضرورت موجود تھا اور خود اس کی اپنی فوج میں سامانِ رسد کی کمی پڑ رہی تھی۔ جب خاصی مدت بعد شاید چار ماہ گزرنے کے بعد' بابر نے بھی یہی صلاح دی تو ایرانی سالار کو کچھ یقین ہوتا نظر آیا لیکن دوسرے ہی دن' اس سے پہلے کہ کوئی قدم اُٹھایا جاسکے، ایک زبردست ازبک فوج آپہنچی۔ عبید اللہ خاں محصور حفاظتی فوج کی امداد کے لیے بُخارا سے آگیا تھا۔ اگرچہ ایرانی فوج شہر کے نواح میں پھنسی ہوئی تھی مگر جنگ کا جُوا کھیلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ نجم سے لوگ اس کے تکبّر کی وجہ سے نفرت کرتے تھے، اس لیے اُس کے سرداروں نے مناسب طور پر اس کا ساتھ نہ دیا۔ ایرانی فوج میں ابتری پھیل گئی اور ان کا سپہ سالار مارا گیا۔ بڑی دُشواری سے بابر جو فوج ساقہ کی قیادت کر رہا تھا پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہوا[1]

ایرانی مورخین[2] اپنی فوجوں کی شکست کا الزام بابر کی غداری سے منسوب کرنے پر مُصر ہیں۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بابر نے جنگ میں کوئی حصّہ نہیں لیا، لیکن ایک طرف تو وہ فوج محفوظہ کے ساتھ مامور تھا، دوسری طرف وہ ایرانی فوجوں کے ہاتھوں میں عملی طور پر ایک قیدی تھا۔ لہٰذا یہ حیران ہونے کی بات نہیں کہ اس نے ازبکوں کی فتح کو ترجیح دی ہو، جن کی بہ حیثیت دُشمن وہ عزّت کرتا تھا، بجائے ایرانیوں کی فتح کے جن سے بہ حیثیت دوست وہ نفرت کرتا تھا۔ روایت ہے کہ جنگ سے پہلے والی رات کو اُس نے ازبک پڑاؤ میں ایک تیر پھینکا جس میں یہ شعر بندھا ہوا تھا ؎ (ترجمہ)

" میں نے شاہ کی دولت (نجم) کو ازبکوں کے لیے زادِ راہ بنادیا۔
اگر قصور میرا ہے تو اب میں نے راہ صاف کردی ہے۔"[3]

---

[1] 'احسن السیر' اور 'حبیب السیر'۔

[2] 'عالم آرائے عباسی' میں اس طرح کا اشارہ موجود ہے: اور جب ہمایوں نے ایران میں پناہ لی تو کھلم کھلا باپ کی غداری کے اسے طعنے دیے گئے۔ بدایونی، منتخب التواریخ۔ ببلیوتھیکا انڈیکا ورق ۴۴۴

[3] اے۔ ایس۔ بیورج۔ ص ۳۶۱

لیکن بے عملی کے علاوہ اور کوئی الزام بابر پر عائد کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اس کے زبردست احساسِ شرافت و دیانت کے علاوہ اس کی کمزور حالت بھی اس کو ایرانی لشکر کی تباہی کے لیے کچھ کرنے سے روکتی تھی۔

نومبر ۱۵۱۲ء کی اس جنگ کے بعد بابر پھر ایک دفعہ حصار لوٹ گیا۔ یہاں وہ اپنے ملازم منگول سپاہیوں کی ایک سازش میں جن کو اس نے کھلے عام بداعمالی کا مُجرم ٹھہرایا تھا، قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ وہ رات کی تاریکی میں صرف اپنی جان لے کر فرار ہوگیا۔ اس واقعے نے اس کو حصار سے قندز جانے پر مجبور کر دیا جہاں وہ ویس مرزا سے جا ملا۔

۱۵۱۳ء کے پورے سال کے دوران اس کی حرکات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ مرزا حیدر کہتا ہے کہ اس کا بیشتر وقت قندز میں گزرا جہاں اسے سخت ترین مصائب و تکالیف اُٹھانا پڑیں۔ اس نے ان سب اذیتوں کو حسبِ عادت بہت صبر سے برداشت کیا لیکن آخرکار حصار کو واپس حاصل کرنے کے تمام امکانات سے مایوس ہوکر اس نے کابل جانے کا ارادہ کر لیا۔[۱]

اس طرح اپنے مورثِ اعلا تیمور کا شہر سمرقند حاصل کرنے کے لیے بابر کی آخری کوشش ناکامی پر ختم ہوگئی۔ ۱۵۱۰ء میں کابل چھوڑنے کے بعد سے تباہیوں کا جو طویل سلسلہ اس پر نازل ہوا تھا وہ کسی طرح بھی نہ تو اس کی خوش طبعی کو کم کر سکا تھا اور نہ اس کی اولوالعزمی کی تیزی کو کند کر سکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ تین خوفناک سال اس پر اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ شاید سمرقند پر اپنے پُرآشوب تسلط کے زمانے میں ہی اُس نے پہلی بار جامِ شراب میں اپنی پریشانیوں سے پناہ تلاش کی تھی۔ اس زمانے سے وہ ایک بلانوش تو نہیں البتہ ایک عادی بادہ نوش بن گیا اور شراب کی محفلوں میں ایک عجیب مسرت محسوس کرنے لگا اور اگرچہ شراب نے اُس کی درخشاں صلاحیتوں کو ماند تو نہیں کیا لیکن تقریباً یقینی طور پر اُس کی عمر کم کر دی۔

حسبِ معمول عقل مندی سے کام لے کر وہ پھر ایک بار ایک معمولی سے شہزادے کی زندگی بسر کرنے لگا جس کو دُنیا میں کوئی بھی شکوہ نہ ہو۔ خانگی معاملات زیادہ اہمیت اختیار کرنے لگے ــــ اس کے دو اور بیٹے پیدا ہوئے ــــ عسکری ۱۵۱۶ء میں اور ہندال

---

[۱] 'تاریخ رشیدی'۔

۱۵۱۹ء میں ـــــ علاوہ ازیں خود اپنے خاندانی افراد سے بھی اس کے تعلقات پُر امن رہے ۔ ناصر مرزا نے ایک نادر مصلحت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے خوشی سے کابل کی سلطنت چھوڑ دی۔ گرم جوشی سے اپنے بھائی کا خیر مقدم کیا اور اپنی غزنی کی جاگیر پر جانے کی اجازت مانگی۔ یہاں کچھ ہی عرصے بعد یہ شہزادہ اصغر مرگیا اور اس کی موت پر بابر کے خلاف ایک بغاوت مقامی سرداروں میں پھیل گئی جس میں میرشیرم جیسے کچھ اُمرا بھی شامل ہوگئے جنھوں نے تمام زندگی بابر کی خدمت میں گزاری تھی۔ اس بغاوت کی تفصیلات معلوم نہیں، حیدر مرزا اس کا سبب سرکش سرداروں کے دماغ پر شیطان کا اثر قرار دیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اُسے خود ہی معلوم نہ تھا کہ گڑبڑ کس وجہ سے تھی؟[1] ایک باقاعدہ جم کر لڑائی ہوئی جس میں بابر نے بیشتر ذاتی دلیری و بہادری سے فتح پائی۔ منگول دستے جو سارے فساد کے خاص عناصر تھے، جب منتشر کر دیے گئے تو تقریباً ایک سال تک سکون رہا۔ ۱۵۱۶ء کے پورے سال میں بابر کی کچھ بھی قابلِ ذکر سرگرمیاں نظر نہیں آتیں لیکن ایک موضوع ایسا ہے جس کا اس موقع پر تذکرہ ضروری ہے۔

شاید منگول سپاہیوں کے حالیہ ہنگامے کے بعد ہی بابر کو اپنی فوج کی کارکردگی بڑھانے کی ضرورت کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ یقینی امر ہے کہ اس کی نظر میں اپنے سابق رفیق شاہ ایران کی وہ شاندار فوجی اصلاح تھی جو اس وقت بڑے جوش سے عمل میں لائی جارہی تھی۔ یہ اصلاح اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ فوج میں آتشی اسلحے کا استعمال شروع کیا جائے اور اُس طریقۂ جنگ کو اختیار کیا جائے جو آتشی اسلحے کی وجہ سے ممکن ہوگیا تھا ـــــ اصلاح کا یہ جوش دراصل نتیجہ تھا ایک بہت ہی ناخوشگوار تجربے کا جو شاہ اسماعیل کو ۱۵۱۴ء میں پیش آیا تھا۔ اس زمانے میں جب تہران اور قسطنطنیہ کے درباروں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی تو شاہ اسماعیل، سلطان سلیم سنگدل کی حملہ آور فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے علاقے کی سرحدوں کی طرف بڑھا۔ دونوں فوجیں جن کی تعداد تقریباً برابر تھی چالڈرن پر آمنے سامنے ہوئیں۔ شاہ اسماعیل نے اپنی شاندار فوج کے ساتھ حملہ کیا مگر جب اس کا جواب ترکوں کے نئے توپخانے اور چھوٹے آتشی ہتھیاروں نے دیا تو وہ اپنے طریقۂ جنگ

---

[1] "تاریخ رشیدی"۔

کو ان کے سامنے ناکارہ پاکر سراسیمہ ہوگیا۔ ایرانی فوجوں کو شکست فاش ہوئی ۔ شاہ اسماعیل خوش قسمت تھا کہ اپنی جان لےکر بچ نکلا۔ نتیجتاً اس نے نیا طریقۂ جنگ خود سیکھنے کا ارادہ کرلیا اور اس مقصد کے لیے اس نے ماہر ترکی توپچیوں اور بندوقچیوں کو اپنی فوجوں کی تربیت کے لیے باہر سے بلاکر رکھا۔

بابر نے تب شاہ اسماعیل کی مثال پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا اور ۱۵۱۴ء و ۱۵۱۹ء کے درمیان کسی زمانے میں ایک عثمانی ترک اُستاد علی کی خدمات حاصل کیں جو اس کے محکمۂ ذخائر حربی کا ناظم بن گیا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس معاملے میں 'تزک بابری' ہماری رہنمائی نہیں کرتی، کیوں کہ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اُستاد علی کی آمد کا دن بابر کے لیے ایک سُنہرا دن تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اُسی دن سے بابر کی غیر فانی شہرت کی ابتدا ہوئی۔ اگر کوئی ایک شے ایسی ہوسکتی ہے جو ہندوستان میں بابر کی آخری فتح و کامرانی میں دُنیا کی کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ مدد و معاون ہوئی تو وہ اُس کا طاقت ور توپخانہ تھا اور یہ نکتہ بھی بے معنی نہیں کہ جب تک بابر کو ایک اور ترکی ماہر مُصطفےٰ کی خدمات حاصل نہ ہوئیں، جو اس کے پاس ۱۵۲۰ء اور ۱۵۲۵ء کے درمیان آیا تھا اس وقت تک ہندوستان پر حملہ نہیں کیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب شہزادے نے یہ طے کرلیا تھا کہ اگر اُسے کابل کے باہر ہی کسی جگہ قسمت آزمائی کرنا ہے تو مغرب کی بجائے مشرق میں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۱۵۱۷ء میں ہم اُسے پھر قندھار پر حملہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ لیکن بیماری کی وجہ سے یہ جنگی کارروائیاں درمیان ہی میں رُک گئیں اور وہ ارغون سے تحائف حاصل کرکے واپس لوٹ گیا۔ اگلے سال ۱۵۱۸ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پھر مشرق کی طرف ہندوستان جانے والے راستے پر نظریں ڈال رہا ہے۔ کابل کے شمال مشرق میں چغان سرائے جیسے الگ تھلگ قلعوں کو تسخیر کر رہا ہے اور افغان قبیلوں کے قدیم خاندانی جھگڑوں میں حصّہ لے رہا ہے۔

تزک میں واقعات کا جو سلسلہ گیارہ سال سے ٹوٹا ہوا تھا وہ ۱۵۱۹ء کے آغاز سے پھر شروع ہوجاتا ہے ——— لیکن بدقسمتی سے صرف تیرہ مہینے کی مدّت کے لیے ——— اس زمانے کے اندراجات جو بہت منتشر و مختصر ہیں، بدیہی طور پر صرف اس مقصد سے پیش کیے گئے ہیں کہ جامع تر تذکرے کے لیے خام مواد کا کام دے سکیں۔ جب تزک دوبارہ

شروع ہوتی ہے تو اس وقت بابر قلعہ باجور کے محاصرے میں مشغول ہے۔ ایک پُر جوش کش مکش کے بعد جس میں نئے توپخانے نے اہم کردار ادا کیا، اس نے یلغار کر کے اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔

" (۱۰ جنوری) ۵ محرم کو جمعہ کے دن صبح صادق کے وقت احکام دیے گئے کہ جیسے ہی جنگ کے نقارے بجیں فوج پیش قدمی شروع کر دے۔ ہر شخص اپنی جگہ سے اپنے متعینہ مقام پر پہنچ جائے اور سب جمع ہو جائیں۔ میسرہ اور قلب اپنی جگہ سے آگے بڑھے اس طرح کہ گولیوں کو روکنے والی ٹٹیاں ان کی صفوں کی پوری لمبائی میں لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے سیڑھیاں لگائیں اور اُن پر چڑھ گئے۔ قلب کے دستے کو شاہ حسن ارغن اور احمد یوسف کی کمان میں یہ حکم ہوا کہ بائیں بازو کو کمک پہنچائیں۔ دوست محمد کے آدمی قلعے کے شمال مشرقی برج کے نیچے تک جا پہنچے اور اس کی بنیادیں کھودنے اور گرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اُستاد علی قلی بھی وہاں موجود تھا، اس نے اپنی توڑے دار بندوق سے اُس دن خوب نشانے لگائے اور دو دفعہ 'فرنگی' کو بھی چلایا۔ ولی خزانچی نے بھی اپنی بندوق سے ایک آدمی کو مار گرایا۔ قلب کے بائیں بازو سے ملک علی قطنی (قطبی) سب آدمیوں سے پہلے ایک سیڑھی پر چڑھ گیا اور وہاں حرب و ضرب میں مشغول ہو گیا۔ قلب کے مورچے پر محمد علی جنگ اور اس کا چھوٹا بھائی نوروز الگ الگ سیڑھیوں سے اوپر چڑھ گئے اور شمشیر و نیزے سے کام لیا۔ منتظر بابا ایک اور سیڑھی سے چڑھ کر قلعے کی دیوار کو کلہاڑی سے توڑنے لگا۔ ہمارے بہت سے جانباز تیروں کی بارش کرتے ہوئے آگے بڑھے اور کسی دشمن کو سر نکالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باقی لوگ دشمنوں کے حرب و ضرب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور ان کے تیر و تفنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے قلعے کی دیواروں کو توڑنے اور گرانے میں مشغول رہے۔ ناشتے کے وقت تک دوست بیگ کے آدمیوں نے شمالی مشرقی برج میں شگاف کر لیا تھا اور اندر داخل ہو کر دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قلب کے لوگ بھی اُسی وقت

سیڑھی کے ذریعے اندر پہنچ گئے لیکن دوسرے والے لوگ اندر پہلے داخل ہوئے۔ خدائے تعالا کی مہربانی و خوشنودی سے یہ مضبوط و مستحکم قلعہ دو یا تین ساعاتِ ہجوم میں فتح ہو گیا۔ جیسا زبردست یہ قلعہ تھا ایسی ہی جدّ و جہد ہمارے جانبازوں نے دکھائی۔ یقیناً انھوں نے خود کو ممتاز کیا ـــــ اور بہادروں کی شہرت و عزّت حاصل کی۔"[1]

نواحی آبادی کو دہشت زدہ کرنے کے لیے باشندوں کا قتلِ عام کیا گیا:

"قلعے پر قبضے کے بعد ہم داخل ہوئے اور اس کا معاینہ کیا۔ دیواروں پر، گھروں، سڑکوں اور گلیوں میں کتنی لاشیں تھیں کہ پڑی ہوئی تھیں! آنے جانے والے لوگ لاشوں پر سے گزر رہے تھے۔"[2]

یہ بے رحمی بے مقصد نہ تھی۔ بابر خود باجور کی تسخیر کو ہندوستان کی راہ پر پہلا قدم سمجھتا تھا۔ اور یہ انتہائی ضروری تھا کہ اس کی راہ میں جو افغان قبائل حایل تھے ان کو وہ واحد قسم کا سبق دیا جائے جس کو وہ سمجھ سکتے تھے ـــــ سالِ پانی پت میں لکھتے ہوئے وہ کہتا ہے:[3]

"۹۱۰ ہجری سے لے کر جب کہ میں نے کابل کی ریاست حاصل کی، ان واقعات کی تاریخ تک جو میں اب لکھ رہا ہوں (یعنی سلطان ابراہیم لودی کی شکست) میں نے ہندوستان کے متعلق سوچنا کبھی ترک نہیں کیا تھا۔ لیکن مجھے کبھی اس کام کو انجام دینے کا مناسب موقع نہیں ملا تھا کیوں کہ کبھی تو میرے بیگ سرداروں کے خوف و خطرے نے مجھے روک لیا اور کبھی میرے اور میرے بھائیوں کے اختلافات نے رُکاوٹ ڈالی۔ آخرکار یہ سب مشکلات بعافیت دور ہو گئیں۔ اعلا و ادنا، بیگ و کپتان کسی کو اس منصوبے کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے میں ۹۲۵ھ میں اپنی فوج کو لے کر روانہ ہوا اور باجور سے ابتدا کی ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت سے ۹۳۲ھ تک میں ہندوستان کے

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۳۶۹، ۳۷۰

[2] ایضاً

[3] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔ السنکی، ص ۳۴۸

معاملات میں سرگرم حصّہ لیتا رہا۔ سات یا آٹھ سال کے عرصے میں پانچ دفعہ میں
بذاتِ خود فوج لے کر وہاں گیا۔ پانچویں دفعہ خدا کے فیض و کرم سے میری ضرب
نے سلطان ابراہیم جیسے زبردست دشمن کو ڈھیر کر دیا اور مجھے ہندوستان
کی وسیع سلطنت حاصل ہو گئی"۔[1]

ان میں سے پہلی دو مہمیں ۱۵۱۹ء کی ہیں اور ان دونوں کی نوعیت اچانک دھاوے کی تھی۔ ابتدائے فروری میں بابر نے ایک مہم یوسف زئی قبائل کے خلاف لے جانے کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے اُس نے ایک افغانی عورت سے شادی کر کے ان میں سے ایک قبیلے سے مصالحت کر لی تھی اور اب باقی کو وہ اپنا اقتدار ماننے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ وہ درۂ قراکوپ سے روانہ ہوا اور سواد کو پار کر کے جب اُس نے خود کو ہندوستان کی سرحد پر پایا تو سندھ کو پار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ جہلم پر آباد بھیرہ کی طرف بڑھا۔ نہ تو راہ میں کوئی رُکاوٹ پیش آئی اور نہ خود اس نے کوئی نقصان پہنچایا کیوں کہ جیسا کہ وہ کہتا ہے :

---

[1] ان مہمات کے متعلق بہت کچھ اُلجھن اور پراگندگی ہے اور متن کا بیان بھی "قولِ راوی" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ابراہیم کے خلاف والی مہم پانچویں تھی مگر باقی چار کے متعلق ماخذوں میں اختلاف ہے۔ مندرجہ ذیل بیانات اس سلسلے میں خاص ہیں :

	ابوالفضل	فرشتہ
پہلی مہم	۔ ۹۱۰ھ ۔ ملتان کی طرف کوچ	۔ ۹۲۵ھ ۔ بھیرہ کی طرف کوچ
دوسری مہم	۔ ۹۱۳ھ ۔ چغان سرائے کی مہم	۔ ۹۲۵ھ ۔ یوسف زئی کے خلاف مہم ۔ پشاور و سندھ۔
تیسری مہم	۔ ۹۲۵ھ ۔ بھیرہ کی مہم	۔ ۹۲۶ھ ۔ بھیرہ و سیالکوٹ کی طرف کوچ
چوتھی مہم	۔ (کوئی ذکر نہیں)	۔ ۹۳۰ھ ۔ لاہور کی آتش زنی اور سرہند کی طرف کوچ۔

خافی خاں نے 'فرشتہ' کا اتباع کیا ہے سوائے دوسری مہم کے جو سرہند کی مہم تھی اور جو خود 'تزکِ بابری' سے مطابقت نہیں رکھتی۔

" چونکہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کا خیال ہمیشہ سے میرے دل میں تھا اور
چونکہ یہ مختلف علاقے ایک زمانے میں ترکوں کے قبضے میں تھے اس لیے میں
اُنھیں خود اپنا تصور کرتا تھا اور اُن کو اپنے قبضے میں کرنے کا فیصلہ کرچکا
تھا ــــ خواہ پُر امن طریقے پر خواہ بہ جبر و قوت ــــ ان وجوہات کی بنا
پر پہاڑی باشندوں سے اچھا سلوک ضروری سمجھ کر یہ حکم دیا گیا ' ان لوگوں
کے مویشی کے گلّوں کو نقصان وگزند، یہاں تک کہ ان کے کپاس کے ڈوڈوں
اور ٹوٹی ہوئی سوئیوں کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔ "[1]

درحقیقت بابر، تیمور اعظم کے اخلاف میں ہونے کی وجہ سے پنجاب پر اپنا حق سمجھتا تھا،
کیوں کہ تیمور نے اُسے فتح کیا تھا۔ بابر کا یہ رویّہ کوئی نمائشی چیز نہیں تھا، یہ بات اِس
پیغام سے صاف صاف واضح ہوجاتی ہے جو اُس نے اپنی فوج کے پیش از پیش بھیرہ کے
لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے بھیجا تھا :

" اس مُلک پر ایک 'ترک' (تیمور) کا تسلط پُرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔
خبردار باش! ــــ خوف و تشویش کو راہ دے کر اس کے باشندوں پر
تباہی نازل نہ ہونے پائے۔ اُس علاقے پر اور اُس کے لوگوں پر ہماری نظر ہے۔
لُوٹ مار ہرگز نہیں ہوگی۔ "[2]

بھیرہ اور خوش آب نے فوراً اطاعت قبول کرلی اور اپنے عمائدین کو کورنش بجالانے کے
لیے بھیجا۔ شاید ان اضلاع کی رضامندانہ اور فوری اطاعت نے ہی بابر کو ان پر اپنا دعوا
باضابطہ شکل میں پیش کرنے کی ترغیب دی۔ جیساکہ وہ کہتا ہے :

" لوگ مستقل کہہ رہے تھے کہ اس سے کچھ نقصان نہیں ہوسکتا اگر امن و صلح
کی خاطر اُن علاقوں میں ایک ایلچی بھیجا جائے جو کبھی 'ترک' کی ماتحتی میں
رہے ہیں۔ "[3]

چنانچہ اُس نے ایک شخص مُلّا مرشد کو زیرِ دعوا علاقوں کی واپسی طلب کرنے کے لیے دربار
دہلی میں بھیجا۔ دہلی کا بادشاہ ابراہیم لودی کس طرح اس عجیب و غریب پیغام کو لانے والے ایلچی

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۳۸۰ [2] ایضاً، ص ۳۸۱ [3] ایضاً، ص ۳۸۴

سے پیش آتا اس کا ہم صرف تصور کر سکتے ہیں۔ غالباً مُلّا مرشد کے لیے بڑی خیریت ہوئی کہ پنجاب کے صوبیدار دولت خاں نے اُسے لاہور میں روک لیا۔

اس اثنا میں بابر نے بھیرہ کو ہندو بیگ کی سپردگی میں دے کر سفر جاری رکھنے کی تیاری کی۔ اس نے کام کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تفریح بھی شامل رکھی ——نیا ملک دیکھنے کے لیے وہ اکثر سیر کو جاتا تھا اور دن کا اختتام ہنگامہ خیز شراب کی محفلوں پر ہوتا تھا جن کا حال اس نے بہت ذوق وشوق سے بیان کیا ہے۔ اس کے روزنامچے کا مندرجہ ذیل اندراج اس کی ایک نمایاں مثال ہے :

> "ظہر کے وقت ہم سیر کے لیے نکلے۔ کشتی پر سوار ہوئے اور عرق پیا گیا.... ہم نے عشا کے وقت تک کشتی میں شراب نوشی کی۔ بعدہٗ ہوش میں کشتی سے اُترے۔ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ مشعلیں ہاتھوں میں لیں اور دریا کے کنارے سے لشکرگاہ کی طرف اس عالم میں روانہ ہوئے کہ اپنے گھوڑوں کے کبھی اس پہلو پر جھک جاتے تھے کبھی اُس پہلو پر اور لگام ڈھیلی چھوڑے ہوئے سرپٹ جا رہے تھے! میں یقیناً بہت نشے میں رہا ہوں گا، کیوں کہ جب دوسرے دن لوگوں نے مجھے بتایا کہ ہم کیمپ میں مشعلیں لیے اور لگام ڈھیلی چھوڑے ہوئے اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے آئے تھے تو مجھے ذرا بھی یاد نہ آیا۔"[1]

اس خاص محفل کے کچھ ہی بعد بابر کابل کے واپس سفر پر روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے ایک گکر قبیلے کو اطاعت پر مجبور کیا اور سندھ پار کرنے کے بعد علی مسجد کی راہ سے ہوتا ہوا امن و سلامتی کے ساتھ اپنے دارالسلطنت پہنچ گیا۔ لیکن یہ مہم بےثمر ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی وہ علاقے جنھوں نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی اس کے نائب ہندو بیگ کو نکالنے کے لیے متحد ہوگئے۔ اس وقت تو بابر نے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا لیکن آئندہ جولائی میں اس نے گردیز کی سرحد پر عبدالرحمان افغانوں پر دھاوا بول دیا اور بعض شورشیں پھیلانے کے جرم میں عبرت ناک سزا دی۔ اسی سال یعنی ستمبر ۱۵۱۹ء[2] میں بابر

---

[1] اے۔ ایس۔ بیو، ج، ص ۳۸۷، ۳۸۸

[2] اے، میرے خیال میں، بابر اپنی دوسری مہم سمجھتا ہے۔ رشبروک ولیم۔

نے یوسف زئی قبیلے کی طرف پھر توجہ دی۔ وہ خیبر کے راستے سے بڑھا اور علی مسجد سے گزرا لیکن ابھی وہ آئندہ مہمات کے لیے پشاور کے قلعے کو اپنا مستقر بنانے کی غرض سے وہاں رسد کا ذخیرہ جمع کرنے کا منصوبہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ اسے بدخشاں میں ہنگاموں کی خبر سن کر لوٹنا پڑا۔ راستے میں شرانگیز قبیلۂ 'ککر' کو سزا دیتا ہوا وہ کابل واپس آگیا۔ بظاہر یہی ہندوستان پر اس کا دوسرا دھاوا تھا۔ اگلے دو تین مہینے سیاسی جوڑ توڑ کی اُلجھنوں ـــ متعدد مہموں ـــ شراب کی محفلوں اور شعرگوئی میں گزرے۔ 'تزک' کے بیانات میں پھر پانچ سال کا وقفہ واقع ہونے سے پہلے بہت سے مختصر اندراجات ہیں جو مصنف کی روز مرّہ زندگی پر بہت کچھ روشنی ڈالتے ہیں اور کہیں کہیں اس طرح کی غیر متعلق دل چسپ باتیں بھی ہیں، جیسے :

" میرا آگے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور آدھا باقی تھا۔ آج جب میں کھانا کھا رہا تھا تو یہ آدھا بھی ٹوٹ گیا"۔[1]

اس کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے کہ یہ ظاہراً غیر اہم باتیں دراصل ایک لبادہ تھیں جس کے نیچے ایک عظیم اُولو العزمی کا جذبہ اور اس کے ساتھ ایک نادر استقلال اور مقصد پوشیدہ تھا۔ اپنی اس تمام خوش مزاجی اور لاپرواہی کے پس پردہ بابر بہت استقلال سے اپنے وسائل منظم کر رہا تھا اور اس عظیم مہم کے لیے راستہ تیار کر رہا تھا جس پر اس کا دل جما ہوا تھا ـــ یعنی اپنے جدِ امجد تیمور کی فتح ہندوستان کا اعادہ ـــ یہ کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ابراہیم لودی سے لڑنے کا خواہش مند تھا۔ اُس کی پہلی منزل پنجاب تھی اور دہلی کے حکمراں خاندان کے ساتھ ایک کش مکشِ موت و حیات شروع کرنے کا ارادہ وہ صرف اسی وقت کرتا ہے جب اس کو اس حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ دہلی کو فتح کیے بغیر پنجاب کو فتح نہیں کر سکتا۔

۱۵۲۰ء میں بابر نے اپنی تیسری ہندوستانی مہم شروع کی۔ باجور علاقے سے ہو کر جس پر اب اس کے نائبین کی حکومت تھی وہ کابل سے نکلا۔ پہاڑوں سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور سیدھا بھیرہ پر چڑھ آیا۔ یہاں جن لوگوں نے اطاعت قبول کرنے کے

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۴۲۴

بعد بغاوت کی تھی انھیں سزا دی اور کچھ افغان لٹیروں کو، جو دیہاتی علاقے کے لوگوں کو ستا رہے تھے نکال باہر کیا۔ اب وہ اُن اضلاع کی طرف بڑھا جنھوں نے اس کے جھنڈوں کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا اور آخر کار سیالکوٹ پہنچ گیا۔ شہر نے فوراً ہی فرماں برداری قبول کر لی اور بابر کے ہاتھوں کوئی نقصان نہ اُٹھایا۔ اس کے برعکس ایک اور مقام سید پور نے مقابلے کو ترجیح دی۔ اس پر فوراً حملہ کیا گیا اور یلغار کے ذریعے قبضے کے بعد باشندوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ عورتوں اور بچّوں کو قیدی بنا کر لے جایا گیا۔ پنجاب میں بابر کتنا اور اندر جانا پسند کرتا یہ ہم نہیں جانتے ــــــ قیاس یہ ہے کہ اُس کا نشانہ لاہور ہی تھا ــ لیکن مقدر یہ تھا کہ اس کے طے شدہ جنگی منصوبے ــــ خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں ــــــ فی الحال تشنۂ تکمیل رہے کیوں کہ اچانک ہی اُسے خبر ملی کہ قندھار کا حکمران شاہ بیگ ارغن اس کے علاقے پر چھاپہ مار رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اپنی جنگی کارروائیوں کے رُک جانے سے بابر کو یقین ہو گیا کہ جب تک قندھار کا کانٹا اس کے پہلو میں پیوست ہے اس وقت تک ہندوستان میں کامیابی کی اُمّید فضول ہے۔ چنانچہ معاملہ فہمی سے کام لے کر جو اس کے کردار کی خصوصیت تھی، بابر نے دانستہ طور پر آئندہ دو سال ارغنوں کے حملے سے اپنا تحفظ کرنے میں صرف کیے ــــ اس نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا اور شاہ بیگ کو میدان سے دھکیل کر خود قندھار میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد بابر نے تُفنگوں اور توپخانے کے ساتھ باقاعدہ شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن تہری فصیل کے اس انتہائی مستحکم قلعے نے اُس کی تمام کوششوں کے خلاف زبردست و کامیاب مزاحمت کی۔ بہرحال وہ قلعے بند فوج کی حالت کو انتہائی مصیبت ناک بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا جب کہ اچانک اس کی فوج میں ایک وبا پھوٹ پڑی اور اُسے محاصرہ اٹھا کر کابل لوٹنا پڑا۔

شاہ بیگ نے بابر کے حلقۂ اثر سے دُور ہٹ جانے کے منصوبوں کو پختہ بنانے کے لیے اس مختصر مہلت سے فائدہ اُٹھایا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ قندھار جلد ہی لازمی طور پر والیِ کابل کے ہاتھ میں چلا جائے گا جس کے لیے یہ مقام بے حد ضروری ہے۔ رہا اس کا اپنا معاملہ تو وہ سندھ پر قبضہ کرنے کی فکر کر رہا تھا اور اس علاقے میں اُس نے پہلے ہی دخل اندازی شروع کر دی تھی۔

۱۵۲۱ء میں بابر پھر قندھار کے علاقے میں داخل ہوا اور بہت کچھ نقصان پہنچایا جس سے آبادی کو بہت تکلیف و مصیبت اُٹھانا پڑی۔ پھر اُس نے قندھار کا محاصرہ کیا اور قلعے بند فوج پر انتہائی دباؤ ڈالا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر اُسے اپنا مقصد حاصل کیے بغیر لوٹنا پڑا۔ اب شاہ بیگ نے ایران کے شاہ اسماعیل کو ہموار کرنے کے لیے زبردست کوششیں کیں کہ اس کی طرف سے اس معاملے میں مداخلت کرے۔ منصوبے کی کامیابی کے اچھے آثار تھے کیوں کہ اس زمانے میں بابر اور شاہ کے تعلقات اچھے نہ تھے، یہاں تک کہ ایک ممتاز ایرانی امیر غیاث الدین محمود بن امیر یوسف پر جب بابر کے طرفدار ہونے کا جھوٹا الزام لگا تو اُسے جیل میں ڈال دیا گیا[1] لیکن والیِ کابل کی خوش قسمتی تھی کہ شاہ اسماعیل دوسرے کاموں میں پوری طرح پھنسا ہوا تھا اور ہرات میں اپنے نائبین کے زبردست اصرار کے باوجود کہ ارغونوں کی مدد کی جائے، اس نے اس کے علاوہ اور کچھ نہ کیا کہ والیِ قندھار پر رحم و کرم کرنے کی سفارش کرتے ہوئے بابر کو مختلف خطوط بھیج دیے۔ بابر نے انتہائی شائستگی سے جواب دیا کہ شاہ بیگ نے شاہ اسماعیل کی اطاعت کا جو فخریہ اعلان کیا ہے وہ محض ایک فریب ہے جو ضرورت پر مبنی ہے اور اس کو حقیقی اطاعت پر مجبور کرنے کا فخر و اعزاز تو میں حاصل کروں گا اور اس نابکار کو شاہ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ ہرات کے اربابِ اقتدار نے پھر احتجاج کیا لیکن اس کے علاوہ اس وقت کچھ اور نہ کیا۔

اگلے سال یعنی ۱۵۲۲ء کے اواخر میں بابر قندھار کے محاصرے کو بڑھا ــــ لیکن ابھی اُس نے کوئی جنگی کارروائی شروع بھی نہ کی تھی کہ اُسے تختِ ایران کے وارث شہزادہ طہماسپ کے ایک افسر دُرمیش خاں کا ایک پیغام ملا جس میں اس کو مطلع کیا گیا تھا کہ شہزادے نے قندھار پر حملے کا منصوبہ بنایا تھا کہ اس طے شدہ شرط پر لوٹ گیا ہے کہ بابر بھی یہی کرے گا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ بابر نے اس صورتِ حال کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ واپس چلا جائے اور کسی اور زیادہ موافق موقعے کا انتظار کرے۔ جیسے ہی وہ واپس ہوا، شاہ بیگ نے، جسے اندیشہ ہو گیا تھا کہ قندھار کو دشمن کے قبضے سے زیادہ عرصے تک بچانا ممکن نہیں، شہر کو ایک شخص مولانا عبدالباقی کے سپرد کر دیا اور اپنے تمام سامان

---

[1] 'حبیب السیر' اور 'احسن السیر'۔

کے ساتھ سندھ کی جانب روانہ ہوگیا۔ مولانا عبدالباقی پر جو اعتماد کیا گیا تھا اس کو دغا بازانہ طور پر پامال کرتے ہوئے اس نے ایک تیز رفتار قاصد بابر کے پاس کابل بھیجا اور شہر اُس کے سپرد کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ بابر سرعت سے واپس آیا اور قلعے کا خراج اطاعت قبول کیا۔ یہ قلعہ اس کے چھوٹے بیٹے کامران مرزا[1] کے سپرد کیا گیا جو ہمایوں سے چند مہینے چھوٹا تھا۔ ایرانی ارباب اقتدار نے اس معاملے پر خوشی کی تقریب منائی اور بابر نے اپنی کامیابی کی اطلاع کے لیے جو ایلچی بھیجا تھا اس کا بڑی تواضع و خوش خلقی سے خیر مقدم کیا۔ اس کامیابی کے بعد جلد ہی گرم شیر کا علاقہ بھی فتح ہوگیا۔

ایک مرتبہ مکمل طور پر قندھار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اُس نے پھر اپنی توجہ ہندوستان کے معاملات کی طرف منعطف کی۔ اس وقت اس ملک میں باہمی عداوتوں اور جھگڑوں کی وجہ سے انتشار کا عالم طاری تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں چند سال سے دہلی کے بادشاہ راجپوتوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے بمشکل ہی ڈٹے ہوئے تھے۔ اب معاملات کو ابراہیم لودی کی بے رحمی اور نخوت نے بد سے بدتر بنا دیا تھا[2] جو کہ اُن افغان جاگیرداروں کو جن کی تلواروں پر اُس کی سلطنت قائم تھی کُھلی بغاوت پر مجبور کر رہا تھا۔ پنجاب کے صوبیدار دولت خاں کی طاقت سے خائف ہو کر اُس نے اُسے دہلی طلب کیا۔ دولت خاں کو اندیشہ تھا کہ اگر اُس نے طلبی کی تعمیل کی تو اُسے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے (اس لیے) اُس نے اپنے بجائے اپنے بیٹے دلاور کو بھیج دیا۔ ابراہیم غضب ناک ہوگیا اور اُس نے دونوں باپ بیٹوں کو تباہی کی دھمکی دی۔ اس پر صوبیدار نے ابراہیم کی اطاعت ترک کردی اور اپنے بیٹے کو بابر کے پاس پیمانِ وفاداری کی پیش کش کرنے اور سلطانِ دہلی کے خلاف مدد طلب کرنے کے لیے بھیجا[3] جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا۔ دولت خاں دراصل پنجاب میں کُھلی آزادی چاہتا تھا جس پر کسی برتر سیاسی شخصیت کی لگام نہ ہو۔ لیکن یہ بات

---

[1] قندھار کی آخری تسخیر کا یہ حال 'احسن السیر' پر مبنی ہے اور اس میں وضاحت کے ساتھ تفصیل دی گئی ہے۔

[2] 'فرشتہ' دوم، ص ۳۸، ۳۹۔ 'تاریخ حقی' ورق ۲۰۵ و آگے۔

[3] 'تاریخ حقی' ورق ۲۸۱

دوسرے منصوبوں کے بھیس میں بہت احتیاط سے چھپائی گئی تھی۔ بظاہر تجویز یہ تھی کہ ابراہیم کو تخت سے اُتار کر اُس کے چچا عالم خاں کو اُس کی جگہ بٹھا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ بابر نے سیاسیات ہندوستان میں دخل اندازی کا یہ ایک اچھا موقعہ تصور کیا اور ۱۵۲۴ء میں وہ ابراہیم کے خلاف عالم خاں کی حمایت کے کھلے ارادے سے اپنی چوتھی مہم پر روانہ ہوگیا۔

...رے گزر کر اس نے گکروں کے علاقے کو پار کیا اور اس علاقے کے ان جنگجو قبیلوں کو عارضی اطاعت پر مجبور کردیا۔ جہلم و چناب دریاؤں کو عبور کرکے وہ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر آپہنچا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ نزدیک ہی ابراہیم کی ایک فوج بہار خاں لودی، مبارک خاں لودی اور کچھ دوسرے افغان امیروں کی ماتحتی میں موجود ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس کے حلیف دولت خاں کو لاہور سے نکال دیا گیا ہے اور بلوچیوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا گیا ہے۔ بابر نے فوراً حملہ کیا اور سلطان دہلی کی فوج کو منتشر کردیا۔ مفرورین کو لاہور میں دھکیل دیا گیا اور شہر بابر کے قبضے میں آگیا۔ بازار کو لُوٹ کر جلا دیا گیا۔ چار دن آرام کرکے کابلی لشکر جنوب میں دیپالپور کی طرف بڑھا، جس پر یلغار کرکے قبضہ کرلیا گیا۔ محصور فوج کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

دیپالپور میں دولت خاں اور اُس کے بیٹے بابر سے آملے۔ اس امیر کو اس بات پر بہت غصہ آیا کہ بابر کا پختہ ارادہ لاہور کو خود اپنے قبضے میں رکھنے کا تھا۔ ظاہر ہے کہ بابر سے اس کا اظہارِ اطاعت صرف شاہ کابل کی مدد حاصل کرنے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دولت خاں کو اُمید تھی کہ بابر اُس کے ہاتھوں میں ایک فرمانبردار آلہ کار بنا رہے گا۔ بدیہی طور پر وہ بھول گیا کہ خود اس کی صوبیداری کا یہ علاقہ پنجاب جس کو وہ خود مختار دیکھنا چاہتا ہے، ہندوستان کا ٹھیک وہی حصّہ ہے جس پر بابر اپنا سب سے بڑا حق سمجھتا تھا۔ بابر نے اپنی جگہ افغان امیر کی اطاعت کو محض خالی ضابطہ نہ سمجھتے ہوئے لاہور کے بجائے اُسے جالندھر اور سلطان پور دے دیے۔ اس پر دولت خاں نے دغابازی سے بابر کو مشورہ دیا کہ اپنی فوجوں کو تقسیم کرکے ایک حصّہ تو ملتان بھیج دے اور ایک اپنے پاس رکھ لے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلاور خاں کو یہ فریب کاری نفرت انگیز محسوس ہوئی۔ اس نے بابر کو انتباہ دیا کہ ہوشیار رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت خاں اور اُس کا دوسرا بیٹا غازی خاں گرفتار کرلیے گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد اُنھیں رہا کردیا گیا اور وہ فوراً پہاڑیوں میں

بھاگ گئے۔ اُن کی جاگیریں دلاور خاں کو عطا کی گئیں۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ایسے مُتلاطم سمندر میں اور آگے بڑھنے کی ہمّت کرنے سے پہلے مزید مناسب وسائل کی ضرورت ہے، بابر پیچھے لاہور کی طرف ہٹ گیا اور پھر کابل واپس چلا گیا۔ دیپالپور جھوٹے حقدار عالم خاں کو دے دیا گیا اور معتمد بابا کشقہ کو اس پر نگراں مقرر کیا گیا۔ لاہور بہت سی محافظ فوج کے ساتھ میر عبدالعزیز کے سپرد ہوا اور سیالکوٹ خسرو کاکلتش کی سپردگی میں دیا گیا۔

بابر جیسے ہی ہٹا دولت خاں نے پر پرُزے نکالے۔ ایک مضبوط فوج جمع کر کے اُس نے خود اپنے بیٹے دلاور خاں کو گرفتار کر لیا اور سلطان پور چھین لیا۔ پھر وہ دیپالپور پر بڑھا اور عالم خاں کو نکال باہر کیا۔ لیکن سیالکوٹ کے سامنے اُسے پہلی بار رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ پانچ ہزار سپاہیوں کے ایک دستے کو جسے اس نے شہر پر حملے کے لیے علاحدہ بھیجا تھا، بابر کی لاہور والی محافظ فوج نے ہرا دیا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد اُس نے ایک بڑی کامیابی حاصل کی۔ ابراہیم نے اُسے اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی تھی۔ اس فوج کو منتشر کرنے میں دولت خاں کامیاب ہو گیا۔ کچھ تو اُس کے ساتھ شامل ہو گئی اور کچھ بغیر لڑے ہی میدان سے ہٹ گئی[51]

اس درمیان عالم خاں بھاگ کر کابل پہنچ گیا تھا اور اپنی بدقسمتی کا حال بابر کو بتا رہا تھا۔ بابر نے تب اُس کے ساتھ ایک صلح نامہ کیا جس میں اِس شرط پر اُسے دہلی کے تخت پر بٹھانا منظور کیا گیا کہ لاہور اور اس کے مغرب کے علاقے پر بابر کا مکمل اقتدار تسلیم کر لیا جائے۔ پنجاب کے سپہ سالاروں کے نام بابر کے احکام سے لیس کر کے عالم خاں کو پھر ہندوستان بھیجا گیا۔ شاہِ کابل بذاتِ خود جانے سے معذور تھا کیوں کہ اُسے بلخ جانا تھا[52] جس کا محاصرہ ازبکوں نے کر رکھا تھا۔ لیکن ایک بار ہندوستان میں آنے کے بعد عالم خاں اپنے حواس کھو بیٹھا اور دولت خاں نے چالاکی کے ساتھ جھوٹی ہمدردی و وفاداری دکھا کر اسے گمراہ کر دیا۔ نتیجتاً عالم خاں نے بابر کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو ہوا میں اُڑا دیا۔ بابر کے افسروں کے

---

[51] 'فرشتہ'، دوم، ص ۳۹

[52] فرشتہ کہتا ہے کہ بابر "خوابِ غفلت وعیش میں ڈوبا ہوا تھا" جو کہ انتہائی ناقابلِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ صرف کوئی اہم معاملہ ہی اس نازک موقع پر اُسے ہندوستان سے دُور رکھ سکتا تھا۔

احتجاجات کو نظر انداز کر دیا اور پنجاب دولت خاں کو دے دیا۔[1] بعدۂ اپنے نئے رفیق کے ساتھ متحد ہوکر دہلی کی جانب بڑھا مگر ابراہیم نے بذاتِ خود اسے ذلت آمیز شکست دی۔[2] اُس کی فوج تتر بتر ہوگئی اور وہ خود خوف زدہ ہوکر بھاگ گیا۔

ہندوستانی معاملات کی یہ حالت تھی جب بابر بلخ کے خطرے سے آزاد ہوکر اپنی پانچویں مہم شروع کرنے کے قابل ہوا ــــ اگلے باب میں ہم کچھ تفصیل سے اُن حالات کا جائزہ لیں گے جو اُس اہم ترین مہم کے وقت موجود تھے اور جن کے نتیجے میں ہندوستان میں مغل سلطنت قائم ہوئی۔

---

[1] 'فرشتہ' کہتا ہے کہ بابر کے افسروں نے عالم خاں کو مجبور کیا کہ اُن کے آقا کو سندھ کے شمال مغرب کا علاقہ دے دے، لیکن بابر اس معاملے کا ذکر نہیں کرتا۔ یقیناً اس نے محسوس کرلیا تھا کہ عالم خاں کی غداری کی وجہ سے سمجھوتہ ناممکن ہے۔

[2] اتحادیوں نے ابراہیم کے پڑاؤ پر شب خون مارا، اُس کے بیشتر دستوں کو منتشر کر دیا، پھر خود لوٹ کی تلاش میں بکھر گئے۔ سلطان دہلی اپنے خیمے میں رہا۔ پھر جب دن نکلا تو وہ اپنے ذاتی دستوں کو ساتھ لے کر دشمن کے خلاف بہت بہادری سے لڑا، اگرچہ عالم خاں کی فوج کامیابی کے نشے میں چُور تھی اور تعداد میں زیادہ تھی مگر شرمناک خوف و ہراس میں مبتلا ہوکر بھاگ پڑی۔

باب ششم

فتحِ ہندوستان

اسناد : ' تزکِ بابری '۔ ' تاریخ حقّی '۔ ' فرشتہ '۔ ' اکبرنامہ '۔ ' گلبدن بیگم '۔
جدید تصانیف : ' ارسکن '۔ ' لین پول '

ازبکوں کو بلخ سے نکال کر اور اس طرح اپنی فوری ترین پریشانیوں سے چھٹکارا پاکر بابر اب ایک دفعہ پھر ہندوستان کے معاملات پر توجّہ دینے کے قابل ہوا۔ پہلی نظر میں تو یہ وقت سازگار نہ معلوم ہوتا تھا ــــــ جہاں تک تعداد کا تعلق ہے اس کا لشکر اپنی بہترین حالت میں بھی بہت زیادہ زبردست نہیں تھا۔ پھر اب اس میں سے کچھ فوج الگ کر کے قندھار اور قندز کی حفاظت کے لیے بھیجنے کی ضرورت پڑی تو یہ لشکر اور بھی کم ہوگیا ــــــ لیکن وہ محض اس بنا پر پس و پیش میں پڑجانے والا انسان ہرگز نہ تھا کہ اس کے مقابل نامساعد حالات بہت زبردست ہیں :

" بروز جمعہ یکم صفر ۹۳۲ھ[1] کو جب کہ سورج برج قوس میں تھا، میں ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اپنی مسافت پر روانہ ہوا۔"

لیکن وہ پندرہ دن سے زیادہ مدّت تک (۳ دسمبر تک) باقاعدہ آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ اُسے مجبوراً ہمایوں کا انتظار کرنا پڑا جس کے تساہل پر اس نے سخت سرزنش کی۔ آخرکار

---

[1] ۱۷ نومبر ۱۵۲۵ء

پوری سپاہ پہاڑوں کے پار لمبی مسافت پر روانہ ہوگئی

گزشتہ واقعات کی خبروں نے بابر کو اپنے منصوبوں کو بدلنے پر مجبور کردیا۔ ایک طویل مدت سے اس کو اس یقین کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی کہ جب تک دہلی کی مرکزی طاقت سے مصالحت نہ کی جائے اُس کا پنجاب کی تسخیر کا ابتدائی منصوبہ ناقابل عمل ہے۔ اس لیے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ سلطان ابراہیم کو تخت سے ہٹانے اور عالم خاں کو اس کی جگہ تخت نشیں کرنے کے منصوبے میں مدد دینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اس طریقے سے وہ ایک پنتھ دو کاج کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اعانت کی قیمت میں تو اسے پنجاب مل جاتا اور اس مال کی ضمانت اس طرح مل جاتی کہ جس بوڑھے اور قدرے کمزور بادشاہ کو وہ تخت پر بٹھانے والا تھا اس پر اسے قابو حاصل ہوتا۔ لیکن دولت خاں کی ریشہ دوانیوں اور عالم خاں کی عہد شکنی نے پوری صورت حال میں ترمیم کردی تھی۔ اب آئندہ لودی کے مدعی سلطنت ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا کیوں کہ اس نے دیانت دار انسانوں کے خون کی قربانی کا خود کو قطعی نااہل ثابت کردیا تھا۔ بابر خود اپنے واسطے ہر سامنے آنے والے حریف سے برسر پیکار تھا جس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ پنجاب پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ دوسرے اُسے یقین تھا کہ پنجاب پر مستقل تسلط ہندوستان کی تسخیر کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور آخری وجہ یہ کہ سیاسی صورت حال مستقبل میں شدید جنگ و جدل اور خطرناک مہمات کے امکانات سے لبریز نظر آتی تھی ـــــ اور یہی وہ چیزیں تھیں جن سے بابر کی روح کو عشق تھا۔

تاہم جیسے ہی وہ پہاڑوں کو پار کرچکا وہ بیمار پڑ گیا[1] یہ علالت بہت ہی بے موقع تھی اور بابر نے محسوس کیا کہ شراب کے معاملے میں اس کی غلط کاریوں کی یہ سزا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے اطوار دُرست کرنے کا عہد کیا، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ بعد میں وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہا۔ بہرحال جلد ہی پیچش کا یہ حملہ دُور ہوگیا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کیوں کہ اب جب کہ وہ اپنی خطرناک مہمات میں سے خطرناک ترین شروع کرچکا تھا تو اس میں کامیابی کے لیے اس کو اپنی تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کی ضرورت تھی۔ جب وہ دریائے کابل پر پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ دولت خاں و غازی خاں بیس تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ

---

[1] ایل۔ڈی۔کنگ نل، دوم، ص ۳۲،

پنجاب کو پامال کر رہے ہیں اور سیدھے لاہور پر بڑھ رہے ہیں۔ یہ ہر قیمت پر ضروری تھا کہ انہیں اس نازک موقعے پر ایسی اہم کامیابی حاصل کرنے سے روکا جائے۔ اس لیے بابر نے جلدی سے شہر میں اپنے نائبوں کے پاس اطلاع کے لیے ایلچی بھیج دیا کہ وہ نزدیک ہی ہے۔ اُن کو حکم دیا کہ تمام خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے اس سے آملیں —— اور سختی سے منع کر دیا کہ اس کے آنے سے پہلے جنگ شروع نہ کریں۔ اس اثنا میں وہ خود سُرعت سے بڑھتا رہا۔ جب وہ دریائے سندھ[1] سے گزر رہا تھا تو اُس نے موقعے سے فائدہ اُٹھا کر ان افواج کا شمار کیا جو اس خطرناک مہم میں اس کے ساتھ تھیں۔ خواہ یہ امر کتنا ہی ناقابلِ یقین کیوں نہ معلوم ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ تمام لشکر جس سے ہندوستان فتح کرنے کی اُمید کر رہا تھا صرف بارہ ہزار تھا جس میں اچھے بُرے، چھوٹے بڑے، لڑنے والے اور بھیر سب ہی شامل تھے۔

لیکن خطرے کی پرواہ کیے بغیر وہ آگے ہی بڑھتا رہا اپنے اُن سرداروں کی امداد کو جن پر تباہی منڈلا رہی تھی۔ جیسے ہی اُس نے جہلم پار کیا افغانوں کی طاقت کے متعلق تازہ بہ تازہ افواہیں اُسے ملیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ دولت خاں نے اُس زبردست شہزادے (بابر) سے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر کے جس کو اس نے اپنا آلۂ کار بنانے کی اُمید کی تھی، اپنی کمر میں دو تلواریں باندھ رکھی ہیں جو اس کے اس عزم کی علامت ہیں کہ فتح پائے گا یا مر جائے گا —— لیکن دولت خاں کا جوش و جذبہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ رہا ہو وہ اپنی فوج کی شیرازہ بندی قایم رکھنے سے اس وقت بالکل معذور رہا جبکہ بابر کی آمد کی خبر زوروں سے دُور دُور تک پھیلنی شروع ہوئی۔ شاہ کابل نے بیاس پار کر لیا تھا اور میوات کی ناکہ بندی کر رہا تھا تو دلاور خاں اس سے آملا۔ اس نے ایک دفعہ پھر ایک غیر ملکی کی خدمت اختیار کرنے کے لیے اپنے باپ اور اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ غالباً یہی وقت تھا جب بابر کو مقابل فوجوں کی صحیح حالت معلوم ہوئی۔ بایں ہمہ وہ اس بے باکی سے آگے بڑھتا رہا جو کہ عام حالات میں حماقت ہی کہی جا سکتی تھی۔ لیکن اس موقع پر اس کی تیز رفتار پیش قدمی نے دولت خاں کی ابتری کو مکمل کر دیا۔ اُس کی فوج کا شیرازہ بکھر گیا اور حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ ہر طرف بھاگ پڑی۔ خود دولت خاں اور اس کے قریبی ساتھیوں کے پاس ایک حقیر و ذلیل اطاعت کے علاوہ

---

[1] یکم ربیع الاول (۱۶ر دسمبر) ی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۱۳۷۔ المنسکی، ص ۳۲۹

اور کوئی چارہ نہ رہا۔ اس منظر کو ذیل میں بیان کیا گیا ہے :

" دولت خاں نے اب مجھے اطلاع دینے کے لیے ایک شخص بھیجا کہ غازی خاں فرار ہوگیا ہے اور پہاڑیوں میں بھاگ گیا ہے لیکن یہ کہ اگر میں اُس کے ذاتی قصوروں کو معاف کردوں تو وہ ایک غلام کی طرح حاضر ہو جائے اور یہ مقام میرے حوالے کردے۔ اس لیے میں نے خواجہ میر میرن کو بھیجا تاکہ اس کے اس ارادے کو استقامت دے اور اُس کو باہر لے آئے ــــــ اُس کا لڑکا علی خاں اُس افسر کے ساتھ گیا۔ اُس پیر مرد (دولت خاں) کی گستاخی اور حماقت کو نمایاں کرنے کے لیے میں نے خواجہ کو اس امر کا خیال رکھنے کا حکم دیا کہ دولت خاں اپنے گلے میں وہی دونوں تلواریں لٹکا کر آئے جو کہ اُس نے مجھ سے مقابلے کے لیے اپنے پہلو میں لٹکائی تھیں۔ جب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تب بھی وہ تاخیر کے لیے عذر لنگ تراشتا رہا مگر بالآخر اسے باہر لایا گیا۔ میں نے دونوں تلواریں اُس کی گردن سے اُتارنے کا حکم دیا۔ جب وہ میرے پاس کورنش بجالانے کو آیا تو اس نے جھکنے میں دیر لگائی۔ میں نے لوگوں کو ہدایت دی کہ اس کی ٹانگ کھینچ کر اُسے جھکنے پر مجبور کریں۔ اس کے بعد میں نے اس کو اپنے سامنے بٹھایا اور ایک ایسے شخص کو طلب کیا جو ہندوستانی زبان جانتا ہو تاکہ جو کچھ میں کہوں اس کو جملہ بہ جملہ سمجھائے اور اس طرح اس کے دل کو اطمینان دلایا جاسکے۔ تب میں نے اُس سے یہ کہنے کو کہا: 'میں نے تمھیں باپ کہا۔ میں نے تمھاری توقع و خواہش سے زیادہ تمھارا ادب و احترام کیا۔ میں نے تمھیں اور تمھارے بیٹوں کو بلوچیوں کی بے عزتیوں سے نجات دلائی۔ میں نے تمھارے قبیلے، تمھارے خاندان اور تمھاری عورتوں کو ابراہیم کی غلامی سے چھڑایا۔ میں نے تمھیں تاتار خاں[1]

---

[1] تاتار خاں دولت خاں کا باپ تھا اور پنجاب کے ان دو تین سربرآوردہ افغانی اُمرا میں سے ایک تھا جو کہ ۱۴۵۰ء میں بہلول لودی کی تخت نشینی کا باعث بنے تھے۔ اس کے قبضے میں سندھ اور ستلج کے شمالی اضلاع تھے۔

کے مقبوضہ علاقے عطا کیے جن کی آمدنی تین کروڑ ہوتی ہے۔ میں نے کبھی تمہارا
ایسا کیا بگاڑا تھا کہ تم اس طرح اپنے پہلو میں دو تلواریں لے کر میرے خلاف آئے
اور ایک لشکر کے ذریعے میرے علاقوں میں ہنگامہ و انتشار پھیلایا' ــــ
اس شخص نے بدحواسی میں ہکلا کر اُلٹے سیدھے کچھ الفاظ کہے اور درحقیقت
ان لاجواب کرنے والے حقایق کے جواب میں وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ یہ طے
کیا گیا کہ وہ اور اس کا خاندان اپنے قبیلوں میں اپنا اقتدار اور اپنے دیہات
پر اپنا قبضہ برقرار رکھیں لیکن ان کے علاوہ ان کی باقی املاک ضبط کرلی جائیں۔
ان کو خواجہ میرمیرن کے قریب خیمہ ڈالنے کی ہدایت کی گئی۔"[1]

اس طرح بابر کی پُرخطر مہم کا پہلا دور پنجاب میں اس کے دشمنوں کی شکست کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ لیکن ابھی دلّی کی شاہی فوجوں کا سر جُھکانے کا مشکل تر کام باقی تھا۔ پھر یہ کام بھی پُرآشوب، انتشار زدہ اور سیاسی فرقہ بندیوں سے لبریز، پوری سلطنت ہندوستان کو حلقۂ اطاعت میں لانے کے مقابلے میں بچّوں کا کھیل تھا۔ بابر نے اپنے سامنے کی ان دُشواریوں کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن یہ بخوبی اسے نظر آرہا تھا کہ اس کی کامیابی کی بہترین اُمید فوری عمل میں مضمر ہے:

" رکابِ عزم و استقلال میں قدم رکھ کر اور عنانِ یقین ہاتھ میں لے کر میں
سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر بن سلطان بہلول لودی افغان کے خلاف بڑھا،
جس کے قبضے میں اُس وقت ہندوستان کی سلطنت اور دہلی کا شہر تھا۔"[2]

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا گیا اُسے اس امر کے مختلف ہمّت افزا ثبوت ملے کہ وہ اپنے حریف کے مُلک میں بے یار و مددگار نہیں ہے۔ حلقۂ دربار کے دو ارکان آرائش خاں اور مُلّا محمد مذہب نے اس کو خطوط بھیجے جن میں اس کے داعیہ و مقصد سے اپنی حمایت و وابستگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ عالم خاں ایک حالتِ بےنوائی میں اپنے سابق حلیف کے پاس خود کو اس کے رحم و کرم پر ڈالنے آپہنچا اور شاید اسی وقت راجپوت سنگرام سنگھ کی جانب سے بھی یہ

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۱۴۸۔ المنسکی، ص ۳۳۴، ۳۳۵

[2] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۱۵۳۔ المنسکی، ص ۳۳۷

تجاویز موصول ہوئیں کہ ابراہیم پر ایک متحدہ حملہ ہونا چاہیے۔ لیکن بابر کو پورا احساس تھا کہ اس طرح کی سلسلہ جنبانیوں پر کتنا کم بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ سنگرام سنگھ کو اس نے کیا جواب دیا یہ ہیں معلوم نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس کا جواب موافقت میں تھا کیوں کہ بعد میں اس نے راجہ پر دغابازی کا یہ الزام لگایا کہ اس نے مجوزہ اتحاد کی شرائط پوری کرنے کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ لیکن وہ (بابر) اس بات سے بخوبی واقف رہا ہوگا کہ اگر دہلی کے شاہی خاندان پر کوئی تباہی نازل ہوئی تو راجپوت ریاستوں کی تنظیم یکایک ایک ایسی فوقیت اور برتری لے کر اُبھرے گی جو اس کو پہلے کبھی حاصل نہیں ہوسکی اور اس لیے اس کا براہِ راست مفاد اسی میں ہے کہ اس کو (بابر کو) اپنی مہم میں ناکامی ہو نیز یہ کہ اس کی تسخیر ہندوستان کی تمام مخالف طاقتوں میں یہی تنظیم سب سے زبردست تھی۔ صورت حال بہت سُرعت سے نازک ہوتی جارہی تھی۔ ابراہیم دہلی سے ایک فوج لے کر جس کا اندازہ ایک لاکھ کیا جاتا ہے حملہ آور کے خلاف بڑھ رہا تھا۔ اس کی دو ہراول جماعتوں نے یکے بعد دیگرے بابر کی مختصر سی فوج پر حملے کا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک حمید اخاں کے تحت اور دوسری داؤد خاں و حاتم خاں کے تحت تھی۔ ۲۶ فروری کو شہزادہ ہمایوں نے پہلی (جماعت) کو مار بھگایا اور ۱۰۰ قیدی اور آٹھ ہاتھی ہاتھ آئے حالانکہ بابر کی مختصر فوج کی قلت کا یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ پورے میمنہ کو قلب کی حمایت کے ساتھ اس مقصد کے لیے الگ کرنا پڑا تھا۔ دوسری جماعت کو اسی طرح ۲ اپریل کو ہزیمت اُٹھانا پڑی اور اُس کو ابراہیم کے پڑاؤ کی بالکل دیوار تک دھکیل دیا گیا، کیوں کہ اس وقت تک بابر سرسوہ کے مقابل جمنا تک پہنچ گیا تھا۔ بعدہٗ اُس نے افغانوں کی اصل جماعت سے فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاری کرنے کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ جب اُس کی فوج جنگ کے لیے صف بستہ کھڑی تھی تو بابر کو مُعاینے کے درمیان معلوم ہوا کہ اس کا مورچہ اتنے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے جتنا کہ اُسے توقع تھی۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیوں کہ کوئی آٹھ ہزار محارب سپاہیوں میں سے جو اس مہم پر پنجاب سے گزر کر آئے تھے، ایک بڑی تعداد قلعوں کی محافظ سپاہ کا فرض انجام دینے، رسل و رسائل کی حفاظت کرنے اور جنگ کی تباہ کاری میں لازمی طور پر صَرف ہوگئی ہوگی۔ لیکن بابر کے لیے یہ معاملہ بہت ہی اہم تھا۔ اگر اُسے اپنے حریف کی بہت زیادہ برتر افواج پر فتح حاصل کرنا تھی تو یہ صرف اُس کی اعلا تربیت یافتہ سوار فوج اور نئے آتشی اسلحہ جات کے ایک

موثر متحدہ عمل سے ہو سکتا تھا۔ اُستاد علی اور مصطفا کے سامنے اگر حریف کا ایک گھنا ہجوم ہو تو وہ مل کر بہت مہلک کارروائی کر سکتے تھے۔ لیکن اگر سوار و پیادہ فوج ایک آڑ کی شکل میں احتیاط کے ساتھ حفاظت نہ کرے تو دشمن کی یلغار میں توپچیوں اور بندوقچیوں کے پامال و مغلوب ہو جانے کا احتمال تھا۔ ان پُرانی قسم کے ہتھیاروں سے گولیوں کی جو بوچھار[1] قایم رکھی جا سکتی تھی اس کی رفتار اس قدر سُست ہوتی تھی کہ اُستاد علی اور مصطفا سے محاذ جنگ کے کسی بھی حصّے کو (مقابل فوج کو) اپنے بل بوتے پر سنبھالے رکھنے کی اُمید رکھنا عبث تھا۔ لیکن اس مختصر فوج میں سے ان کے لیے یہ حفاظتی دستے کیسے فراہم ہوں؟ کیوں کہ اگر بابر اپنی فوجوں کی صفوں کو اتنا پھیلا کر پیش کرنے کی تدبیر نہ کرے کہ طول میں وہ دشمن کی محارب صفوں کے برابر ہو جائیں تو اس کی سوار فوج بغل سے گھوم کر دشمن کو گھیرنے کا وہ طریقہ جنگ عمل میں نہیں لا سکتی تھی جس کے ذریعے وہ افغانی فوج کے بازوؤں کو قلب پر ڈھکیلنے کی اُمید رکھتا تھا۔ صرف اس جنگی چال کو کامیابی سے انجام دے کر اور دشمن کی سپاہ کو ایک بے ترتیب ہجوم کی شکل میں ڈھکیل کر جس کو اُستاد علی اور مصطفا اپنی گولہ باری کا نشانہ بنا سکیں، بابر اپنے توپخانے کا بہترین استعمال کر سکتا تھا۔ اسے جس مشکل کا مقابلہ کرنا تھا وہ یہ تھی کہ کس طرح اپنے سے برتر افواج کو ایک حد سے زیادہ لمبے محاذ پر پھیلا کر اس وقت تک لڑائی میں اُلجھائے رکھے جب تک کہ دونوں میں سے کسی بازو پر فیصلہ کن حملے کا وقت نہ آ جائے۔ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے جنگی مجلس (شورا) بُلائی گئی۔

ابراہیم کے پڑاؤ کے آس پاس کی زمین کا بغور جائزہ لیا جا چکا تھا تاکہ اگر کسی طرح کی مقامی خصوصیات موجود ہوں تو اُن سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ سلطان اور اُس کی فوجیں دہلی جانے والی سڑک پر اہم شہر پانی پت کے ٹھیک جنوب میں پڑی ہوئی تھیں جو بابر کے زمانے میں بہت بڑا اور گنجان آباد تھا۔ سڑک شہر کے شمال سے گزرتی ہے اور اردگرد کا علاقہ مسطح ہے اور تقریباً درختوں سے خالی ہے اور سوار فوج کی نقل و حرکت کے لیے بہت موزوں ہے۔ تیزی سے دو منزل بڑھ کر مغل فوج شہر کے برابر آ سکتی تھی اور اُس کے بعد اگر جنگی مورچہ جما لیا جاتا تو پانی پت کی عمارتیں اور مکانات بابر

---

[1] لیڈن و ارسکن، ص ۲۴۷، ۳۶۹

کے میمنہ کی بخوبی حفاظت کر سکتے تھے۔ دوسرے بازو کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کے مصنوعی ذرائع مثلاً خندق یا کٹے ہوئے درختوں کی آڑ کی ضرورت تھی۔ ابھی دو مشکلات باقی تھیں۔ ایک تو تعداد میں برتر فوج کے دباؤ کے خلاف ایک لمبے محاذ کو سنبھالے رکھنا۔۔ دوسرے حفاظت کا کافی بندوبست توپچیوں اور بندوقچیوں کے لیے کرنا جو جارحانہ جنگ میں جس قدر مہلک اور دفاعی جنگ میں اسی قدر کمزور و ضرب پذیر تھے۔ ان دونوں مشکلات کا بابر نے ایک ہی حل تلاش کر لیا۔

۱۵۱۴ء میں غالباً چلدران کی جنگ میں سلیم سنگدل کی مثال سے متاثر ہو کر[1] بابر نے اپنے کمزور محاذ کو مضبوط کرنے کے لیے باربردار گاڑیوں کی ایک قطار کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا۔ نواحی علاقوں میں تلاشِ بسیار کے بعد اور خود اپنے سامان کی گاڑیوں کو استعمال میں لاکر بابر تقریباً سات سو (گاڑیاں) جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ عثمانی ماہرینِ مصافیات نے جہاں لوہے کی زنجیروں کا استعمال کیا تھا اُس کے بجائے ان گاڑیوں کو فی الوقت "کچے" چمڑے کے رسّوں کے ذریعے ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا اور سب کو سہولت آمیز واحدوں کی شکل میں ترتیب دیا گیا۔ بندوقچیوں اور توپچیوں کی خصوصی حفاظت کے لیے چھوٹی قسم کے دُھس جو ایک آدمی کی حفاظت کے لیے کافی ہوں خاصی تعداد میں بنائے گئے اور ہر دو گاڑیوں کے درمیان چھ یا سات کی تعداد میں محاذ کے اس حصّے کے سامنے لگا دیے گئے جہاں اُستاد علی اور مصطفٰا کو جگہ لینا تھی۔

جب یہ تیاریاں مکمل ہو چکیں تو بابر نے دو منزل اور آگے کوچ کیا اور ۱۲ اپریل ۱۵۲۶ء کو ایسی جگہ مورچہ لگایا جہاں پانی پت کا شہر اُس کے میمنہ کی حفاظت کر رہا تھا۔ میسرہ کی طرف اپنا مورچہ مضبوط کرنے کے لیے اُس نے ایک خندق کھودی اور کٹے ہوئے درختوں کی آڑ (اباتی) اس طرح بنائی کہ دشمن کے لیے اُس کی صف کو بائیں طرف سے اُلٹنا ناممکن ہو جائے۔ دونوں بازوؤں کے محفوظ ہو جانے کے بعد اب اُس نے اپنے قلب (مرکز) کو دُھسوں سے مستحکم کیا جو پہلے ہی سے تیار تھے۔ تاہم قطار مسلسل نہ تھی بلکہ ایک تیر کی زد کے درمیانی وقفوں سے اتنے چوڑے خلا چھوڑ دیے گئے تھے

---

[1] صفحہ ۱۰۱ کہ اوپر۔

کہ ایک وقت میں پچاس یا سو سوار اس میں سے پہلو بہ پہلو گزر کر حملہ کرسکیں۔ اب جنگ کا نقشہ مکمل ہو چکا تھا۔

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ پانی پت کی جنگ کا مطالعہ اتنے غور سے نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق ہے۔ بہت سے مصنّفین نے تو بابر کی مصافیات کو مکمل طور پر غلط سمجھا ہے اور اس کا بھی اندازہ نہیں لگا سکے کہ کس طرح اس مصافیات نے فتح کی شکل میں اپنا ناگزیر نتیجہ پیدا کیا۔ یہ فرض کرلینا ایک رواج سا بن گیا ہے کہ بابر کی گاڑیوں کی قطار ایک متحرک قلعہ تھی[1] جس کے پیچھے اُس کی مختصر فوج ہلاکت سے بچنے کی اُمید کرسکتی تھی۔ نیز یہ کہ یہ سب کچھ ایک نقل تھی بوہیمیا کے ہسیوں[2] کے طریق جنگ کی جن پر اُنھوں نے اس وقت عمل کیا تھا جب ان کو 'سلطنت' کی بھاری سوار فوج کا مقابلہ درپیش تھا۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی مفروضہ تحقیق کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ گاڑیوں کی یہ قطار دفاع سے زیادہ جارحیت کی جنگی تدبیر تھی: اُس کا مقصد دشمن کو ایک طویل محاذ پر اُلجھائے رکھنا تھا تاکہ اُس کے بازو حملے کی زد میں آسکیں۔ اِس میں شک نہیں کہ اُس (گاڑیوں کی قطار) نے بندوقچیوں اور توپچیوں کے لیے ایک پناہ گاہ فراہم کردی تھی لیکن کسی بھی لحاظ سے یہ ایک 'لاگر'[3] یا قلعہ نہ تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ جس دیوار کو محض حملے سے محافظت کے لیے لوگ بناتے ہیں اُس میں بڑے بڑے خلا نہیں چھوڑتے اور اگر بابر کا مقصد ایک 'فصیل' یا 'متحرک قلعہ' بنانا ہوتا تو چاروں طرف سے خود کو گاڑیوں سے محصور کرلیتا یا اگر ایسا نہ بھی کرتا تو یقیناً گاڑیوں کو مسلسل قطار میں رکھا ہوتا۔ پھر پانی پت کی گاڑیوں کی قطار کو ہسیوں کی گاڑیوں کے واعدوں سے مماثلت دینا بھی صحیح نہ ہوگا جن کو نقل و حرکت کرنے اور باہم متحد ہوکر ایک متحرک قسم کے حقیقی قلعے کی شکل اختیار کرنے کی تربیت دی گئی تھی[4]۔ بوہیمیا میں بنیادی طور پر

---

[1] ایس۔ لین پول، بابر۔ میڈیول انڈیا انڈر محمڈن رول۔

[2] بوہیمیا کے جان ہس کے مقلّد۔

[3] 'لاگر' جرمن لفظ۔

[4] اومان۔ ہسٹری آف دی آرٹ آف وار۔
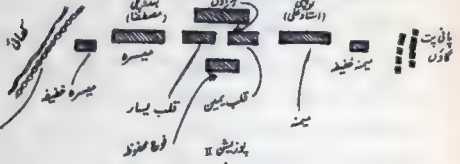
حالات بالکل مختلف تھے۔ پیدل فوج کو سوار فوج کا مقابلہ کھلے میدان میں کرنا پڑ رہا تھا اور گاڑیوں کا قلعہ (لاگر) پیادہ سپاہیوں کو پناہ دینے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ لیکن بابر سوار فوج کا قائد تھا اور سوار فوج ہی اُس کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اُسے دشمن سواروں کی ٹکر سے بچنے کے لیے فصیل کے پیچھے دُبکنے کی ضرورت نہ تھی۔ ٹھیک جس طرح کہ اس کا خاص مقصد جنگ کی آگ سے بچنا نہیں بلکہ اُسے بھڑکانا تھا، اسی طرح اُس کی گاڑیوں کی قطار دشمنوں کو تباہ کرنے کی ایک تدبیر تھی نہ کہ ایک پناہ گاہ، جہاں خود اُس کی فوجیں تباہی سے بچ سکیں۔

یہ اندازہ تو ہوگیا ہوگا کہ اِس ہوشیاری سے بابر نے جو مورچہ جمالیا تھا وہ بہت مستحکم تھا۔ یہ مورچہ اتنا زبردست تھا کہ کچھ سورما تو شکوہ کرنے لگے اور بولے کہ سلطان ابراہیم اس کے سامنے کبھی بڑھنے کی جرات نہ کرے گا۔ لیکن بابر نے ٹھیک ہی کہا کہ افغان حکمراں کو خانانِ ازبک کے معیار سے نہیں جانچنا چاہیے، سلطان ابراہیم جوان ہے، ناتجربہ کار اور ناعاقبت اندیش ہے۔ وہ کسی واضح لائحہ عمل کے بغیر ہی ایک مہم شروع کر رہا ہے۔ فوجوں کو اُوٹ پٹانگ طریقے پر بڑھا رہا ہے اور اپنا سب کچھ ایک اٹکل پچّو جنگ کے داؤ پر لگانے کو تیار ہوگیا ہے ـــــ گمان غالب ہے کہ بابر کے اس جواب پر ان سب معترضین کو اکتفا کرنا پڑا اور حالات آگے چل کر یہ دکھانے والے تھے کہ بابر اپنی پیش بینی میں مکمل طور پر صحیح تھا۔

شاہ کابل کے لیے یہ اچھا ہی تھا کہ اُس کے دشمن کے پاس ذاتی بہادری کے علاوہ ایک سپہ سالار کے سارے ہی اوصاف مفقود تھے، کیوں کہ تعداد کی کثرت بے پناہ حد تک افغانوں کی موافقت میں تھی۔ بابر کے اندازے کے مطابق ابراہیم کے ساتھ ایک لاکھ آدمی تھے اور حوالیانِ لشکر کو شمار کیا جائے تو یہ ناممکن تعداد نہیں ہے اور اگر ہم محارب افراد کے مقابلے میں غیر محارب کا تناسب بہت زیادہ رکھیں[1] ـــــ اتنا زیادہ جتنا مرزا حیدر نے جنگ چونسہ میں رکھا ہے ـــــ تب بھی یہ یقین کرنا مشکل ہوگا کہ سلطان ابراہیم کے پاس چالیس ہزار سے کم محارب افراد تھے۔ بابر کا کہنا ہے کہ اگر

---

[1] 'تاریخ رشیدی' ص ۴۷۶

ابراہیم اپنا کچھ خزانہ سپاہیوں کو حاصل کرنے میں صرف کرنا چاہتا تو اُس کے پاس دو لاکھ آدمی بھی ہو سکتے تھے لیکن جس طرح حد سے زیادہ بھاری محاصل ابراہیم کی نامقبولیت کا ایک خاص بڑا سبب تھے[۵] اسی طرح حرص و طمع اُس کے زوال کی ایک وجہ بننے والی تھی کیوں کہ چند ہزار اور آدمی جنگ کا رُخ یقینی طور پر بابر کے خلاف موڑ سکتے تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بابر کے پاس آٹھ ہزار سے زیادہ لڑنے والے نہیں ہو سکتے تھے اور اغلب یہ ہے کہ اس سے بھی بہت کم تھے۔ اس لیے کم سے کم اندازے کے مطابق بھی فوجوں کی تعداد پانچ اور ایک کے تناسب سے افغانوں کے موافقت میں تھی۔ مزید برآں افغانوں کے پاس کوئی ایک ہزار ہاتھیوں کی فوج بھی تھی جس سے اُن کو جنگ میں بلاشبہ بڑا فائدہ حاصل کرنے کی اُمّید تھی۔ لیکن ان کی اُمیدوں کی تقدیر میں ناکامی ہی لکھی تھی۔ ہاتھیوں نے جنگ میں بہت کم حصّہ لیا کیوں کہ غالباً انھیں بابر کے توپخانے کا مقابلہ کرنے پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔

۱۲ اپریل سے ۱۹ اپریل تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں۔ بابر کے سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے اُن کو تنگ کر رہے تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر لشکر کے قریب تک پہنچ جاتے تھے۔ ابراہیم کی فوجوں پر تیروں کی بوچھار کرتے تھے اور اس سے قبل کہ کوئی موثر جواب دیا جا سکے سرپٹ دوڑتے ہوئے واپس محفوظ مقام پر آجاتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود افغانوں کی طرف سے حملے کے کوئی آثار نمایاں نہ ہوئے۔ ہرچہ بادا باد بابر نے ۱۹ اپریل کو ایک ہمہ گیر جنگ چھیڑنے کا عزم کر لیا۔ مزید تاخیر اس کی پوری مہم کو ہی خطرے میں ڈال سکتی تھی کیوں کہ اُسے خوب معلوم تھا کہ حملہ آور فوج کی قسمت کا انحصار پے در پے فتوحات پر ہوتا ہے۔ جنگ کے محتاط طریقے اور غیر فیصلہ کن مقابلے حقیقی شکست کے مرادف ہیں۔ فتح اور صرف فتح ہی میں نجات ہے۔ لہٰذا ۱۹ اپریل کی شب میں کچھ اُمرا کے غالباً ہندو بیگ، عبدالعزیز، محمد علی جنگ اور خسرو کے مشورے سے جو کہ پچھلی مہم کے بعد ہندوستان ہی میں رُک گئے تھے، ایک اچانک حملے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ چار پانچ ہزار آدمی جن میں بیشتر

---

۵ — 'تاریخ حقی' ورق ۲۷۵

غالباً کمکی اور بے قاعدہ فوجی دستے تھے، مہدی خواجہ، محمد سلطان مرزا، سلطان جنید برلاس اور دوسرے آزمودہ سرداروں کی ماتحتی میں ابراہیم کے پڑاؤ کے خلاف بھیجے گئے۔ اس درمیان بابر اور ہمایوں باقی ماندہ سپاہ کے ساتھ ہتھیار سنبھالے کھڑے رہے کہ اگر حملہ کامیاب ہو تو مکمل فتح کے لیے زور لگایا جائے اور اگر ناکامی ہو تو حملہ کرنے والوں کی پسپائی میں ایک آڑ کا کام کریں۔ غالباً سپاہیوں کی بے پروائی کی وجہ سے اچانک حملہ ناکام ہوا۔ رات کی تاریکی میں سپاہی راستہ بھول گئے۔ سرداروں نے اپنی نقل و حرکت میں مناسب ہم آہنگی نہ رکھی اور جب دن نکلا تو مہم والوں نے کوئی کارروائی عمل میں لائے بغیر ہی اپنے آپ کو بہت خطرناک حالت میں دشمن کے پڑاؤ کے نزدیک پایا۔ لیکن مغل سپاہیوں کو دیکھ کر سلطان ابراہیم یقیناً یہ سوچتے ہوئے بسُرعت اپنے مستقر پر پلٹا کہ اس پر فوری حملہ ہونے والا ہے اور اپنی فوجوں کی صف بندی شروع کردی ــــ شاید اسی باعث یہ چھوٹی سی ٹکڑی کو نجات نصیب ہوئی کیوں کہ جب افغان اپنی فوجوں کی آخری ترتیب و صف آرائی میں مشغول تھے بابر کے آدمی اپنی خطرناک صورتِ حال سے بچ نکلے اور اپنے آقا سے آملے۔ بابر کو بہت اطمینان ہوا، کیوں کہ ایک ہی شکست اس کے منصوبوں کے لیے تباہ کن ہوسکتی تھی۔ وہ ہمایوں کی سپاہ کو پسپا ہونے والوں کے لیے ایک آڑ کا کام دینے کی غرض سے روانہ کرچکا تھا اور خاص فوج کو اپنی ذاتی کمان میں لے کر خود آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اُسے احساس ہوا کہ پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں کو سنگین طریقے پر پریشان نہیں کیا جارہا ہے۔ لشکر اپنے پڑاؤ پر واپس آگیا اور ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ مگر ۲۰ اپریل کی رات میں یہ بے بُنیاد کھلبلی پھیل کہ پڑاؤ پر حملہ ہورہا ہے۔ یہ اس بات کی صریح علامت تھی کہ مغل سپاہیوں کے اعصاب پر کشش و پیچ کی اس کیفیت کا بہت شدید دباؤ پڑ رہا ہے ــــ کچھ دیر کے لیے خاصا انتشار پھیل گیا۔ بالآخر نظم و ضبط بحال ہوا اور فوج نیند میں غرق ہوگئی جس کی اُسے بہت ضرورت تھی۔

تاہم ۲۱ اپریل کی صبح تک یہ واضح ہوگیا کہ ناکام شب خون نے تیزی سے حالات کو نازک بنادیا تھا۔ بابر کے پاس خبر آئی کہ افغان اپنی طویل بے عملی سے پوری طرح بیدار ہوکر جنگی صف آرائی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ کابلی سپاہی پھرتی سے مسلح ہوکر گھوڑوں پر سوار ہوگئے۔ اس کے قبل کہ آگے بڑھتے ہوئے افغان آہستہ آہستہ زرد

ہوتے ہوئے آسمان کے پس منظر میں فاصلے پر نظر آئیں، بابر کے آدمی اپنا مورچہ سنبھال چکے تھے۔

کابلی لشکر کو روایتی ترتیب میں آراستہ کیا گیا تھا ـــــ وہ ترتیب جس کا تکملہ و اتمام اگرچہ تیمور نے کیا تھا لیکن اس کے تمام اصلی لوازم اہلِ چین کی قدیم فوجی روایات میں پائے جاتے ہیں ـــــ میمنہ۔ قلب۔ میسرہ اور مقدمۃ الجیش (ہراول) اُسی طرح موجود تھے جس طرح کہ 'سن زو' کے مصنف نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ضروری قرار دیے تھے مگر ایک بڑی فوج محفوظہ اور ہر ایک بازو کے سرے پر خفیف دستوں کی موجودگی نیز قلب کی دو حصّوں یمین و یسار میں تقسیم ایسی نئی اصلاحی ترمیمات ہیں جن پر بڑی حد تک تیمور کی کامیابی کا دار و مدار تھا۔ دائیں طرف سے بائیں طرف نظر ڈالی جائے تو بڑے بڑے سردار اس ترتیب سے تعینات کیے گئے تھے: ـــــ صف کے آخر میں میمنہ خفیفہ (طلغمہ) پر ولی کازل[1]، ملک قاسم اور بابا کشک[2] منگول سپاہیوں کی ایک جماعت کی قیادت کر رہے تھے۔ اس جماعت کو پانی پت شہر کی عمارات سے مدد ملتی تھی۔ اس کے بعد اصل میمنہ تھا جس کی قیادت ہمایوں کے سُپرد تھی۔ اس کی مدد کے لیے وفادار سرداروں کی ایک جماعت تھی جس میں خواجہ کلاں، سلطان محمد دولدئی، ہندو بیگ، ولی خازن اور پیر قلی سیستانی شامل تھے۔ آگے بائیں طرف بڑھ کر قلب یمین تھا، جس میں چن تیمور سلطان، سلطان سلیم مرزا[3] محمد کاکلتش، شاہ منصور برلاس، یونس علی، درویش محمد ساربان اور عبداللہ کتابدار متعیّن تھے۔ قلب یسار میں معتمد خلیفہ، خواجہ میر میرن، احمدی پروانچی، تردی بیگ، کوچ بیگ، محمد علی خلیفہ اور مرزا بیگ ترخان تھے۔ اس فوجی جماعت کے بائیں[4] طرف میسرہ کی اصل جمعیت تھی جس میں محمد سلطان مرزا، مہدی خواجہ،

---

[1] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۳) Red Wall لکھا ہے۔ غالباً یہ ولی قزلباش کا ترجمہ ہے۔

[2] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۳) بابا قشقہ لکھا ہے۔ (مترجم)

[3] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۵) میں نام سلیمان مرزا دیا ہے (مترجم) اور اگلا نام محمد کوکلتش ہے۔

[4] کتاب میں شاید غلطی سے Left چھپ گیا ہے۔ (مترجم) دراصل Right ہونا چاہیے۔

عادل سلطان، شاہ میر حسین، سلطان جنید برلاس تغلق قدم، جان بیگ، محمد بخشی، شاہ حسین بارگی اور مغل غنچی موجود تھے[1]۔ صف کے بائیں انتہائی سرے پر، خندق اور گرائے ہوئے پیڑوں کی اباتیوں (مورچہ بندیوں) کا سہارا لیے ہوئے میسرہ خفیفہ (طلغمہ) تھی جس میں کراگزی[2] ابوالمجاہد نرزا (؟ نیزہ[3]) باز، شیخ علی، شیخ جمال بریں، مہدی و تنگری قلی مغل تھے۔ اب رہے ہراول، فوج محفوظہ اور سب سے اہم توپخانہ ــــ ہراول کی قیادت خسرو کاکلتش اور محمد علی جنگ کے سپرد تھی۔ اگرچہ موخر الذکر امیر ٹانگ میں تیر کا زخم آنے سے معذور ہوگیا تھا جو شب خون کی ناکامی کے بعد پسپائی کے وقت لگا تھا لیکن اُس کی شہرت اور وقار نے اُسے اِس خطرناک منصب کا اہل بنا دیا تھا۔ فوج محفوظہ کی کمان میر آخر میر عبدالعزیز کے سپرد تھی۔ پورے محاذ کے اگلے حصے میں ڈھسوں اور گاڑیوں کی آڑ میں توپخانہ و بندوقچی رکھے گئے تھے۔ استاد علی[4] بھاری توپوں کے ساتھ قلب کے دائیں طرف متعین تھا اور مصطفا جس کی قیادت میں بندوقیں اور دوسری ہلکی توپیں تھیں، محاذ کے بائیں حصے کا ذمہ دار تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ بابر خود اپنی فوج کے قلب کے نزدیک کہیں ایسی جگہ تھا جہاں سے کہ وہ لڑائی کا پورا حال دیکھ سکتا تھا اور واقعات کے تقاضے کے مطابق نقشۂ جنگ میں مناسب تغیر و تبدل کرسکتا تھا۔ وہ سبقت کا فائدہ دشمن کو سونپنے پر تیار نہ تھا اور اس نے خفیف دستوں کو آگاہی دے دی تھی کہ دشمن جیسے ہی بڑھ کر حد رسائی میں آجائے وہ اس پر فوراً ضرب لگانے کو تیار رہیں۔

---

[1] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۲ و نوٹ) میں پورا ایک نام شاہ حسین یارگی مغل غانچی ہے۔ (یعنی شاہ حسین بن یارگی مغل غانچی)

[2] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۳) میں نام قراقوزی لکھا ہے۔

[3] 'بابرنامہ' (بیورج، ص ۴۷۳) ابوالمحمد نیزہ باز۔

[4] استاد علی کا ذکر تزک میں 'فرنگی' اور بھاری توپخانہ کے تنظیم کی حیثیت سے آیا ہے۔ مصطفا باجور کے محاصرے سے پہلے بابر کے ساتھ شامل نہ تھا جس میں استاد علی نے بندوقچیوں اور توپخانہ دونوں کا کام سنبھالا تھا۔

جب افغان نظر آئے تو یہ ظاہر ہوگیا کہ ان کا جھکاؤ مغلوں کے میمنہ پر ہے۔ بظاہر ابراہیم پانی پت کے شہر سے بچنے کے لیے جس پر کہ بابر کا میمنہ قایم تھا، اپنے میسرہ کو آگے بڑھا رہا تھا۔ افغانوں کو ایک ایسے محاذ پر حملہ کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی جو ان کی توقعات سے کہیں زیادہ چھوٹا تھا۔ اس چیز نے اُن کو بوکھلا دیا اور ان کی صفوں میں نمایاں طور پر ایک قسم کا انتشار پیدا کر دیا جس سے فائدہ اٹھانے میں اُن کے حریف نہیں چُوکے — جیسا کہ بابر بیان کرتا ہے۔ سلطان ابراہیم کے سپاہی سُرعت سے آگے بڑھتے رہے اور صرف اسی وقت وہ ہچکچائے جب اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ بابر کی بااحتیاط انتخاب کردہ زمین اُن کے میسرہ کے فعل و عمل میں کس قدر رُکاوٹ ڈال رہی ہے۔ ان کی فوج کا اگلا حصّہ بُری طرح دب کر مُڑتڑ گیا تھا اور اگرچہ اُنھوں نے فوری تدبیر کے طور پر اپنی صف کو خم دے کر میسرہ کو دباؤ ڈالنے کے لیے آگے بڑھا دیا تھا لیکن اپنی پوری طاقت کے استعمال کے لیے ان کے پاس کافی جگہ نہ تھی۔ (اس طرح) ان کی تعداد کی برتری ان کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کی شکست کا سبب بن گئی۔

بابر نے تیزی سے سمجھ لیا کہ دشمن کے میسرہ کا اس کے میمنہ سے جنگ کے ابتدائی دور ہی میں تصادم ہوگا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں اس کی صف محض (دشمن کی) تعداد کے بوجھ ہی سے نہ ٹوٹ جائے اُس نے اپنی تمام فوج محفوظ ان دستوں کی مدد کو بھیج دی جو کہ اس مخدوش مقام پر متعین تھے۔ لیکن جیسے جیسے افغان قریب تر آتے گئے اُن کا محاذ اور زیادہ مُڑتا تڑتا گیا۔ اور آخر کار اگلی صفیں اس شش و پنج میں رک گئیں کہ ان ناموافق حالات میں حملہ کریں یا واپس لوٹ کر خود کو از سر نو منظم کریں۔ پچھلی صفوں نے جو بدستور آگے بڑھ رہی تھیں فطری طور پر اُن کو دھکیل دیا اور جلد ہی تمام فوج میں خاصی ابتری پھیلا دی۔ ایک وہبی سپہ سالار کی جلّت سے کام لیتے ہوئے بابر نے حریف کے پس و پیش کے ان لمحات کا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اُس نے اپنی دونوں خفیف جماعتوں کو حکم دیا کہ دشمن کی بے ترتیب محاذ کے دونوں سروں پر سے تیزی سے گھوم کر عقب پر ایک زبردست حملہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی میمنہ اور میسرہ پوری قوت کے ساتھ سیدھے آگے بڑھے اور توپوں اور بندوقوں نے قلب سے ایک غضب ناک آگ برسانا شروع کی۔ جلد ہی دونوں بازوؤں پر جنگ بہت شدید ہوگئی اور باہم

قلب یسار سے کچھ دستے میسرہ کی کمک کے لیے الگ کرنے اور اس طرح اپنا قلب کمزور کرنے پر مجبور ہوگیا۔ میمنہ کی طرف عبدالعزیز اور فوج محفوظ نے جو مدد فراہم کی تھی وہ بظاہر کافی تھی۔ اس لیے قلب یمین کے دستے جنگ سے الگ کھڑے تھے اور بابر نے ان کو حکم دیا کہ دشمن کی سامنے کی صفوں پر حملہ کریں۔ افغان اب پہلے سے بھی زیادہ آپس میں دھنسے پڑتے تھے کیوں کہ اُن کے بازوؤں اور عقب پر ہونے والے حملوں نے ان کے بازوؤں کو بدترین ابتری کی حالت میں ان کے قلب پر دھکیل دیا تھا۔ سب طرف سے دشمن کے نرغے میں آنے کی وجہ سے سلطان ابراہیم کی فوج کچھ بھی نہ کرسکی۔ ہتھیاروں کے استعمال کے لیے سپاہیوں کے پاس جگہ ہی نہ تھی اور ان کے حملے بے اثر تھے۔ استاد علی اور مصطفا دشمن کی صفوں کے غولِ بے ہنگام پر موت کی بارش کر رہے تھے اور بدقسمت افغان مغلوں کے تیروں اور تلواروں کے نیچے ہزاروں کی تعداد میں ڈھیر ہو رہے تھے۔ آپس میں گتھ کر ایک ٹھوس انبار کی شکل اختیار کرنے کی وجہ سے سلطان ابراہیم کے آدمی نہ تو آگے بڑھ سکتے تھے اور نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ کچھ گھنٹوں تک یہ قتل عام جاری رہا۔ معرکہ چھ بجے صبح شروع ہوا تھا اور دوپہر تک افغان بُری طرح ہزیمت اٹھا چکے تھے اور جو بھاگ سکتے تھے وہ اپنی جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے۔ سلطان ابراہیم کا لشکرِ عظیم مکمل طور پر شکستہ ہوچکا تھا اور نقصانات ہیبت ناک ہوئے تھے۔ میدانِ جنگ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ خود سلطان ابراہیم کی لاش کے گرد، جس نے ایک بہادر افغان کی طرح جان دی تھی، اُس کے پانچ چھ ہزار شجاع ترین نبرد آزما مُردہ پڑے ہوئے تھے۔ میدان کے دیگر حصّوں میں پندرہ سولہ ہزار مزید لاشیں شمار کی گئیں (جن کو ملاکر، کُل جانی نقصان تقریباً بیس ہزار تھا۔ اس طرح بابر کی مختصر فوج نے اپنی تعداد سے تین گنا زیادہ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا ـــــ یہ ایک ہولناک ثبوت تھا اس سپہ سالار کی ہُنرمندی کا بھی اور سوار فوج اور توپخانہ کے باقاعدہ اتحادِ عمل کی ہلاکت آفرینی کا بھی ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ خود بابر کا نقصان بالکل ناقابلِ لحاظ ہوا تھا۔

پھر جنگ پانی پت کی اہمیت کا اندازہ صرف اُن لوگوں کی تعداد ہی سے نہیں لگایا جاسکتا جو کھیت رہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ جنگ نمایاں طور پر فیصلہ کن تھی۔ لودی خاندان کا سلسلۂ حکومت ٹوٹ گیا اور ان کا اقتدار اجنبیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ فی الوقت

یہ معلوم ہوتا تھا کہ افغان طاقت بھی بالکل ٹوٹ گئی۔ دوآبہ میں افواہ یہ تھی کہ ہلاک ہونے والوں کا حقیقی شمار چالیس پچاس ہزار ہے اور عرصے سے دیہات میں یہ میدان ایک آسیب زدہ مقام کی حیثیت سے بدنام رہا تھا جہاں سے "مارو!" — "پکڑلو!" — "قتل کردو!" — "مارڈالو!" کی آسیبی صدائیں انسانی کراہوں اور ہتھیاروں کی جھنکار کے ساتھ مل کر رات گئے راہ گیروں کو دہشت زدہ کیا کرتی تھیں۔ اس تباہی کا ہندوؤں پر جو تاثر ہوا وہ بڑا زبردست تھا۔ بہت ممکن ہے انھوں نے یہ سوچا ہو کہ افغان سلطنت اُس شاندار خاندان کے آخری فرد کے ساتھ ختم ہوگئی ہے جس نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ بات صحیح نہ تھی، اس کا بہت کافی ثبوت ہمیں بابر کے بیٹے کے عہدِ حکومت میں شیرشاہ کے کارناموں سے ملتا ہے۔

پانی پت کی جنگ کے ساتھ ہی بابر کی فتحِ ہندوستان کے منصوبے کا دوسرا دور ختم ہوجاتا ہے۔ دہلی کے برسرِاقتدار خاندان کو درحقیقت ایسی زبردست تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اس کا بحال ہونا ناممکن تھا لیکن ابھی بابر کے سامنے اُس جگہ کو خود پُر کرنے کا اہم کام باقی تھا جو خالی پڑی تھی۔ اس چیز کا پورا احساس کرتے ہوئے بابر اپنی فتوحات پر تکیہ کرکے نہیں بیٹھ گیا۔ ابھی اس کی فوج اپنی مشقت کے بعد سستا ہی رہی تھی کہ اس نے شہزادہ ہمایوں اور خواجہ کلاں کی ماتحتی میں ایک جماعت آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجی جو سلطان سابق کی عمومی رہائش گاہ تھا اور دوسری جماعت محمد خواجہ، محمد سلطان اور عادل سلطان کی قیادت میں دہلی کے خزانوں و قلعوں پر تسلط جمانے کے لیے روانہ کی[1] آرام سے تین منزلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد فوج دہلی کے مقابل جمنا کے کنارے پر پہنچ گئی اور بابر اپنے فطری جوشِ عقیدت کے ساتھ غیاث الدین، علاء الدین اور دیگر مشہور فاتحین کے مزاروں پر گیا۔ پھر شہر میں ایک عارضی حکومت قایم کرکے ولی کزل کو شقدار اور دوست کو دیوان بنادیا اور خود آگرہ کی جانب بڑھ گیا جہاں کہ ہمایوں نے اس کا بہت محبت آمیز استقبال کیا۔ اسی موقعے پر شہزادے نے اپنے باپ کو وہ مشہور ہیرا (کوہِ نور) نذر کیا جس کی قیمت تمام دنیا کے آدھے دن کے اخراجات

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۱۷۰ ۔ المنتخب، ص ۳۴۶

(کے برابر) لگائی جاتی ہے اور جو گوالیار کے راجہ کے رشتے داروں نے آگرہ کی فتح کے موقع پر اپنے ساتھ کیے گئے شائستہ و باعزت سلوک کے بدلے میں اظہارِ ممنونیت کے طور پر اس کو پیش کیا تھا۔ بابر نے اپنی مخصوص فیاضی سے کام لے کر ہیرا فوراً اپنے بیٹے کو واپس دے دیا۔

اپنے معمول کے مطابق بابر ہندوستان کے کلیدی مقامات پر اپنے تسلط کی داستان کا اختتام نئے ملک کے متعلق اپنے تاثرات کے اظہار پر کرتا ہے۔ جیساکہ کابل کے مناظر اور آب و ہوا کے ساتھ اس کے خصوصی تعلق خاطر کی بنا پر توقع کی جاسکتی ہے، شروع شروع میں یہ تاثرات خوشگواری کے برعکس تھے۔ اس کے بعض بیانات بہت اہم ہیں جن سے ملک کی حالت پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اس چیز پر بڑی حیرانی کا اظہار کرتا ہے کہ یہاں شہروں کا عروج و زوال کس قدر اطمینان و آسانی سے ہوجاتا ہے اور زمین کو کتنی بے دلی سے بنجر بننے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ شہریوں کی اس پریشان کن عادت پر رائے زنی کرتا ہے کہ جب اُن سے محاصل ادا کرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ گھر بار چھوڑ کر جنگل میں چلے جاتے ہیں جہاں ان کا پیچھا نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً اُسے یہ اندازہ نہیں کہ یہ دونوں خصوصیات نتیجہ تھیں اس مزمن طوائف الملوکی کا جو صرف چند درمیانی وقفوں کے علاوہ سابقہ پوری صدی کے دوران قایم رہی تھی۔ ہندوستان کے باشندے خود اس کے اپنے اہلِ کابل سے کس قدر زیادہ مختلف تھے، اس کے احساس پر متنفر ہوکر وہ بے جا تعمیم کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے یہاں کے لوگوں کو دہقانوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے:

"اگرچہ ہندوستان فطرت کی دل کشی و رعنائی سے معمور ہے[1] لیکن اس کے باشندے دل کشی و رعنائی سے محروم ہیں اور ان کے تعلقات میں نہ تو دوستانہ ارتباط و محبت ہے، نہ وفاکیشی و استواری ــــ اُن کو کوئی فطری کمال، کوئی فہم و فراست، کوئی حُسنِ اخلاق ــــ کوئی جذبۂ فیض رسانی

---

[1] مسز بیورج کے ترجمے کے مطابق تو "ہندوستان میں بہت کم دل کشی ہے اور اس کے لوگوں میں حُسن کی کمی ہے ...." بابر نامہ (بیورج)، ص ۵۱۸

اور کوئی صحت احساس حاصل نہیں۔ صنعت و حرفت میں ان کے طریقوں کی طرح ان کے تصورات میں بھی فن کاری اور اصول و نظریے کا فقدان ہے۔ یہاں نہ حمام ہیں، نہ موم بتیاں، نہ مشعلیں، نہ اسکول۔ یہاں تک کہ شمع دان بھی نہیں۔''

لیکن وہ تسلیم کرتا ہے کہ ان عیوب کی تلافی کرنے والے کچھ اوصاف بھی موجود ہیں

''علاقوں کی زبردست وسعت کے علاوہ ہندوستان کی ایک بڑی فوقیت وہ ٹکسالی اور غیر ٹکسالی سونا بھی ہے جو وافر مقدار میں وہاں ملتا ہے۔ پھر برسات کے زمانے میں موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری بڑی فوقیت تمام باافراط صنعتوں اور پیشوں کے لاتعداد کاریگر ہیں۔ شاید اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں اگر یہ ملحوظ رکھا جائے کہ صنعتیں یہاں خاندان کا پیشہ ہوتی ہیں اور باپ سے بیٹے کو ورثے میں ملتی ہیں۔''[1]

لیکن یہ عجیب ملک جو اضداد سے اس درجہ معمور تھا، ابھی فتح ہونا باقی تھا۔ تاہم بابر کے قبضے میں اُس سونے کا بہت سا حصہ آچکا تھا جس کا اُس نے ذکر کیا ہے اور اب اُس نے اس سونے کو بے دریغ فیاضی سے خرچ کرنا شروع کر دیا۔ نہ صرف اُس کے بیٹوں، رشتے داروں اور اُس کے خاص ساتھیوں کو اپنے آقا کی کامیابی کی یادگار میں بہت کچھ انعام واکرام حاصل ہوا بلکہ اس کے علاوہ مکہ اور مدینہ کے مقاماتِ متبرکہ کو نذرانے بھیجے گئے اور کابل میں ہر شخص کو ایک چاندی کا سکہ[2] ملا۔[3]

شدید تشویش کے ایک دور میں مال غنیمت کی یہ تقسیم ایک خوشگوار وقفہ ثابت

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹل، دوم، ص ۲۲۶ – ۲۳۰۔ الفنسکی، ص ۳۴۷، ۳۴۸

[2] شاہرخی۔

[3] بابر نے کس طرح اپنے رشتے داروں میں سے ہر ایک کو خاص تحائف کس احتیاط سے بھیجے اُس کے لیے ملاحظہ ہو 'ہمایوں نامہ' ورق ۱۱، ۱۲۔ بابر نے اپنے لیے اتنا کم رکھا کہ اُسے مذاق میں قلندر کہا گیا۔ فرشتہ، دوم، ص ۳۹

ہوا ہوگا۔ جب تک فتح یابی کی ابتدائی منزلیں طے نہ ہوگئی ہوں گی، بابر کو اس کارِ عظیم کی وسعت کا اندازہ نہ ہوسکا ہوگا جو اس کے سامنے تھا۔ ہر جگہ افغان قبائل کے رہنماؤں نے خود مختار سرداروں کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور کسی مناسب قلعے میں خود کو مستحکم کرلیا تھا۔ قاسم سنبھلی نے سنبھل میں۔ نظام خاں نے بیانہ میں۔ حسن خاں میواتی نے میوات میں۔ محمد زیتون نے دھولپور میں۔ تاتار خاں سارنگ خانی نے گوالیار میں۔ حسن خاں لوہانی نے رابیری میں۔ قطب خاں نے اٹاوہ میں۔ عالم خاں نے کالپی میں اپنے پاؤں جمالیے تھے۔ بابر کہتا ہے:

"یہ بدبخت بے دین اُن تمام شورشوں اور فسادوں کو بھڑکا رہے تھے جن میں ہم گھرے ہوئے تھے"۔

اور بات صرف اتنی ہی نہ تھی۔ قنوج اور گنگا پار کا تمام علاقہ اب بھی کلّی طور پر ناصر خاں لوہانی اور معروف فارمولی جیسے زبردست دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ اس نواح کے افغانوں نے ایک شخص بہادر خاں بن دریا خاں کو سلطان محمد کے نام سے بادشاہ بنادیا تھا۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ اپنی فوج کے لیے فراہمیِ رسد میں انتہائی دقّت پیش آرہی تھی۔ گاؤں والے اُس سے بھاگ کر ڈکیتی کرنے لگے تھے۔ سڑکیں خطرناک تھیں۔ غذا یا چارہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ موسم گرما نزدیک تھا اور سرداروں کی ہمت نے جواب دینا شروع کردیا تھا۔ ان کی توتے کی سی رٹ کہ "کابل واپس چلو" بابر کو دق کر رہی تھی اور وہ بہت تلخی سے ان کی اس مسلسل رٹ کی شکایت کرتا ہے۔ اس دُشوار صورتِ حال میں بادشاہ نے حسبِ معمول اپنی تمام تر ہمّت و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ اس کے کردار کی حقیقی قوت کا انکشاف ایسے نازک موقعوں پر ہی سب سے بہتر طور پر ہوتا ہے۔ اُس نے ایک مشاورتی مجلس طلب کی اور اپنے سرداروں سے صاف صاف پوچھا کہ کیا وہ تھوڑی ہی ہمّت کی کمی کی وجہ سے اتنے شاندار موقع کو ہاتھ سے گنوا دینا چاہتے ہیں؟ —— وہ کہتا ہے:

"میں نے اُن کو بتادیا کہ سلطنت و نصرت کا وجود جنگ کے سامان و وسائل کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا —— بادشاہت و امارت کا وجود رعایا اور محکوم صوبہ جات کے بغیر قایم نہیں رہ سکتا۔ برسوں کی مشقّت کے

ذریعے اور انتہائی صعوبتیں اٹھاکر ــــــ بہت دشوار مسافتیں طے کرکے اور متعدد بار فوجیں اکٹھا کرکے ــــ اپنی فوجوں کو اور خود کو انتہائی خطرناک حالات میں ــــ جنگ و جدل میں اور خون خرابے میں ڈال کر فضل الٰہی سے میں نے اپنے زبردست دشمن کو پسپا کرڈالا اور متعدد صوبوں اور سلطنتوں پر وہ فتح حاصل کی جو فی الوقت ہمیں حاصل ہے۔
پھر کون سی قوت ہمیں مجبور کرتی ہے ــــ کون سی صعوبت ہمیں ستاتی ہے کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر اور اپنی زندگی اپنے مطلوبہ کارنامے کی تکمیل میں صرف کرنے کے بعد، اپنی فتوحات کو چھوڑکر فرار ہوجائیں اور مایوسی و ناکامی کی ہر ایک علامت لیے ہوئے کابل لوٹ جائیں؟ آج سے کوئی بھی شخص جو خود کو میرا دوست کہتا ہے کبھی ایسی تجویز پیش نہ کرے۔ لیکن اگر تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو یہاں رہنے پر خود کو تیار نہیں کرسکتا، یا واپسی کا ارادہ ترک نہیں کرسکتا تو اس کو رخصت ہونے دو ــــــ میری اس منصفانہ اور معقول تجویز کے بعد غیر مطمئن لوگ خواہ کتنی ہی ناراضامندی سے سہی مگر بہرحال اپنا بغاوت آمیز مقصد ترک کرنے پر مجبور ہوگئے۔"[1]

اس اپیل کا نتیجہ بالکل اُمید کے مطابق ہوا، ایک دو کے علاوہ جن کی ہمت سنگین طور متاثر تھی، اُس کے تمام افسروں نے اپنے آقا کی اعانت کا فیصلہ کرلیا۔

جب بابر کے متعلق ملک میں مستقل قیام کا فیصلہ عام طور پر معلوم ہوا تو اس سے صورت حال پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اوّل یہ کہ سنگرام سنگھ کو، جسے اُمید تھی کہ بابر لودی خاندان کی طاقت کو چُور چُور کرنے کے بعد میدان راجپوتوں کے لیے خالی چھوڑکر واپس چلا جائے گا، اب احساس ہونے لگا کہ شاہ کابل نہ صرف غیر شعوری دوست نہیں بلکہ ایک شعوری دشمن ہے۔ بس اسی لمحے سے راجپوت ریاستی اتحاد اقتدار اعلا کے حصول کی اس آخری کوشش کے لیے تیاریاں شروع کردیتا ہے جو ایک طویل مدت سے اس کا ایک محبوب منصوبہ رہی تھی لیکن جو زیادہ مدت گزرنے سے قبل ہی اس کی طاقت کے لیے اس درجہ

---

[1] لیڈن و ارسکن، ص ۳۳۹ - المنسکی، ص ۳۸۲، ۳۸۳ - پی۔ ڈی۔ کورٹل، ص ۲۳۶، ۲۳۷

تباہ کن ثابت ہونے والا تھا۔ لیکن دوئم یہ کہ جب تک ایسا نظر آتا تھا کہ مُلک ایک بار پھر طوائف الملوکی میں مُبتلا ہونے والا ہے اس وقت تک چھوٹے چھوٹے سردار صرف اپنے لیے لڑنے کا ارادہ کر رہے تھے مگر جیسے ہی اُنھیں اندازہ ہوا کہ بابر ایک محض چھاپہ مار نہیں بلکہ صحیح معنی میں ایک فاتح ہے، اُنھوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور اُس کی اطاعت قبول کرلی۔ دوآبہ میں کول کا ایک اہم سردار شیخ گھورن اپنے تحفظ کی یقین دہانیاں پاکر بابر کی طرف آگیا۔ وہ تقریباً دو ہزار آدمی اپنے ساتھ لایا جو سب بابر کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ مصطفےٰ فارمولی کا بھائی اور جانشین شیخ بایزید جو کہ مشرقی باغی اُمرا کے خلاف مرحوم سلطان کا نائب رہ چکا تھا، بابر کی خدمت میں داخل ہوگیا اور اُسے اودھ میں ایک کروڑ کی جاگیر مل گئی۔ فیروز خاں، محمود خاں لوہانی اور دوسرے اہم اُمرا بھی اس وقت بابر سے آملے اور انھوں نے گراں قدر جاگیریں حاصل کیں۔

ہوا کا رُخ رفتہ رفتہ بابر کی موافقت میں بدلتا گیا۔ تمام اطراف سے لوگ اُس کی موافقت میں اُمنڈ پڑے اور انجام کار وہ مُلک کی باقاعدہ تسخیر کا کام شروع کرنے کے قابل ہوگیا۔ اس نے ایک تدبیر سوچی جس نے بہ یک وقت اُس کے ساتھیوں کو بھی مطمئن کر دیا اور زیادہ سے زیادہ علاقے پر اس کا تسلط بھی قایم کر دیا۔ اُس نے وہ شہر اور قلعے جو ابھی غیر مفتوحہ تھے لوگوں کو عطیے کے طور پر دے دیے اور پھر اُنھیں چھوٹی چھوٹی فوجوں کے ساتھ اُن پر قبضہ پانے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح سنبھل آخر کار ہمایوں کو ملا۔ رابیری محمد علی جنگ کو۔ اٹاوہ مہدی خواجہ کو۔ قنوج سلطان محمد دولدئی کو اور دھولپور سلطان جنید برلاس کو ـــــ یہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں انتہائی جوش سے لڑیں کیوں کہ اُنھیں احساس تھا کہ وہ خود اپنی قسمت بنا رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو علاقے اس طرح حاصل ہو رہے تھے وہ ان کے آقا کی مملکتوں میں توسیع کے مترادف تھے۔ جس زمانے میں یہ چھوٹی مہمیں جاری تھیں، بابر نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ اپنے خاص محارب لشکر کو غیر ضروری طور پر کمزور نہ ہونے دیا جائے، چنانچہ اب اس نے ایک شورائے جنگ طلب کی۔

اس وقت اس کے دو خاص حریف تھے جن سے اُسے نپٹنا تھا ـــــ ایک تو افغان باغی جنھوں نے بہادر خاں کو حکمراں بنالیا تھا۔ دوسرے سنگرام سنگھ جس نے انتشار سے فائدہ اُٹھاکر رنتھنبور کے نزدیک کندر (قندھار) کے مستحکم قلعے پر محاصرہ کر کے قبضہ

کرلیا تھا۔ ان میں سے اوّل الذکر اس وقت زیادہ خطرناک معلوم ہو رہا تھا ـــــ واقعتاً بابر کی شورائے جنگ کے اراکین راجپوتوں کی طاقت کا اصلیت سے کم اندازہ لگانے کا نمایاں رجحان رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ سنگرام سنگھ بہت دُور ہے اور یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ وہ نزدیک آنے کی طاقت رکھتا بھی ہے یا نہیں[1] اس کے برعکس ناصر خاں لوہانی اور معروف فارمولی چالیس پچاس ہزار آدمیوں کے ساتھ بڑھ چکے ہیں اور قنوج پر قبضہ کرلیا ہے اس وجہ سے اُن کے خلاف فوری اقدام کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُن کے خلاف پیش قدمی کرنے کے لیے ہمایوں کو وہ فوجیں دے کر روانہ کردیا گیا جو دھولپور اور اٹاوہ کی مہمات پر جانے والی تھیں۔ وہ ثابت قدمی سے گنگا کے بہاؤ کی طرف آگے بڑھا اور ابھی وہ جاجمؤ سے بیس میل کے فاصلے ہی پر تھا جہاں باغیوں کے سردار مجتمع تھے کہ اُن کی فوجیں اس کا انتظار کیے بغیر فرار ہوگئیں۔

اس درمیان بابر آگرے میں رہا اور آئندہ جدوجہد کے لیے خود کو مستحکم کرنے باغی قلعوں کے خلاف شروع ہونے والی مہم کے لیے اپنے نو حاصل کردہ وسائل کو منظّم کرنے اور خالی وقت کو تفریحی باغات لگانے میں صَرف کرتا رہا جو خود اس کے الفاظ میں " حسن و تناسب سے بھرپور ہیں"۔ اُس نے حمام بنوانے پر خاص توجہ دی جو بقول اُس کے ہندوستان کی تین لعنتوں گرمی، گرد اور لُو سے پناہ دیتے ہیں۔ مُلکی باشندوں نے طرزِ تعمیر کی جدّت سے متاثر ہوکر اُس علاقے کو جہاں یہ نئی عمارتیں تھیں 'کابل' کا نام دے دیا۔

اس وقت بابر کا اصل خیال یہ تھا کہ سنگرام سنگھ کے ساتھ آخری زور آزمائی سے پہلے تمام چھوٹے خود مختار افغان سرداروں کو اطاعت پر مجبور کردیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے سامانِ محاصرہ کو ٹھیک کیا اور ایک دیوپیکر توپ بنوائی۔ دھات کو پگھلانے کے لیے آٹھ بھٹیاں استعمال کی گئیں اور پھر بھی بڑے بڑے سانچے بھر نہ سکے۔ توپ خانے کا افسر اعلا استاد علی خاں رنج و شرم سے بے قابو ہوگیا اور خود کو پگھلے ہوئے کانسے میں ڈالنے ہی والا تھا کہ بابر نے بڑی مہر و شفقت سے اس کی دلجوئی کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ (توپ کی) نال تو بالکل دُرست تھی اور کلّہ دان الگ سے ڈھالا جاسکتا تھا۔ آخر وہ زبردست توپ

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۲۴۵، ۲۴۶۔ الفنسٹی، ص ۳۸۷

تیار ہوگئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اُس کی مار سولہ سو قدم تھی تو بابر بہت خوش ہوا۔ لیکن ٹھیک اس وقت جب وہ بیانہ اور دیگر مستحکم مقامات کے خلاف میدان میں آنے کی تیاری کر رہا تھا اُسے اطلاع ملی کہ راجپوت حرکت میں آچکے ہیں۔ یہ واقعہ راجپوتوں کے زبردست ریاستی اتحاد کی ہیبت کا آئینہ دار ہے کہ ان کے ارادوں کی اوّلین خبریں ہی بیانہ، گوالیار[1] اور دوسرے قلعوں کے بخوشی بابر کی اطاعت قبول کرنے کو کافی ہوئیں۔ بادشاہ نے یہ اندازہ کرکے کہ اب ضائع کرنے کو بالکل وقت نہیں ہے جہاد کا اعلان کردیا[2] اور شہزادہ ہمایوں کو جس نے حال ہی میں غازی پور، جونپور اور کالپی پر قبضہ کرکے ایک شان دار مہم کو مکمل کیا تھا، واپس بلالیا۔ اب بابر پھر خود آگرے میں تھا اور راجپوتوں سے زندگی و موت کی جنگ کے لیے تمام انتظامات مکمل کر رہا تھا۔ خاص اس نازک موقع پر دسمبر ۱۵۲۶ء میں ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ مرحوم سلطان ابراہیم کی ماں بابر کو زہر دینے میں کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بابر کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اُس نے زہرآلود غذا کا قلیل ترین ممکن حصّہ کھایا تھا جس میں خود منشا سے کم زہر ملا تھا۔ اگر وہ مرجاتا یا عرصے کے لیے معذور ہوجاتا تو اُس سلطنت کو کوئی چیز نہ بچاسکتی جس کی وہ تعمیر کر رہا تھا اور راجپوت ہندوستان میں اعلاترین قوت بن جاتے۔

ذیل میں اُس واقعے کا اس کا اپنا بیان ہے جو کہ کابل ایک خط میں اس نے تفصیل سے لکھا تھا:

'بدبخت خاتون' ابراہیم کی ماں نے سُن رکھا تھا کہ میں نے ہندوستانیوں کے ہاتھ کی کچھ چیزیں کھائی ہیں۔۔۔۔ اس خاتون نے یہ حال سُن کر

---

[1] گوالیار میں تاتارخاں نے اطاعت اختیار کرنے کا ارادہ بدل دیا اور جو افسران چارج لینے گئے تھے، اُن پر پھاٹک بند کردیے گئے لیکن غدّاری کی وجہ سے شہر فوراً (بابر کے) قبضے میں آگیا۔

[2] بدایونی ایک قصّہ بیان کرتا ہے کہ فوجوں کی ایک مجلس شوریٰ میں یہ تجویز ہوئی کہ بابر آگرہ پر قبضہ استوار کرکے سنگرام سنگھ کی بےپناہ قوت کی وجہ سے پنجاب لوٹ جائے۔ یہ تجویز اگر کبھی سنجیدگی سے سامنے رکھی بھی گئی تھی تو فوراً نامنظور کردی گئی۔

احمد (خاصہ چش) چاشنی گیر کو بلانے کے لیے ایک شخص کو اٹاوہ بھیجا اور ایک کنیز کو ایک تولہ زہر تہہ شدہ کاغذ میں لپیٹ کر دیا کہ چاشنی گیر کو دے دیا جائے۔ احمد نے اُسے میرے باورچی خانہ کے ایک ہندوستانی باورچی کو دیا اور اُسے چار پر گنے دینے کا وعدہ کر کے ورغلایا اور خواہش کی کہ کسی نہ کسی طرح اُسے (زہر کو) میرے کھانے میں ڈال دے ـــــ اُس (ابراہیم کی ماں) نے ایک اور کنیز کو اُس کنیز کے پیچھے بھیجا جس کو زہر احمد تک پہنچانے کے لیے دیا گیا تھا تاکہ یہ دیکھے کہ پہلی کنیز نے زہر حوالے کر دیا کہ نہیں .... اُس (باورچی) نے زہر دیگچی میں نہ ڈالا کیوں کہ میں نے چاشنی گیروں کو سخت ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ ہندوؤں پر نظر رکھیں اور جب کھانا پک رہا تھا تو انھوں نے دیگچی میں سے کھانا چکھا تھا۔ جب گوشت قابوں میں نکالا جا رہا تھا تو میرے مردود چاشنی گیر غافل رہے اور باورچی نے زہر مہین چپاتیوں کی قاب پر ڈال دیا۔ کاغذ میں جو زہر تھا اس میں سے اس نے آدھے سے زیادہ چپاتیوں پر نہیں ڈالا، پھر کچھ گھی میں تلا ہوا گوشت ان چپاتیوں پر رکھ دیا۔ اگر اُس نے تلے ہوئے گوشت کے اوپر یا دیگچی میں ڈال دیا ہوتا تو زیادہ خطرناک ہو جاتا۔ لیکن اُس نے گھبراہٹ میں بیشتر چولہے میں گرا دیا۔ جُمعہ کو بعد نماز کھانا لگایا گیا۔ مجھے خرگوش (کے گوشت) کا بہت شوق تھا اس وجہ سے میں نے تھوڑا سا وہ بھی کھایا اور بہت سی تلی ہوئی گاجریں بھی ـــــ مجھے کسی ناگوار ذائقے کا احساس نہ ہوا۔ میں نے ایک دو لقمے دھوئیں میں سکھائے ہوئے گوشت[1] کے کھائے اور مجھے متلی محسوس ہوئی۔ اتنے زوروں سے اُبکائیاں آئیں کہ قے ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ میں اُسے برداشت نہیں کر سکتا تو میں آب خانہ چلا گیا اور بہت زیادہ استفراغ کیا۔ چونکہ مجھے پہلے کبھی کھانے کے بعد قے نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے میرے ذہن میں کچھ شبہات پیدا ہوئے

---

[1] بابر نے اس کے لیے لفظ 'قاق' استعمال کیا ہے۔ بابرنامہ (بیورج)، ص ۵۴۲ - مترجم

میں نے حکم دیا کہ باورچی کو حراست میں لے لیا جائے اور گوشت ایک کتّے کو دینے کے لیے کہا جس کو میں نے بند کروادیا۔ اگلی صبح پہلے پہر کے قریب کتّا بیمار ہوگیا۔ اُس کا پیٹ پھول گیا اور وہ تکلیف میں معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ لوگوں نے اُس پر پتھر پھینکے اور اُسے ہلایا ڈلایا مگر اُسے اٹھا نہ سکے، دوپہر تک اُس کی یہی حالت رہی پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹھیک ہوگیا۔ دو جوان آدمیوں نے بھی یہ کھانا کھایا تھا۔ اگلی صبح اُنھیں بھی بہت اُلٹیاں آئیں۔ ایک کی طبیعت انتہائی خراب ہوئی۔ اگرچہ آخر میں دونوں بچ گئے۔

" دوشنبہ کو دربار کا دن ہونے کی وجہ سے میں نے تمام عمائدین اور سرداروں، امیروں اور وزیروں کو دیوان میں حاضری کی ہدایت کی۔ دونوں آدمیوں اور دونوں عورتوں کو اندر لایا گیا جنھوں نے دریافت کیے جانے پر پورا حال بیان کردیا۔ حکم دیا گیا کہ چاشنی گیر کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں اور باورچی کی زندہ کھال کھینچ لی جائے، ایک عورت کو ہاتھی کے قدموں سے کچلنے کا اور دوسری کو بندوق سے گولی مار دینے کا حکم دیا گیا۔۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بیماری کے کوئی آثار باقی نہیں"۔[1]

یہ انتہائی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس قدر جلد معاملات پر توجّہ دینے کے قابل ہوگیا کیونکہ حالات سنگین ہوتے جارہے تھے۔ بیانہ کے قبول اطاعت کے بعد جو فوج وہاں قلعے میں رکھی گئی تھی، اب اُس کا محاصرہ سنگرام سنگھ اور حسن خاں میواتی کی متحدہ فوجوں نے کرلیا تھا ـــــ یہ ایک 'ناپاک اتحاد' تھا جس میں رشتۂ اتحاد صرف یہ مشترکہ خواہش تھی کہ بابر کو ہندوستان سے باہر نکال دیا جائے۔ بیانہ کی محافظ فوج نے کسی قدر ضرورت سے زیادہ جلدبازی سے کام لیتے ہوئے قلعے سے نکل کر یورش کی۔ اُسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور جلد ہی اُس پر شدید دباؤ پڑنے لگا۔

بابر نے فوراً محمد سلطان مرزا کو ہلکے ساز و سامان کی ایک فوج کے ساتھ بیانہ کی نجات کو بھیجا اور دل ہی دل میں اپنی اس فیاض دلی پر لعنت کرتا رہا کہ اُس نے

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۲۶۵، ۲۶۴۔ الفنسٹن، ص ۳۹۶ ـ ۳۹۸

حسن خاں میواتی کے بیٹے کو اعزاز کے ساتھ رہا کیا تھا۔ جو جنگ پانی پت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ بابر کو احساس تھا کہ اُس کی زندگی کا نازک ترین لمحہ قریب آرہا ہے ـــــ وہ لمحہ جو سلطنت کے نئے خوابوں کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے ۱۱ فروری ۱۵۲۷ء[1] کو بہ نفسِ نفیس میدان سنبھالا۔ مہم کی ابتدا مُبارک و مساعد نہ ہوئی۔ نجات دہندہ فوج بیانہ کی محافظ فوج تک پہنچنے سے معذور رہی بلکہ محصورین کے ساتھ رابطہ تک قایم نہ کرسکی۔ پھر حالات کو بد سے بدتر کرتے ہوئے وہ اپنے ساتھ رانا کے آدمیوں کے جوش اور بہادری کی ایسی کہانیاں لائے کہ بابر کی فوج پست ہمت ہونے لگی۔ بابر آگرے سے کوچ کر کے سیکری پہنچا اور دشمن اسی دوران اُس کی سمت بھساور تک بڑھ آیا۔ بددلی میں اضافہ کرنے کو بدقسمتی نے ایک اور گُل کھلایا۔ سردار باری باری سے ہراول کی کمان سنبھال رہے تھے۔ جس دن عبدالعزیز کی باری تھی وہ کسی احتیاطی تدبیر کے بغیر ہی کنوہ کی طرف بڑھ گیا اور فوراً ہی اُس کے پندرہ سو آدمیوں کی چھوٹی سی جماعت پر اُس سے تگنی تعداد نے حملہ کر دیا۔ یکے بعد دیگرے کئی دستے اُس کی جان چھڑانے کے لیے بھیجنے پڑے اور اس میں بھی کامیابی بھاری قیمت ادا کر کے ہوئی یہاں تک کہ اس کی فوج کا عَلم ضایع ہوگیا۔

فوری جنگ کی توقع کرتے ہوئے بابر اور اُس کے آدمیوں نے اپنا زرہ بکتر چڑھالیا، اپنی گاڑیوں اور توپ گاڑیوں کو اکٹھا کرلیا اور دشمن کی تلاش میں باہر نکلے۔ دو میل بڑھ آنے پر بھی جب دشمن کا کوئی سراغ نہ ملا تو انھوں نے پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اب وہ ایک بڑی جھیل سے آسان فاصلے پر تھے۔ بابر نے اپنے مورچے کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کے سامنے اِدھر سے اُدھر تک گاڑیوں کی ٹکڑیاں رکھی گئیں۔ ہر گاڑی اپنی قریب والی کے ساتھ ایک سولہ یا اٹھارہ فٹ لمبی لوہے کی زنجیر سے وابستہ تھی جو پانی پت کے میدان والے عارضی چمڑے کے رسّوں کی جگہ استعمال کی گئی تھی۔ پہلے کی طرح ان گاڑیوں کے پیچھے توپچی و بندوقچی پناہ لینے والے تھے۔ ترکی ماہر مصطفا نے جس مہارت سے رکاوٹوں کے ذریعے مورچہ بندی کی تھی اس پر اُسے بابر کی

---

[1] ۹ جمادی الاوّل

داد و تحسین ملی اور شہنشاہ نے اُسے میمنہ پر تعینات کرنے کا فیصلہ کیا، جہاں ہمایوں اُس کی امداد سے فائدہ اٹھا سکے۔ استاد علی جس کا انتظام اتنا مکمل نہ تھا، قلب کے سامنے رکھا گیا۔ مورچوں کو ایک خندق کے ذریعے سے مزید مستحکم کر دیا گیا تھا جو فوج کے پہلوؤں کی حفاظت کے لیے کھودی گئی تھی جہاں گاڑیاں نہ تھیں کیوں کہ (وہ) علاقہ ایسا ہے کہ پہلوؤں اور عقب کے لیے قدرتی حفاظت ملنا ناممکن تھا۔ لیکن (فوجی) تیاریوں کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ نئی قسم کی گاڑیاں تھیں جو کہ پہیہ دار تپائیوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں۔ جب ان کو ایک قطار میں رکھا جاتا تھا تو اُن سے بیک وقت بندوقچیوں کا بچاؤ بھی ہو سکتا تھا اور بندوقوں کے لیے ٹیک بھی مل جاتی تھی۔ اُنھیں آگے پیچھے دھکیلا جا سکتا تھا اور اپنی اس پناہ میں محفوظ ہو کر بندوقچیوں کی ایک جماعت اگر حالات تقاضا کریں تو بالکل کھلے میدان میں آگے بڑھ سکتی تھی۔ یہ تپائیاں بھی چمڑے کے رسّوں کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ تھیں، یہ صاف اس بات کی علامت تھی کہ ان کو عین موقع پر بنایا گیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی فوج کو جنگ کے یہ انوکھے آلات تیار کرنے کا حکم دے کر بابر اور اس کا دست راست خلیفہ ایک تیر سے دو شکار کر رہے تھے۔ ایک طرف تو جنگ پانی پت نے واضح کر دیا تھا کہ اگر بندوقچیوں کو اس طرح کے سامان سے لیس کیا جائے کہ وہ کھلے میدان میں جنگ کر سکیں یا حملے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ سکیں یا ڈگمگاتے دشمن کو بغل سے جالیں تو یہ کتنی زبردست فائدے کی صورت ہوگی اور دوسری طرف تپائیاں بنانے کی محنت نے جس میں کہ تین یا چار ہفتے لگے فوج کو دم لینے اور اپنے اعتماد کو بحال کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ بدقسمتی سے اس وقت پانچ سو آدمیوں کی ایک چھوٹی سی امدادی فوج آپہنچی، جو اپنے ساتھ دو خاص چیزیں لائی تھی ــــــ بابر کی پسندیدہ غزنی کی شراب اور ایک نامور نجومی ــــــ اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ پہلی چیز سے پادشاہ کو خوشی ہوئی لیکن اس سے قبل کہ وہ اس میں سے کچھ زیادہ پی سکتا، اُس نے سنا کہ نجومی اپنی تشویش ناک پیشین گوئیوں سے سپاہیوں کو بزدل بنا رہا ہے۔ بابر کو اپنے اوائل عمر میں توہمات نجوم پر کان دھرنے سے تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ اس تجربے کو دہرانے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس نے مختلف اطراف میں تاخت و تاراج کرنے والی جماعتیں بھیج کر اپنے سپاہیوں کے جنگی جذبے کو اُبھارنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اگر انھیں اُن کی

پست ہمتی سے بچانا ہے تو کوئی اس سے بھی زیادہ چونکانے والی ولولہ انگیز چیز ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ شراب سے توبہ کرلی[1]۔ اگرچہ یقیناً یہ اس کی پہلی توبہ نہ تھی! ــــ اس نے غزنی کی نئی انگوری شراب کو زمین پر لنڈھا دیا۔ شراب نوشی کے بیش قیمت برتن توڑ ڈالے اور اُن کے ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کردیے۔ تقریباً تین سو خاص سرداروں نے اُس کی مثال کی پیروی کی اور اس ڈرامائی منظر نے فوج میں جوش کی ایک نئی لہر دوڑادی ــــ اس تقریب کو منانے کے لیے بابر نے ایک عملِ نیک کے طور پر 'تمغا' یا محصول اسٹامپ معاف کرنے کا باضابطہ حکم جاری کیا۔ لیکن جلد ہی اس مختصر فوج میں افسردگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے آقا کے تبدیل شدہ طرزِ زندگی نے اُن کو کسی حد تک گھبرادیا ہو۔ بہر صورت بابر نے اُن کی ہمت بحال کرنے کے لیے اُن کو براہِ راست خطاب کرنا ضروری محسوس کیا۔ اگر ہم تھیوسی ڈائیڈیز کے اسلوب میں بابر کی تقریر کی تشکیلِ نو کریں تو یقیناً اُس نے کچھ اس طرح کی بات کہی ہوگی:

> "میرے عمائدین اور عسکری رُفقا! کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے اور ہماری سرزمینِ ولادت و شہرِ مانوس کے درمیان کئی ماہ کی مسافت ہے۔ اگر ہماری جماعت نے شکست کھائی (خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے! ــــ خدا ہمیں اس سے محفوظ رکھے!) تو سوچیے کہ ہم کہاں ہیں؟ ــــ ہمارا مولد کہاں ہے؟ ــــ ہمارا شہر کہاں ہے؟ ہمارا واسطہ تو اجنبیوں اور غیرملکیوں سے ہے لیکن ہر شخص یاد رکھے کہ جو بھی اس دُنیا میں آتا ہے وہ فنا ضرور ہوتا ہے کیوں کہ صرف خُدا کی ذات ہی قایم و دائم ہے ــــ جو ضیافتِ زندگی شروع کرتا ہے اُسے آخر موت کا پیالہ پینا ہی پڑتا ہے۔ شاندار موت ذلت و بدنامی کی زندگی سے بہتر ہے ــــ اگر میں ناموری سے مرجاؤں تو اس سے بہتر اور کیا ہوگا! ــــ مجھے اپنے بعد ایک باعزّت نام چھوڑ

---

[1] اگرچہ ترکِ مے نوشی کا عہد کرتے وقت بابر کے خلوص میں شبہ کرنے کا کوئی سبب نہیں لیکن کچھ مورخوں کا یہ کہنا کہ "وہ اس عہد پر تمام عمر قایم رہا" ثابت نہیں کیا جاسکتا ــــ دیکھو ص ۲۰۸ کے نیچے۔

جانے دیجیے کیوں کہ یقیناً میرا جسم موت سے نہیں بچ سکتا۔ خدائے تعالا نے ہماری قسمت میں یہ دولت لکھ دی ہے اور یہ نصیب بلند ہمارے سامنے پیش کردیا ہے کہ اگر ہم مفتوح ہوں تو شہیدوں کی موت مرتے ہیں ــــ اگر ہم فاتح ہوں تو مقدس منشائے الٰہی کو پورا کرلیا۔ اس لیے آئیے ہم سب خدائے قادرِ مطلق کی قسم کھائیں کہ ہم ایسی شاندار موت سے ہرگز گریزاں نہ ہوں گے اور جس وقت تک کہ ہماری رُوح ہمارے جسم سے جُدا نہیں ہوتی ہمارا جسم اِس لڑائی کے خطرات سے الگ نہ ہوگا۔"[1]

اُس نے مزید کہا کہ جب اس حریف کو شکست ہوجائے گی تو وہ ہر اس شخص کو گھر جانے کی اجازت دے دے گا جو اُس کی درخواست کرے گا۔ اس کا ردِّ عمل بہت پُرجوش ہوا :

" انھوں نے اپنی بیویوں کی طلاق اور قرآن شریف کی قسم کھائی، فاتحہ پڑھا اور کہا ' اے بادشاہ! جب تک ہمارے جسم میں سانس اور زندگی باقی ہے ہم انشاء اللہ ایثار و جاں نثاری سے دریغ نہ کریں گے'۔"

فوج کا جوش و جذبہ مکمل طور پر بحال ہوگیا جو بڑی خوش نصیبی کی بات تھی کیوں کہ بُری خبریں بڑی تیزی سے موصول ہورہی تھیں۔ حسین خاں لوہانی نے رابیری پر اور قطب خاں نے چندوہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ قنوج و سنبھل کی سپاہ نے اپنے علاقے چھوڑ دیے تھے اور بابر کے پاس بھاگ آئی تھی۔ گوالیار کا محاصرہ کرلیا گیا تھا اور بدترین چیز یہ تھی کہ اصل لشکر میں سے بھی لوگ اپنے فرائض منصبی چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔

بہرکیف جب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو بابر بے جگری کے ساتھ آگے بڑھا۔ ۱۲ مارچ کو اُستاد علی خاں اور بندوقچیوں نے پیش قدمی کی۔ گاڑیاں اور پہیہ دار تپائیاں اُن کے آگے گھڑگھڑاتی چل رہی تھیں۔ بادشاہ بذاتِ خود قطار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑا دوڑاتا ہوا، ہر کہیں نظر ڈالتا۔ لوگوں کی طبیعت خوش کرتا، ہمّت بڑھاتا اور تقریر و تلقین کرتا مسلسل گشت لگا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اتنے قریب پہنچا کہ دشمن وہاں سے نظر آتا تھا، اس نے نوک جھونک کرنے کے لیے کچھ چھوٹے چھوٹے دستے

---

[1] پلی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۳۸۳، ۳۸۴۔ ہمایوں نامہ (اے۔ ایس۔ بیورج)
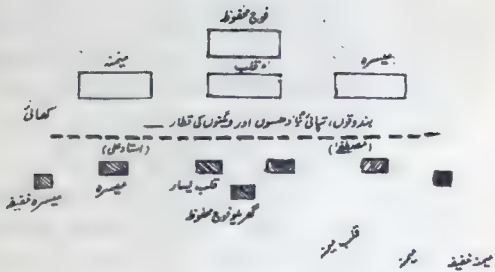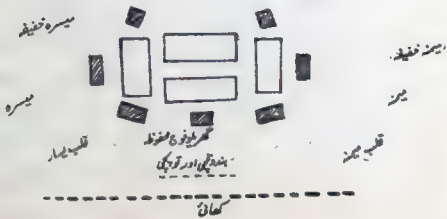
روانہ کیے جنھوں نے دشمن کی فوج کے کچھ بچھڑے ہوئے سپاہیوں پر کامیاب حملے کیے اور متعدد مویشی پکڑ لائے۔ اس چھوٹے سے کارنامے سے فوج کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔

زمین کا بغور جائزہ لینے کے بعد بابر کنوہ کے نزدیک تین دن ٹھہرا رہا، اس اثنا میں خلیفہ اور سفرینا نے خندقیں کھودیں اور دمدمے کھڑے کیے۔ آخرکار جب ۱۶ مارچ کو جب کہ سب کچھ تیار تھا، فوج نے جنگی صف بستگی کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور اس کے لیے جو مورچہ تیار کیا گیا تھا اُسے سنبھال لیا۔ ٹھیک جس وقت خیمے لگائے جا رہے تھے، یہ خبر آئی کہ دشمن حرکت میں آگیا ہے۔ بغیر کسی انتشار کے ہر ایک اپنی متعینہ جگہ جا پہنچا۔

مغل لشکرگاہ اس میدان میں واقع تھی جو کنوہ کے گاؤں کے قریب اور سیکری سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر تھا —— یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ بادشاہ کی سپاہ نے جس مقام پر مورچہ سنبھالا تھا اس کا تعین کسی بھی درجہ صحت تک کرنا ناممکن ہے۔ ہمارا واحد ذریعۂ تحقیق تین امور پر مشتمل ہے —— اوّل یہ کہ بابر راجپوتوں سے مقابلے کے لیے آگے بڑھا تھا جو بھساور کی جانب سے آ رہے تھے۔ دوم یہ کہ وہ کنوہ کی پہاڑی کے بالکل نزدیک تھا۔ تیسرے یہ کہ جنگ میسرہ سے پیشتر میمنہ کی جانب شروع ہوئی اور نسبتاً کہیں زیادہ شدّت سے ہوئی —— ان امور سے شاید اس قیاس کا جواز ملتا ہے کہ بابر کے لشکرگاہ کا رُخ مغرب و جنوب کی طرف تھا اور اس کا میسرہ مذکورہ بالا پہاڑی پر یا تو قایم تھا یا جزوی طور پر اُس کے پہلو میں تھا۔

پوری فوج کے آگے توپچی اور بندوقچی تھے جو زنجیروں سے بندھی گاڑیوں اور تپائی نما ڈھسّوں کی آڑ میں محفوظ تھے۔ مصطفےٰ توڑے دار بندوقوں اور ہلکی توپوں کے ساتھ میمنہ کے آگے تعینات تھا اور اُستاد علی بھاری توپخانہ کے ساتھ قلب کے آگے جما ہوا تھا۔ یہاں بھی پانی پت کی طرح افواج کی قطار مسلسل نہ تھی۔ اس میں سلسلہ وار خلا رکھے گئے تھے جن میں سے دشمن پر حملے کیے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقب میں اور دونوں بازوؤں پر سفرینا کے جوانوں نے خندقوں کا حصار بنالیا تھا۔

فوج کے مختلف حصّوں کا تعیّن اس طرح پر تھا —— بائیں جانب انتہائی سرے پر مومن اتکہ اور رستم ترکمان کی کمان میں 'خاصہ تابینان' (شاہی محافظ فوج) میں سے چُنے ہوئے جوانوں کی ایک جماعت تھی جو طلغمہ کی شکل میں کام کرنے کے لیے علاحدہ

کرلی گئی تھی۔ اس جماعت کے داہنی جانب یسرہ تھا جس کے متعلق یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بجائے خود بھی مروّجہ تین حصّوں یسرہ، قلب اور میمنہ میں منقسم تھا اور ان سب کی قیادت اعلا خلیفہ کے سپرد تھی۔ اس کے ساتھ متعدد ممتاز ترکی اُمرا سیدی مہدی، محمد سلطان مرزا، عادل سلطان، عبدالعزیز میرآخور، محمد علی جنگ وغیرہ تھے اور ایک جماعت افغان سرداروں جلال خاں، کمال خاں، علی خاں فارموتی اور بیانہ کے نظام خاں کی بھی تھی۔ کون کس جگہ متعین تھا اس کے متعلق ہمیں معلومات فراہم نہیں، جس کی وجہ یقیناً یہی معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کی جو روئدادیں موجود ہیں وہ سب بابر اور ہمایوں کی تحریک پر لکھی گئی ہیں جو بالترتیب قلب اور میمنہ پر متعین تھے۔ لہٰذا یہ واضح نہیں ہوتا کہ یسرہ پر کیا گزری[1] یسرہ کے فوراً بعد داہنی طرف قلب یسار تھا، جہاں علاء الدین لودی (جو کہ ایک دفعہ پھر بابر کا ساتھی بن گیا تھا)، شیخ زین (جس کے تفصیلی مگر بے حد مرصّع و مسجّع تذکرہ کے ہم مرہون ہیں)، محب علی، شیرافگن، خواجہ حسین وغیرہ تعینات تھے۔ اس کے بعد خط جنگ کے عین وسط میں شاہی محافظ فوج کی اصل جمیعت تھی جس کی کمان خود بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ کے چاروں طرف اس کے 'سرداران رکاب' کا حلقہ تھا جو نائب سالار[2] سلطان محمد کے ماتحت تھے ـــــ قلب یمین میں بابر کے سب سے زیادہ معتمد فوجی سردار چین تیمو سلطان، سلیمان شاہ، یونس علی، شاہ منصور برلاس، عبداللہ کتابدار، دوست اسحاق آغا اور دوسرے لوگ تعینات تھے اُن کے بھی دائیں طرف میمنہ کا یسرہ میر ہمہ[3]، محمد کلکدش[4] اور خواجگی اسد کی ماتحتی میں تھا۔ داہنے بازو کا قلب ہمایوں کی کمان میں تھا اور اس

---

[1] مغلوں کی جانب سے کنوہ کی جنگ کے ماخذیہ ہیں ـــــ شیخ زین کا سرکاری بیان۔ بابرنامہ، ص ۳۱۶ و بعدہٗ لیڈن و ارسکن، ص ۳۵۹ و بعدہٗ پی۔ ڈی۔ کورٹیل، ۲۸۰ و بعدہٗ المنسکی، ص ۲۱۵ و بعدہٗ راجپوتوں کی جانب کے لیے ملاحظہ ہو ٹاڈ کی تصنیف "اینلس آف میواڑ" باب نہم۔

[2] Adjutant General

[3] بابرنامہ (بیورج، ص ۵۶۶) میر ہا اور قوسین میں میر ہّما درج ہے۔

[4] بابرنامہ (بیورج، ص ۵۶۶) شمس الدین محمد کلکدش درج ہے۔

میں بائیں بازو کی طرح متعدد عالی نسب افغان شامل تھے جنھوں نے اپنی قسمت وقتی طور پر مغلوں سے وابستہ کرلی تھی، (مثلاً) خان خاناں دلاور خاں، ملک داد کرّم اور شیخ گورن ۔ میمنہ کے داہنے حصے میں قاسم حسین سلطان، احمد یوسف اگلاچی[1]، ہندو بیگ[2]، خسرو ککلدش اور خوان بیگ اردو شاہ[3] کے علاوہ دو سفیر سلطان آغا[4] (عراقی) اور حسین سفیر سیستان بھی تھے جو بظاہر جنگ دیکھنے کو لائے گئے تھے۔ قطار کے آخری سرے پر داہنہ طلغمہ متعین تھا جو منگولوں کی ایک طاقت ور جماعت پر مشتمل تھا اور اس کی کمان تردیکا[5]، ملک قاسم اور بابا کشکا کے ہاتھ میں تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر کی کمان میں سپاہیوں کی تعداد پانی پت کے مقابلے میں زیادہ تھی لیکن ان کی بددلی اور تذبذب سے جسے دُور کرنے کے لیے بابر کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ رہی تھی، یہ ثابت ہوتا ہے کہ فوج کا انضباط و اعتماد نفس اتنا اچھا نہیں تھا۔ بابر نے اپنے قوی ہیکل ترکی و منگول سپاہیوں میں جن کے ذریعے اُسے دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، اب کم تر درجے کے افغان سپاہیوں کے دستوں کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اُن کی وجہ سے فوج کی تعداد میں کوئی خاص اضافہ ہوا ہوگا، یہ غیر اغلب ہے کیوں کہ آب و ہوا اور جنگ کی تباہ کاریوں اور مقبوضہ قلعوں کے تحفّظ کی ناگہانی اشد ضرورتوں نے ابتدائی اصل کی تعداد لازماً کم کردی ہوگی۔ ٹھیک ٹھیک معلومات کی عدم موجودگی میں اگرچہ کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا لیکن لڑائی کی عمومی نوعیت سے اور اُن جداگانہ سرداروں کی تعداد سے جن کے نام سرکاری بیان میں دیے گئے ہیں ہم غالباً یہ قیاس کرسکتے ہیں کہ بابر کی فوج میں آٹھ دس ہزار محارب سپاہی تھے۔ اس

---

[1] بابر نامہ (بیورج) ص ۵۶۶ اوغلاقچی (مترجم)۔

[2] اس کا پورا نام (بابر نامہ، بیورج، ص ۵۶۶) جلال الدین ہندو بیگ قوچین تھا۔ (مترجم)

[3] بابر نامہ (بیورج) ص ۵۶۶ میں ان کا نام قوام بیگ اردو شاہ دیا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چند اور نام بھی 'بابر نامہ' میں دیے ہیں۔ (مترجم)

[4] بابر نامہ (بیورج) ص ۵۶۶ عراق کے سفیر کا نام سلیمان آقا اور سوستان کے سفیر کا نام حسین آقا درج ہیں۔ (مترجم)

[5] بابر نامہ (بیورج) ص ۵۶۸ تردیکا درج ہے مگر نوٹ میں تر دی بِکّا ہے۔ (مترجم)

میں کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا کہ تعداد کے لحاظ سے حالات کا توازن بابر کی بے پناہ ناموافقت میں تھا۔ مغل سرکاری تخمینے کے مطابق سنگرام سنگھ کے ذاتی وفاداروں کی تعداد ایک لاکھ تھی اور اس کے حلیف سرداروں کی ماتحتی میں جو اس کے ہم رکاب تھے مزید ایک لاکھ سپاہی تھے ـــــ جہاں تک محارب سپاہیوں کا تعلق ہے یہ اعداد و شمار نمایاں طور پر مبالغہ آمیز ہیں لیکن اگر گرد پیشہ (بہیر) لوگوں کو بھی شمار کر لیا جائے تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ کل میزان اتنا ہی زیادہ رہا ہوگا۔ ترکی تذکروں میں درج ہے کہ سابقہ لڑائیوں میں رانا سنگرام سنگھ کے ذاتی جاگیرداروں میں سے صرف ایک تہائی نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا[۵] لیکن اس کے باوجود بھی اس نتیجے سے گریز ناممکن نظر آتا ہے کہ محارب سپاہیوں کے باب میں راجپوت راجہ کے لشکر کی تعداد اپنے حریف کے مقابلے میں سات اور ایک یا آٹھ اور ایک کے تناسب میں زیادہ تھی۔

طلوع آفتاب کو تقریباً تین گھنٹے گزرے تھے جب کہ جنگ شروع ہوئی۔ اس امر سے راجپوتوں کے پہلے حملے کا وقت نو اور ساڑھے نو بجے کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ سنگرام سنگھ کا منشا مغل صفوں کو انتہائی داہنے سرے سے اُلٹ دینے کا تھا کیوں کہ اُس کا پہلا جاں بازانہ حملہ ملک قاسم کے زیر کمان 'طلغہ' پر اور خسرو کلکلتاش کے زیر قیادت میمنہ کے داہنے حصّے پر کیا گیا۔ کچھ دیر تک قلب، میسرہ اور خود میمنہ کی خاص جماعت بھی جنگ سے الگ تھلگ رہی اور ہر جانب کے لوگ اپنے حریفوں کی نقل و حرکت دیکھنے پر ہی اکتفا کرتے رہے۔ لیکن جلد ہی مغلوں کو اپنے انتہائی داہنے دستوں کو کمک پہنچانا ضروری ہو گیا جنھیں سخت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا۔ وقت انتہائی خطرے کا تھا۔ 'طلغہ' حملے کا عادی تھا مزاحمت کا نہیں اور اس میں کمزوری کے آثار ظاہر ہونے لگے ـــــ اگر میمنہ کے اختتامی دستے پسپا ہوتے تو لشکر کی پوری صف اُلٹ جاتی اور شکست فوری و لاعلاج ہوتی۔ بابر نے فوراً ہی اپنے سب سے معتمد سردار کو خطرہ زدہ مقام پر بھیجنے کا فیصلہ کیا، یہ مدد بر وقت پہنچی۔ چن تیمور سلطان نے چیدہ سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ راجپوتوں کے میسرہ پر حملہ کیا ـــ صفوں کو چیرتا ہوا

---

۵ المنسکی ص ۴۹۹ ۔ پی۔ ڈی۔ کوریٹل، دوم، ص ۴۴۴

اُن کے درمیان تک پہنچ گیا اور اس طرح مغل میمنہ پر دشمن کا دباؤ کم کر دیا۔ یہ حملہ حریف کی صفوں میں کافی دُور تک کامیابی سے کیا گیا تھا اور راجپوتوں کے میسرہ اور قلب کے درمیان ایک نمایاں شگاف پڑ گیا تھا۔ مغل سالاروں نے اس کا فوری فائدہ اُٹھایا۔ مصطفا توپچی اپنے ضرب زنوں (ہلکی توپوں) اور اپنے سہ پایوں کو دھکیل کر کھلے میدان میں لے گیا اور اس بہتر جگہ سے اُس نے چھوٹی قطر والی توپوں اور توڑے دار بندوقوں سے ایک تباہ کن آتش باری شروع کر دی۔ (اس کا) اثر اتنا زبردست ہوا کہ گھبرائے ہوئے مغلوں کا انضباط و اعتمادِ نفس بحال ہو گیا۔ تازہ دم دستے تیزی سے پہنچائے گئے اور رفتہ رفتہ میمنہ کے تمام ہی آدمی جنگ میں شامل ہو گئے کیوں کہ قاسم حسین سلطان، کاوان (قوام) بیگ، اردو شاہ، ہندو بیگ، محمد کلکش اور خواجگی اسد وغیرہ یکے بعد دیگرے کامیابی کے ساتھ لڑائی میں کمک آئے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد جب کہ راجپوت امدادی فوجیں مغل میمنہ پر اپنا دباؤ بڑھائے جا رہی تھیں، قلب میں سے قریب ترین دستے لے کر جنگ میں جھونک دیے گئے۔ سب سے پہلے یونس علی، شاہ منصور برلاس اور عبد اللہ کتابدار کا نمبر آیا اور ایک لمحہ بعد دوست اسحاق نے یورش کر دی۔ اس طرح کمک پا کر اور مصطفا کے مہلک آتشی اسلحے کی مزید مدد کے ساتھ مغل میمنہ نے تمام حملوں کو پسپا کر دیا اور دشمنوں کو شدید نقصانات پہنچائے۔

رانا سانگا نے اب اپنی قوتوں کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ فی الحال قلب سے احتراز کر کے جہاں استاد علی اور اس کی بھاری توپیں ناخوشگوار طور پر سرگرم تھیں، راجپوتوں نے میسرہ پر غضب ناک حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن ایک طرف تو میمنہ کی اصل جمعیت سلطان مرزا، عادل سلطان، محمد علی جنگ اور دوسرے طاقت ور سورماؤں کی سرکردگی میں اپنی جگہ جمی رہی اور ایک فٹ بھی پیچھے نہ ہٹی اور دوسری طرف اس سمت کا 'طلغہ' رستم ترکمان اور مومن اتکہ کی ماتحتی میں آندھی کی طرح گھوما اور دشمن کے عقب پر ٹوٹ پڑا ـــــ راجپوتوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ایک حملہ آور طلغہ ایک حملہ زدہ طلغہ سے بہت مختلف چیز ہوتا ہے اور جب ملا محمود اور علی اتکہ اور آخرکار خلیفہ بھی سرعت سے آ پہنچا تو اس عقبی حملے کا اثر سنگین ہو گیا۔ بایں ہمہ راجپوتوں نے صرف کثرتِ تعداد کی قوت سے میسرہ پر اپنا زبردست دباؤ برقرار رکھا اور بابر کے لیے خواجہ حسین کے ساتھ

خاصہ تابینان (شاہی محافظ دستہ) کی ایک منتخب جماعت بطور کمک بھیجنا ضروری ہوگیا۔

اب جنگ ابتدا سے انتہا تک پورے محاذ پر بہت زور شور سے ہو رہی تھی اور کچھ عرصے تک غیر فیصلہ کن رہی۔ ایک طرف تو مغل توپ خانہ پُرہجوم راجپوت صفوں میں خوفناک قتل عام مچا رہا تھا اور دوسری طرف کثرتِ تعداد کے ختم نہ ہونے والے دباؤ نے بابر کے آدمیوں کو تقریباً اپنے آخری گھٹے ہوئے سانس تک پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے محسوس کرلیا کہ اگر میزانِ فتح کو اپنے خلاف جھکنے سے روکنا ہے تو ایک آخری اور زبردست ترین کوشش ضروری ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی اس نے قلب کی شاہی محافظ فوج کو حکم دیا کہ دو پیوستہ جماعتوں میں اس طرح حملہ کریں کہ ایک توپخانہ کے ہر دو پہلو سے ایک ایک جماعت آگے بڑھے اور درمیان میں استاد علی کے "بڑے بڑے گولوں" کے لیے راستہ صاف رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسی وقت بندوقچیوں کی ایک مضبوط جماعت کو میمنہ سے لایا گیا جس کی آتش باری نے استاد علی کی کوششوں میں اضافہ کردیا۔ یہ دانش مندانہ تدبیرِ جنگ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ شاہی محافظ دستوں کے حملے نے راجپوت قلب کو پیچھے دھکیل دیا اور آتشی اسلحے نے دشمنوں کے ہجوم میں سے ایک موت کا راستہ توڑ نکالا ــــــ اب بندوقچی توپ خانہ کے عقب سے نکل کر اپنے سہ پائے اپنے آگے آگے دھکیلتے ہوئے بڑھے اور اس طرح جس قدر حصۂ میدان ہاتھ آتا گیا اس پر مغل پیدل فوج سرعت سے قبضہ کرتی گئی۔ اس وقت بادشاہ نے بذاتِ خود پورے قلب کو ایک عام پیش قدمی کا حکم دیا۔ توپوں کو آگے بڑھایا گیا اور استاد علی نے اپنی سرگرمیاں دوچند کردیں۔ اپنے فتح مند قلب کے ساتھ بابر کو آگے بڑھتا دیکھ کر مغل میمنہ اور میسرہ نے اپنی صف سیدھی کرنے کے لیے بے جگری سے جدوجہد کی۔ ان کے حملے اتنے غضب ناک تھے کہ انھوں نے راجپوتوں کے میمنہ و میسرہ کو ابتری کے ساتھ پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا اور اندر کی طرف قلب پر دھکیل دیا۔ ایک دفعہ پھر کچھ عرصے کے لیے لڑائی میں مقابلہ برابر کا رہا۔ اگرچہ مانورہ میں راجپوت نمایاں طور پر مات کھا چکے تھے، لیکن ان کی تعداد کی برتری تھکے ہوئے مغلوں پر اب بھی ایک دہشت ناک دباؤ بنی ہوئی تھی۔ ایک آخری کوشش کے لیے جوش و قوت جمع کرکے رانا سنگرام سنگھ کے آدمی اپنے حریفوں کے میمنہ اور میسرہ پر ٹوٹ پڑے جو اُن کو چاروں طرف سے گھیر لینے کا خطرہ پیدا

کر رہے تھے۔ یہ آخری حملہ واقعی سردھڑ کی بازی لگاکر کیا گیا تھا۔ مغل بازوؤں کو ان جگہوں سے ہٹادیا گیا جہاں سے وہ حریف کو حلقے میں لے سکتے تھے اور قلب کی صفوں کی سیدھ میں تقریباً اس مقام تک پیچھے دھکیل دیا گیا جہاں خود بابر کھڑا تھا۔ میسرہ کی طرف جہاں دباؤ سب سے زیادہ تھا، راجپوتوں کے حملے سے مغل صفوں کے ٹوٹنے میں بال بال کسر رہ گئی۔ لیکن راجپوتوں کے حریفوں کو جو برتری حاصل ہوچکی تھی وہ بے حد نمایاں تھی اور توپ خانہ نے جو نقصان کیا تھا وہ بے حد شدید تھا ـــــ راجپوت سورما آزردگی کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگے۔ اب اپنی باری پر مغل بازوؤں نے ایک دفعہ پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ اس کا اثر فیصلہ کن ہوا۔ ان کے حریف منتشر ہوکر فرار ہوگئے۔ جب بابر قلب میں بہادری کے ساتھ اپنا راستہ پیدا کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا تو اس کے دونوں بازو (فوجوں) کے نائب سالاروں نے آکر اطلاع دی کہ جنگ فتح ہوچکی ہے۔ رانا سنگرام سنگھ کا کثیر لشکر دوپہر کی برف کی مانند پگھل کر غائب ہوچکا تھا اور کنوہ کی جنگ ختم ہوچکی تھی۔

راجپوت مورخوں کا کہنا ہے کہ رانا کی شکست صرف غدّاری کی وجہ سے ہی ہوسکتی تھی،[1] حالانکہ یہ مفروضہ ایک ایسی شکست کی توجیہہ کے لیے ضروری نہیں جو ایک ہُنرمند نیز توپخانہ اور عمدہ تربیت یافتہ افواج سے لیس سپہ سالار کے ہاتھوں اُٹھانا پڑی ہو۔ 'وقائع میواڑ' میں بیان کردہ اس فسانے پر حقیقت کی کوئی چھاپ نہیں نظر آتی کہ بابر نے لڑائی سے پہلے صلح کی کوشش کی اور صرف اس حد تک کامیاب ہوسکا کہ درمیانی شخص یعنی رائے سین کے سلادی کو رشوت دے کر ہموار کرلیا تھا جو جنگ کے فیصلہ کن لمحات میں اُس کے ساتھ آملا۔ ایک ہزیمت خوردہ فوج کے فخر و پندار کی تسکین کے لیے غدّاری کی فریاد بلند کرنا ایک عام بات ہے۔[2] حقیقتاً راجپوتوں کو زبردست صدمہ پہنچا تھا، بمشکل ہی کوئی خاندان

---

[1] ٹاڈ ـــ 'وقائع میواڑ'۔ باب نہم

[2] راجپوت وقائع نگار سلادی کے خلاف کافی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں جس کہ بعد میں گجرات کے بہادر شاہ نے صلاح الدین کے نام سے داخل اسلام کرلیا۔ ملاحظہ ہو 'مرات سکندری' ـــ لیکن یہ امر کہ اس کی غدّاری کی کہانی بے بُنیاد ہے، اس بات سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اُسے نہ تو مغلوں سے کبھی کوئی انعام ملا اور نہ کبھی بعد میں ان سے رابطہ رہا۔ شکست کے بعد وہ دکن چلا گیا اور مالوہ کی سیاست میں پہلے کی طرح لگا رہا۔

ایسا تھا جس نے اپنے شاہی نسل کے بہترین افراد کو نہ کھو دیا ہو۔ سنگرام سنگھ بچ گیا تھا۔ بُری طرح مجروح ـــــ لیکن اس کی طاقت ٹوٹ چکی تھی اور اس کے وقار کے زوال نے اس واحد رشتے کو مہلک حد تک کمزور کر دیا جو عظیم راجپوت ریاستی اتحاد کو قایم اور وابستہ رکھ سکتا تھا۔

جنگ کنوہ کے نتایج انتہائی عظیم وخطیر ہوئے، سب سے اوّل یہ کہ ہندوستان میں مُسلمانوں کی نظروں کے سامنے گزشتہ دس برس سے راجپوت اقتدارِ اعلا کا جو خطرہ منڈلا رہا تھا وہ ہمیشہ کے لیے دُور ہو گیا ـــــ وہ زبردست راجپوت ریاستی اتحاد جس کی بقا ربطِ باہمی کا بہت کچھ انحصار میواڑ کی طاقت وشہرت پر تھا، ایک ہی بڑی شکست میں چُور چُور ہو گیا اور آئندہ کے لیے سیاسیاتِ ہندوستان میں ایک غالب عنصر کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی سلطنتِ مُغلیہ اب مستحکم طور پر قایم ہو گئی تھی۔ بابر حتمی طور پر سلطان ابراہیم کے تخت پر متمکن ہو چکا تھا اور اس کی کامیابی کی تصدیق و توثیق سلطان ابراہیم کے زبردست ترین حریفوں کی مکمل تباہی سے ہو گئی تھی ـــــ اب تک تو تصرّفِ ہندوستان کو بابر کی مہم جُویانہ زندگی کا صرف ایک ضمنی واقعہ سے تعبیر کیا جاسکتا تھا لیکن اب سے اس کی باقی ماندہ زندگی بھر کے لیے یہ سرگرمیوں کا بُنیادی خیال بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی کی تلاش میں اُس کی آوارہ گردیوں کے دن اب گزر چکے ہیں۔ خوش قسمتی اب اس کی ہو چکی ہے ـــــ اور اس کو صرف یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ وہ اس کا مستحق تھا ـــــ اس جنگ کے بعد بابر کی زندگی کا جو نیا دور شروع ہوتا ہے اس کی نشان دہی اس خصوصیت سے ہوتی ہے کہ بعد میں کبھی بھی اس کو اپنے تخت و جان کی بازی ایک شمنی ہوئی لڑائی پر نہیں لگانا پڑی ـــــ لڑائی تو ضرور ہوئی ـــــ اور بکثرت ہوئی ـــــ لیکن یہ لڑائی وہ ہے جو اپنی قوت کی توسیع کے لیے ہے ـــــ باغیوں کو زیر کرنے کے لیے ہے ـــــ اپنے مُلک کی تنظیم کے لیے ہے ـــــ یہ لڑائی کبھی بھی اپنے تخت کے لیے نہیں ـــــ اس کے علاوہ یہ امر اہم ترین مسایل کے متعلق بابر کی سوجھ بوجھ پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت سے اس کی طاقت کا مرکز ثقل کابل سے ہندوستان منتقل کر دیا جاتا ہے۔ واضح طور پر اس کا یہ احساس تھا کہ اعلاتر کو لازماً ادناتر پر حکومت کرنی چاہیے، نیز یہ کہ ایامِ سابق کی چھوٹی سی ریاست میں بیٹھ کر وہ اپنی نئی سلطنتوں کی قسمتوں کے فیصلے پر قابو رکھنے

کی اُمید کبھی نہیں کرسکتا۔ اگرچہ اس کا دل اپنے کوہستانی وطن کے مرغزاروں اور چشموں کے لیے اکثر تڑپتا رہا تاہم وہ اپنی باقی ماندہ زندگی ہندوستان ہی میں استقلال سے قیام پذیر رہا ــــ لڑتا رہا ــــ حکومت کرتا رہا ــــ انتظام کرتا رہا اور جب تک موت کا پیغام نہ آیا مسلسل اس کوشش میں لگا رہا کہ اپنے تمام معاملات کو پختہ بُنیاد پر قائم کردے۔

چونکہ جنگ کنوہ کے بعد فی الحال کوئی کُھلا دشمن میدان میں نہ رہا تھا اس لیے بابر بلا روک ٹوک اپنے علاقوں کی تسخیر کے کام کو آگے بڑھا سکا ــــ یادگار فتح کے طور پر دستور کے مطابق کھوپڑیوں کا مینار بنانے کے بعد وہ بیانہ کی طرف بڑھا۔ اپنی نصرت و کامرانی پر مہر لگانے کے لیے وہ راجپوتانہ پر باقاعدہ فوج کشی کا ارادہ کررہا تھا لیکن چونکہ موسم گرما نزدیک تھا، اُس نے اپنے امیروں کے مشورے کو بادلِ نخواستہ قبول کرلیا اور منصوبے کو ترک کردیا۔ مگر اس نے میوات کی تسخیر کا فیصلہ کیا اور مقامی سرداروں سے خراج اطاعت حاصل کرتا ہوا الور میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد کوٹیلا و بیانہ کی راہ سے آگرہ واپس لوٹ آیا۔

جس زمانے میں وہ ان پیش قدمیوں میں مصروف تھا اس نے ہمایوں[1]، مہدی خواجہ اور اُن سب لوگوں کو کابل واپس جانے کی اجازت دے دی جن کو آرام کرنے اور تازہ دم ہونے کی ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ متعدد لوگوں نے اس وعدے سے فائدہ اُٹھایا جو جنگ سے قبل کیا گیا تھا۔ غالباً اُن کو جاتے ہوئے دیکھ کر بادشاہ کو کچھ افسوس بھی نہ تھا ــــ چونکہ کابل افواج سے خالی ہو چکا تھا اس لیے وہاں کی حالت بابر کے لیے کسی قدر تشویش کا باعث تھی کیوں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اگر تقدیر کی کوئی ناگہانی مخالفانہ گردش اس کو ہندوستان سے باہر دھکیل ڈالے تو یہ چیز انتہائی اہم ہوگی، ایک مضبوط اور پائدار مرکز اس کے قبضے میں موجود ہو جہاں سے مستقبل میں کارروائیاں کی جاسکیں۔

خود بابر کے لیے کوئی آرام نہ تھا۔ پہلا کام یہ تھا کہ ان اضلاع کو زیرِ اطاعت

---

[1] اس شہزادے نے واپس جاتے ہوئے راستے میں دہلی کے کچھ خزانوں کو لُوٹ لیا جس کے باعث وہ سخت ملامت کا نشانہ بنا۔

لایا جائے جو جنگ کنوہ سے قبل طوقِ فرماں برداری اُتار چکے تھے ---- ایک مہم جو محمد علی جنگ اور تاردی بیگ کی رہنمائی میں چنڈوا اور رابیری کے خلاف بھیجی گئی تھی مکمل طور پر کامیاب ثابت ہوئی۔ ان قلعوں پر دُشواری کے بغیر دوبارہ قبضہ ہوگیا اور باغی سرغنہ حسین خاں لوہانی جمنا کے اُس پار فرار ہونے کی کوشش میں ڈوب کر مرگیا۔ قطب خاں کو یہ خبر ملی تو اٹاوہ نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ایک اور مضبوط فوج ایک طاقت ور افغان سردار بیبن خاں کے خلاف روانہ کی گئی جس نے حالیہ انتشار سے فائدہ اُٹھاکر لکھنؤ کو محاصرہ کرکے فتح کرلیا تھا۔ بیبن جنگ کیے بغیر ہی بھاگ گیا اور اس کی فتوحات بابر کے ہاتھ لگیں۔

باب ہفتم

سلطنت کی بُنیادیں

اسناد : 'بابر نامہ'۔ 'تاریخ داؤدی'۔ 'تاریخ شیر شاہی'۔
جدید تصانیف : ارسکن ۔ ایلیٹ و ڈاؤسن، جلد چہارم و پنجم ۔

اب بابر پہلی مرتبہ اس قابل ہوا کہ اپنے ساتھیوں میں مختلف صوبوں اور اضلاع کی تقسیم کو مکمل کر سکے۔ اب تک تو وہ اپنی تمام فوج کو جنگ کے لیے تیار رکھنے پر مجبور تھا۔ لیکن کنوہ کی فتح اور بعدہٗ کھلی مزاحمت کی ناپیدگی نے برسات کے شروع میں اس کے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ اپنے اُمرا میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے پرگنوں میں جانے کی ہدایت کر سکے تاکہ اپنے ضروری معاملات دُرست کر سکیں اور اسلحہ اور جنگی سامان ایسے موسم کے لیے تیار کر لیں جب کہ فوجی مہمیں پھر شروع کرنا ممکن ہوگا۔ سلطنتِ مغلیہ کے نظم و نسق کی بُنیاد رکھنے کے سلسلے میں یہی وہ پہلا قدم تھا جو بابر نے اٹھایا۔

اس ضمن میں بابر کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اُن کے متعلق چند الفاظ یہاں کہنا ضروری ہیں۔ چودھویں صدی کے دوران جیسی کچھ بھی انتظامی مشینری استعمال میں تھی وہ پندرھویں صدی کے ہنگاموں کے بعد قایم نہ رہ سکی تھی۔ لودی خاندان کی شاہی حکومت ایک قسم کی وفاقی حکومت تھی جس میں ایک سردار دوسرے سرداروں پر فرماں روائی کرتا تھا جو اگر وقار میں نہیں تو قوت میں اُس کے ہم پلہ ضرور ہوتے

تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی نظم و نسق کلی طور پر مقامی مقتدر افراد کے ہاتھوں میں ہوتا تھا جو مرکزی حکومت کے نہیں بلکہ اُن بڑے امرا کے ماتحت ہوتے تھے جن کے صوبوں سے وہ متعلق ہوتے تھے ۔ مقامی حکّام پر سلطان کا اختیار صرف ان حقوق تک محدود تھا کہ مسلح آدمیوں کی ایک مقررہ تعداد طلب کر سکے اور چند غیر واضح طور پر متعین واجبات وصول کر سکے جن کی رقم بڑھائی جا سکتی تھی ۔ اگر بادشاہ اس قدر طاقت ور یا اس قدر ناعاقبت اندیش ہو کہ اس اقدام سے پیدا ہونے والی بے اطمینانی کو نظر انداز کر سکے [1]
عدل و انصاف کی ذمّہ داری غیر فوجی اور مذہبی افسروں کے سپرد تھی جن کا تقرر بڑے بڑے سردار کرتے تھے اور اُنھیں کو وہ جوابدہ بھی ہوتے تھے ۔ انصاف کوئی مخصوص اختیار شاہی نہ تھا ، اگرچہ اہم مقدمات فیصلے کے لیے بادشاہ کے پاس لائے جاتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بادشاہ کے کسی آئینی حق کا نتیجہ نہیں بلکہ اہلِ مقدمہ کی خوش اخلاقی کا ایک مظاہرہ ہوتی تھی ۔ جنگ میں بے شک بادشاہ قائد تھا ، اگرچہ یہ بات اس کے منصب سے زیادہ اس کی شخصیت پر منحصر ہوتی تھی کہ وہ اپنی مرضی کہاں تک اُن طاقتور سرداروں پر مسلّط کر سکتا ہے جن کے سپاہیوں پر اس کی بیشتر فوج مشتمل ہوتی تھی ۔ بہلول جیسے سلطان کو جو اپنے مخصوص اختیارات شاہی کی محدودیت کو صفائی سے تسلیم کرتا تھا اس ڈھیلے ڈھالے نظامِ حکومت کو چلانے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سنگین و سرکش قصوروار پر شاہی مرضی مسلّط کرنے کے لیے عام طور پر ایک فوج جمع کر لینا آسان تھا ، اگرچہ بادشاہ کو یہ اطمینان کر لینا لازم تھا کہ شاہی مرضی بنیادی طور پر طاقت ور جاگیرداروں کی مرضی سے مختلف نہیں ہے ۔

شاہی اختیارات پر حالات کی عائد کردہ پابندیوں کو تسلیم کرنے سے قاصر رہنے کے باعث ہی یہ ہوا کہ ابراہیم لودی کو ایسی قطعی تباہی سے دوچار ہونا پڑا ــــــ بابر کے ہاتھوں اس کی شکست اس تباہی کا سبب نہ تھی بلکہ اس کا نتیجہ تھی ۔ اس نے سلطنتِ دہلی کی وہ مطلق العنان حاکمیت بحال کرنے کی کوشش کی تھی جو کہ محمد بن تغلق کے عہد میں حاصل تھی ۔ مگر زمانہ بدل چکا تھا ، لودی کی بادشاہی کوئی میراثِ الٰہیہ نہ تھی

---

[1] یہ بے اطمینانی بڑی زبردست ہو سکتی تھی ۔ ابراہیم لودی کی حالیہ مثال سے ثابت ہو گیا ۔

بلکہ ایک انسانی مفاہمت تھی اور حکمران کا اقتدار اور وقار دونوں ہی گھٹ چکے تھے۔
بابر کی حیثیت کا تعین کرتے وقت ان ملوظات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔
ایک طرف تو یہ چیز تھی کہ وہ لودیوں کو برطرف کر کے تخت نشین ہوا تھا اور لودی خاندان وہ تھا جس کی کامیابی، جیسی کچھ بھی تھی، صرف اس اعلانیہ اعتراف کا نتیجہ تھی کہ بادشاہ کی حیثیت 'اوّل الاماثل' (ہم مرتبہ لوگوں میں اوّل) کی ہے[1] دوسری طرف وہ خود مطلق العنان بادشاہی کا مجسم نمونہ تھا ــــ ایسی بادشاہی جو نہ صرف فتوحات کی بنیاد پر قایم ہو بلکہ ایسی بادشاہی بھی جو خداداد حقوق کا نتیجہ ہو کیوں کہ بابر اوّلاً ایک عظیم فاتح تھا ــــ نصرت و کامرانی کی درخشاں رعنائیوں کے حلقے میں جلوہ فرما ــــ اور ثانیاً وہ امیر تیمور کا نمایندہ تھا ــــ اس تمام توہم پرستانہ تعظیم و تکریم کا حق دار جو اس کے جدِ امجد کو عطا کی گئی تھی۔
اس طرح یہ ظاہر ہے کہ بابر کو صرف ایک بادشاہت ہی فتح کرنا نہ تھی بلکہ ایک نظریۂ بادشاہی کی تخلیقِ نو بھی کرنا تھی۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ایسا سلطان ہرگز نہ بنے گا جس پر وہ تمام پابندیاں عائد ہوں جو لودی خاندان کے اختیارات کو محدود کیے ہوئے تھیں بلکہ ایک ایسا بادشاہ بنے گا جو اپنے اعلاترین امرا پر بھی اس زبردست بلندی سے نظرِ حقارت ڈال سکے جہاں تیموری خون کے خداداد حق نے اُسے پہنچادیا تھا۔
جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کوئی انتظامی مشینری موجود نہ تھی جو ہندوستان کو اس نوع کی مرتکز، غیر محدود اور مطلق العنان حکومت کے موثر اقتدار میں لا سکے جو بابر کے 'تصورِ شاہیت' کی ترجمان ہو ــــ ضرورت تھی کسی ایسی چیز کی جو بالکل نئی ہو۔ کوئی ایسی چیز جو مرکزی اور مقامی اہلِ اختیار کی درمیانی خلیج کو پُر سکے ــــ کوئی اسی قسم کی چیز جو آگے چل کر اکبر کے عہدِ حکومت میں وجود میں آئی۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ چونکہ بابر امورِ سلطنت کے انصرام کی کوئی غیر معمولی صلاحیت نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک خالص نبرد آزما تھا جس کو کچھ مدبّرانہ جبلّیات ودیعت ہوئی تھیں۔ اس لیے اس نے اسی نظام کو جاری رکھنا ضروری سمجھا جو پہلے سے موجود تھا ــــ یعنی یہ

---

[1] Primus inter Pares

کہ اپنے محکوم علاقوں کو اپنے بڑے بڑے امرا کے درمیان تقسیم کر دے اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے ہر ایک شخص اپنے حلقۂ اختیار کے علاقے میں انتظام ٹھیک رکھنے کا ذمہ دار ہوگا۔ اس نظام کے نتائج ہمیشہ ایک ہی سے نکلتے رہے تھے۔ اپنے اور مقامی نظم و نسق کے درمیان ایک مصنوعی رکاوٹ کھڑی کرنے کے بعد 'شاہیت' رفتہ رفتہ اپنے اختیارات کھو دیتی تھی۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں اس کا تمام تر وقار رخصت ہو جاتا تھا اور تخت شاہی مجادل سیاسی فرقوں کی کش مکش کا شکار ہو جاتا تھا، دوسری طرف بادشاہ جو کچھ کھوتا تھا وہ بڑے امرا حاصل کر لیتے تھے۔ بابر کے عہدِ حکومت میں تو یہ بات نمایاں نہ ہوئی، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ ایک فاتح کا دبدبہ و وقار رکھتا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس کا عرصۂ حکومت اتنا مختصر تھا کہ اس کی پالیسی کے نتائج محسوس نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم اس کی موت سے پہلے بھی نظم و نسق کی بنیادی خرابی کی علامات تلاش کرنے کے لیے زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ پُرانا بے ڈھنگا نظام مالیات بندوقچیوں اور توپچیوں کی نوعیت کے اُن 'پیشہ ور' سپاہیوں کے مصارف نگہداشت کے لیے ذرائع فراہم کرنے سے کلی طور پر قاصر رہا جن کی تنخواہیں براہِ راست شاہی مالیہ سے ادا کی جاتی تھیں۔ دہلی اور آگرہ میں جو شاہی مالی ذخیرے موجود تھے اُن کو حد سے زیادہ سخاوت سے تقسیم کرنے کے بعد بابر نے اچانک اپنے پاس ایک خالی خزانہ پایا۔ وقتی طور پر اس دُشواری کو تمام بڑے مناصب کی آمدنی پر تیس فی صدی ٹیکس لگا کر دور کر لیا گیا لیکن عہد ہمایونی میں مالی نظام کی برہمی کے ساتھ ساتھ انقلاب، سازش اور ایک شاہی خاندان کی معزولی کی پُرانی کہانی پھر سے دُہرائی گئی ہے۔ یہ خانوادۂ تیموریہ کی ایک نادر خوش نصیبی تھی کہ آبائی مفتوحہ مملکت کی جو میراث اُنھوں نے ضایع کر دی تھی اس کو دوبارہ حاصل کر سکے اور وہ بھی اس صورت میں کہ ان کی اس میراث کو افغان شیر شاہ نے مستحکم بنا دیا تھا جو انتظام سلطنت کے معاملے میں ایک نمایاں جدّت طرازی کی اہلیت رکھتا تھا اور جس نے مغلوں کے لیے انتظامی مشنری کا وہ ڈھانچہ غیر شعوری طور پر تیار کر دیا جو اگرچہ ان کے اپنے جدید تصوّر شاہیت کی نصرت و کامیابی کے لیے ضروری تھا لیکن وہ بذات خود اس کو تیار کرنے سے بالکل معذور رہے تھے۔ اگر بابر سلطنت کے نظم و نسق میں بھی اتنا ہی کامیاب ہوتا

جتنا جنگ کے میدان میں تو ہمایوں کے عہدِ حکومت کی مشکلات کبھی پیدا ہی نہ ہوسکتیں۔
لیکن واقعہ یہ تھا کہ اُس نے اپنے بیٹے کے لیے ایسی بادشاہت چھوڑی جو صرف جنگی حالات کو جاری رکھنے ہی سے قایم و مربوط رہ سکتی تھی اور جو زمانۂ امن میں کمزور، بے ہیت اور غیر مہرہ پشت تھی۔ بابر کی قایم کردہ بادشاہت پر ایک انتہائی بصیرت افروز تنقید خود شیر شاہ نے کی ہے:

"چونکہ میں مغلوں کے درمیان رہ چکا ہوں اور فعل و عمل کے دوران ان کی روش کو جانتا ہوں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ان کے یہاں کوئی نظم یا انضباط نہیں ہے اور ان کے بادشاہ اپنے نسبی و منصبی غرور کے باعث بذاتِ خود حکومت کی نگرانی نہیں کرتے بلکہ سلطنت کے تمام معاملات اپنے امرا و وزرا پر چھوڑ دیتے ہیں جن کے قول و فعل پر وہ مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ یہ عمائدین ہر معاملے میں فاسد نیت سے کام کرتے ہیں خواہ وہ معاملہ ایک سپاہی کا ہو یا ایک کسان کا یا ایک بغاوت پسند زمیندار کا ــــــ جس کے پاس دولت ہو، خواہ وہ وفادار ہو یا غیر وفادار، وہ رقم دے کر اپنی مرضی کے مطابق کام کرا سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے پاس دولت نہیں تو چاہے وہ سینکڑوں مرتبہ اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکا ہو یا کتنا ہی جنگ آزمودہ سورما ہو وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس دولت کی ہوس میں وہ دوست و دشمن کی کوئی تمیز نہیں کرتے۔"[1]

اس لیے بحیثیت منتظم نہیں بلکہ بحیثیت فاتح ہمیں بابر کو سلطنتِ مغلیہ کا بانی کہنا چاہیے۔ اس کی فتوحات ہی اہم ہیں اُس کی انتظامی تدابیر نہیں، کیونکہ جہاں اول الذکر اس کے جانشینوں کی قوت کا سنگِ بنیاد و سرچشمہ بنی رہیں، وہاں موخر الذکر بالکل ترک کیے جانے سے پہلے بہت کچھ تباہی کا باعث ہوئیں۔

تین سال کی اس پوری مدت میں جو کنوہ کی جنگ اور بابر کی موت (۱۵۳۰ء) کے درمیان گزری وہ تقریباً مسلسل طور پر اپنی مملکت کی حفاظت و توسیع کے لیے فوجی

---

[1] تاریخ شیر شاہی، ایلیٹ و ڈاؤسن، چہارم، ص ۳۳۰، ۳۳۱

کارروائیوں میں مصروف رہا۔ مہموں کے درمیانی وقفوں میں وہ ملک میں ادھر اُدھر گھوم کر ملک میں تفریح کرتا تھا۔ اس کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا اور اپنے تاثرات اپنے قارئین کی خاطر قلم بند کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنا بہت سا وقت تعمیراتی سرگرمیوں کی نگرانی میں بھی صرف کرتا تھا اور اپنے لیے محلات، حمام و باغات بنوانے میں وقت گزارتا تھا جن کی ساخت ایسی تھی کہ موسم گرما کی شعلہ سامانیوں سے بچنے کے لیے پناہ گاہوں کا کام دے سکیں۔

مشرقی باغیوں کو زیر کرنے کے بعد، جس کی تفصیل پچھلے باب میں بیان ہوئی ہے بابر کی سب سے پہلی کسی قدر اہم فوجی کارروائی دسمبر ۱۵۲۷ء میں ہوئی۔ بابر نے فیصلہ کیا کہ اگرچہ راجپوت ریاستی اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا گیا ہے تاہم ابھی تک انفرادی طور پر کچھ سردار ایسے ہیں جنھیں سبق دینے کی ضرورت ہے۔ اُن میں سب سے زیادہ مشہور مالوہ کا 'بادشاہ گر' میدنی راؤ تھا جس کے قبضے میں اُس وقت چندیری کا زبردست قلعہ تھا۔ ایک جہاد کا اعلان کر دیا گیا اور ۹ دسمبر کو بابر سیکری سے مالوہ کی دشوارگزار مسافت پر روانہ ہو گیا۔ لیکن روانہ ہونے سے پیشتر اُسے افغانوں کے معاندانہ رویے کی روک تھام کی تدابیر کرنا ضروری تھا۔ چونکہ اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ مشرقی امرا کی خیرسگالی صرف مشکوک ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے' اس لیے بابر نے اُس نواح کے شاہی وفاداروں کو قنوج میں جمع ہونے کی ہدایت دی —— خوفناک و زبردست شیخ بایزید کو جس کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ امن و صلح پر کاربند ہے —— دشمن افغانوں کے خلاف مجوزہ مہم میں شرکت کرنے کی دعوت دی گئی —— لیکن اُس کے انکار کی صورت میں بابر نے حکم دیا کہ سب سے پہلے اُسی پر حملہ کیا جائے۔

مشرقی معاملات کا اس طرح بندوبست کرنے کے بعد بابر نے گنگا اور چنبل کے سنگم کے پاس کنار گھاٹ پر دریا کو پار کیا اور کالپی کی طرف روانہ ہوا۔ کالپی سے وہ ایرچ اور بھاندر کے راستے کچرن روانہ ہوا[1] کچرن سے چندیری تک سڑک

---

[1] فوج کے اس کوچ کی تفصیلات ترکی و فارسی متن میں اسمائے معرفہ کے بگڑ جانے کی وجہ سے بہت گنجلک ہو گئی ہیں۔ میں ان تفصیلات کے سلسلے میں ایم۔اے۔ او کالج علی گڑھ میں تاریخ جغرافیہ

(باقی اگلے صفحے پر)

بہت خراب علاقے سے گزرتی تھی۔ اور فوج کو گزرنے کے لیے راستے کو ہموار کرنے اور جنگل کاٹنے کو سفر مینا کے جوان آگے بھیجے پڑے ــــ پھر اُس نے اس دریا کو پار کیا جسے وہ "دریائے بُرہان پور" کہتا ہے ــــ شاید یہ ایک چھوٹی ندی تھی اور اُس زمانے میں ان خشک شدہ ریتیلے دریائی راستوں میں سے ایک پر بہتی تھی جو اب بھی بانپور (بن پور) اور للت پور کے درمیان موجود ہیں ــــ اس کو پار کرنے کے بعد بابر نے ۲۱ جنوری ۱۵۲۸ء[1] میں چندیری کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ قلعہ شکن توپوں کے لیے ایک مناسب جگہ چُنی گئی۔ دمس اور اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں تیار کی گئیں۔ بابر نے جس کا مقصد صرف باغی سردار کی اطاعت و وفاداری کو پختہ و یقینی کرلینا تھا، بڑی آسان شرائط پیش کیں مگر میدنی راؤ نے (انھیں) بہت حقارت سے مسترد کردیا۔ ۲۸ جنوری کو بابر اپنے پڑاؤ سے دھاوے کا مصمم ارادہ کرکے روانہ ہوا۔ جیسے ہی آخری تیاریاں مکمل ہوئیں ایک قاصد خبر بد لے کر آپہنچا۔ بایزید کے خلاف شبہات صحیح ثابت ہوئے تھے کیوں کہ مشرق کے تحفظ کے لیے جو فوجیں جمع کی گئی تھیں انھیں افغانوں نے شکست دے کر پسپا کردیا تھا۔ لکھنؤ کو بھی خالی کرنا پڑا تھا۔ اس بحران میں بابر نے اپنی فطری ہمت و پامردی کا ثبوت دیا اور جس مہم میں مشغول تھا اُس کی طرف سے مُنھ موڑنے سے انکار کردیا۔ دوسرے دن صبح حملہ کردیا گیا اور ایک جانبازانہ جنگ کے بعد قلعے پر قبضہ کرلیا گیا ــــ اور اس فتح کے موقع پر دہشت و خوف اور قتل عام کے وہ تمام مناظر دیکھنے میں آئے جو ہمیشہ سے ہی ایک مضبوط راجپوت قلعے کی تسخیر کے وقت نظر آیا کرتے تھے۔

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

کے لکچرر قاضی جلال الدین اور آگرہ کے سینٹ جانسن کالج میں تاریخ کے پروفیسر شیخ عبدالقادر کا بہت ممنون ہوں جنھوں نے مسئلہ زیر بحث پر بہت کچھ مقامی معلومات فراہم کی ہیں۔ ابن بطوطہ کے بیان کردہ مقام پھراوہ کے سہارے پر جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ متن کا شہر کچھوہ آج کل شہر کچران ہے اس سے میں پوری طرح مطمئن نہیں لیکن میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس نام کے گاؤں کے پاس اس پہاڑی آبادی کا مقام بابر کے بیان کے بالکل مطابق ہے

[1] این۔ ڈبلو۔ پی گزیٹیر، اوّل، ص ۵۱۵

فروری کی دو تاریخ سے پہلے ہی بابر پھر حرکت میں آگیا۔ اس مرتبہ اس کی منزل اس کے مشرقی مقبوضات کا وہ مقام تھا جو خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ وہ ۲۷ فروری کو قنوج پہنچا اور بالکل بروقت پہنچا کیوں کہ راستے ہی میں اُس نے سُنا کہ شہر سے ہاتھ اٹھالیا گیا ہے اور شمس آباد کو دشمنوں نے یلغار کر کے قبضے میں کر لیا ہے۔ لیکن بابر کے آنے کی خبر سن کر باغیوں کے سردار بایزید، بیبن اور معروف پیچھے ہٹ گئے۔ قنوج کے مقابل والے گنگا کے مشرقی کنارے پر قبضہ کرلیا اور بابر کا راستہ روکنے کو مستعد ہوگئے۔

اپنے توپ خانے کی آڑ میں بابر نے زبردستی (گنگا) پار کرنے کی ٹھان لی۔ بابر کے توپ خانے سے بہت نقصان اٹھانے کے باوجود دشمن اس کوشش کو لایعنی قرار دے کر اُس کا مذاق اُڑاتے رہے مگر جو پُل اس کے سفرمینا کے دستے تیار کر رہے تھے وہ استقلال سے تیار ہوتا گیا۔ انجام کار بارہ و تیرہ مارچ کو ہراول دستے پُل پار کر کے دشمنوں سے بھڑ گئے۔ اگرچہ کچھ تیز جھڑپیں ہوئیں مگر کوئی عام جنگ نہ ہوئی اور بابر کی راہ روکنے سے نااُمید ہو کر پندرہ مارچ کی شب میں افغان باغیوں نے اپنا پڑاؤ چھوڑ دیا۔ چونکہ خود بادشاہ اودھ جانا چاہتا تھا اس وجہ سے بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کرنے کا کام چن تیمور سلطان کے سپرد ہوا لیکن یہ کام کچھ ایسے تساہل و تاخیر کے انداز سے ہوا کہ دشمن کے ایک دفعہ پھر حملے کے لیے جمع ہو جانے کا کچھ خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس پر بابر نے تعاقب کرنے والوں کی مدد کو کمک بھیجی اور بھاگنے والوں کا پیچھا اور زور شور سے شروع ہوگیا۔ بہت سا سامان ہاتھ لگا اور کئی امرا کے اہل و عیال قیدی بنا لیے گئے۔

۹۳۴ھ کے باقی زمانے کے لیے تزک میں خامی ہے، اس لیے ہم صرف قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں کہ ستمبر ۱۵۲۸ء تک بابر نے اپنا وقت کیسے گزارا ہوگا! موسم کی وجہ سے کوئی وسیع فوجی مہم تو ممکن نہ ہوگی اور اغلب یہ ہے کہ بادشاہ نے اپنا وقت تعمیری منصوبوں اور اُس کتاب کی تالیف میں صَرف کیا ہوگا جس کے ہم ممنون ہیں کہ بابر کے متعلق اتنی بہت سی معلومات اس سے حاصل ہوتی ہیں۔ 'تزک' جب پھر شروع ہوتی ہے تو ہم بابر کو آگرہ میں اپنے گوالیار کے دورے کے لیے تیاریوں میں مشغول پاتے ہیں۔ روانہ ہونے سے کچھ پہلے اس نے بہت سی دیگر ممتاز شخصیتوں کے ساتھ

'حبیب السیر' اور دوسری کتابوں کے مصنّف خواندمیر کو شرف باریابی عطا کیا جو دربار ہرات سے فاتحِ ہندوستان سے متعارف ہونے آیا تھا۔[1] بابر کے کارنامے کی عصر آفریں حیثیت کا بیرونی دُنیا میں یہ پہلا اعتراف تھا۔ اس ملاقات کے بعد بابر اپنے مجوزہ دورے پر روانہ ہوگیا۔ گوالیار گیا اور مان سنگھ اور وکرمادت کے محلات دیکھنے میں کچھ وقت صرف کیا۔ ان کے طول و عرض اور شان و شوکت سے متاثر ہوا حالانکہ وہ ان میں خوش مذاقی و نفاست کے فقدان کا کچھ شکوہ کرتا ہے۔

۱۵۲۸ء کے اواخر میں ہمایوں نے اپنے دور اُفتادہ صوبۂ بدخشاں سے بہت فخر کے ساتھ اپنے پہلے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی، جس کا نام اُس نے کچھ نا موزوں طور پر 'اَلاَمان' انتخاب کیا تھا۔ اس اطلاع کے جواب میں جو خط بابر نے لکھا اُسے صحیح طور پر "بے لاگ، فردہ گیرانہ اور شفقت آمیز" کہا گیا ہے۔ پُرجوش مبارکباد اور محبت آمیز پیغامات کے بعد شہنشاہ اپنے خط کو اپنے نومولود پوتے کے نام پر تبصرے سے شروع کرتا ہے۔ اَلاَمان کے معنی "حفاظت" کے ہیں لیکن بدقسمتی سے لوگ اس کا تلفظ اَلاُمان اور اِلاَمان کرتے ہیں۔ ترکی میں اول الذکر کے معنی "ڈاکو" ہیں اور دوسرے کے معنی ہیں "میں محسوس نہیں کرتا۔" اس عیب کو نرم سے نرم الفاظ میں ایک افسوسناک ابہام کہنا چاہیے۔ آگے چل کر وہ ہمایوں پر امورِ سلطنت میں لاپرواہی برتنے کا الزام لگاتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان سے بدخشاں کا سفر صرف ایک ماہ کا تھا لیکن پھر بھی بیٹے کے پاس فرستادہ شہنشاہ کے ایلچی کو کبھی کبھی واپس لوٹنے میں ایک سال لگ جاتا تھا! پھر وہ ہمایوں کو اپنے خطوط میں بار بار یہ جملہ دُہرانے پر سرزنش کرتا ہے کہ ـــــ "میں تنہائی چاہتا ہوں" ـــــ یہ چیز اس کے خیال میں ایک بادشاہ کے لیے بہت بُری ہے۔ اسی طرح وہ ہمایوں کو اپنی تحریروں میں ایسی دور از کار تراکیب کے استعمال پر بھی ٹوکتا ہے جن کو سمجھنا مشکل ہے ـــــ اس پدرانہ فہمائش کے بعد بابر زیادہ اہم امور کا ذکر کرتا ہے۔ ایران کے شاہ طہماسپ کی ازبکوں کے خلاف حالیہ کامیابیوں کی خبر پر جو اس نے حال ہی میں سُنی تھی، بادشاہ اپنے پُرانے

---

[1] پی۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۳۴۲۔ الیٹ وڈاؤسن، چہارم، ص ۱۴۳-۱۵۵

دشمنوں پر پھر حملے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خط میں ہمایوں کے لیے جنگی مہم کا نقشہ مرتّب کرتا ہے۔ وہ اُسے مطلع کرتا ہے کہ اس کا بھائی کامران اور کابل کے بیگ (سردار) اُس کے زیرِ احکام کر دیے گئے ہیں اور اُسے حکم دیتا ہے کہ حصار، مرو یا سمرقند جہاں سب سے زیادہ مناسب معلوم ہو ازبک سرداروں کے خلاف فوج کشی کرے۔ وہ اُسے زیادہ قوت عمل دکھانے کا مشورہ دیتا ہے:

"کیوں کہ سُستی و کاہلی بادشاہت کے ساتھ بالکل مطابقت نہیں رکھتیں۔ اگر تم مجھے خوش کرنا چاہتے ہو تو تمھیں اپنی عزلت پسندی اور اس ناشائستہ و بدنما رجحانِ طبع کو ایک طرف رکھ دینا ضروری ہے جو تمھیں دوسروں کی محبت سے گریز پر مجبور کرتا ہے ۔۔۔۔ اپنے چھوٹے بھائیوں اور امرا کو اپنی خود مختاری جتانے کی اجازت دینے کے بجائے انھیں مجبور کرو کہ وہ روزانہ دو بار تمھاری خدمت میں حاضر ہوں تاکہ جو واقعہ بھی ظہور پذیر ہو اس کے متعلق تم ان سے مشورہ کرسکو۔"

آخر میں ہمایوں کو تاکید کی گئی ہے کہ کامران کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ جو کہ ایک "صحیح قسم کا اور قابل نوجوان" ہے ـــــ اس حکم کی ہمایوں نے وفاداری سے تعمیل کی حالانکہ اس کی وجہ سے اس کو دوامی رنج و غم مول لینا پڑا ـــــ اس کے بعد ہمایوں کو خواجہ کلاں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور تمام ممکنہ ذرایع سے سلطان ویس کا دل جیتنے کی بھی تاکید کی گئی ہے [1]

بعدہٗ جلد ہی ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے بابر کے دل کو فخر سے معمور کر دیا ہوگا۔ سنگرام کے دوسرے بیٹے وکرمادت نے شمس آباد اور ستّر لاکھ روپیے کے تبادلے میں رنتھنبور کو حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس طرح کی پیش کش نے بابر کو یقیناً یہ احساس دلایا ہوگا کہ ہندوستان پر تسلّط کا کام تقریباً مکمل ہوگیا ہے۔ چنانچہ اکتوبر میں اُس نے اگلے موسم بہار میں کچھ عرصے کے لیے کابل جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ بلخ و بدخشاں میں اپنے مفادات کی نگرانی کرسکے جہاں پھر ازبکوں سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا

[1] تاریخ رشیدی، ص ۴۰۰

لیکن چونکہ شاہ طہماسپ نے جوکہ اپنے باپ اسماعیل کے بعد ۱۵۲۳ء میں تخت نشین ہوگیا تھا، جلد ہی ازبکوں کو زبردست نقصان کے ساتھ ہرادیا، اس لیے کابل کی مہم زیرِ عمل نہ آئی۔ لیکن صرف یہی بات کہ ایسی مہم کی بابت کبھی سوچا گیا تھا اس امر کو واضح کرتی ہے کہ بابر ہندوستان کو محفوظ سمجھتا تھا۔ واقعی یہی حقیقت بھی تھی کہ یہ کام بخوبی انجام پاچکا تھا۔ یہ امر بمشکل ہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ کو پھر بذاتِ خود میدان میں آنا پڑے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آئے اگلے ہی سال ایسا کرنا ضروری ثابت ہوا۔

ابتدائے دسمبر ۱۵۲۸ء میں بابر نے اپنے تیسرے بیٹے عسکری[1] کو ایک مضبوط فوج کے ساتھ مشرقی اضلاع میں بھیجا جہاں گڑبڑ کا پھر کچھ اندیشہ معلوم ہوتا تھا۔ بابر کے اپنے علاقے تو واقعی باغیوں سے برائے نام خالی تھے لیکن بایزید، بیبن اور معروف کی سرکردگی میں جو فوج تھی وہ جب پارہ پارہ ہوئی تو اس کی کچھ ٹکڑیوں نے بنگال کی سرحد کے اُس پار پناہ لے لی تھی۔ بابر کو اس سلطنت کو نقصان پہنچانے کی کوئی خواہش نہ تھی جو ہندوستانی سیاسیات کے عام راستے سے الگ تھلگ واقع تھی بشرطیکہ اُسے یقین ہوجاتا کہ اس کے باغیوں کو وہاں کے اربابِ اقتدار سے کوئی حمایت و امداد نہیں ملے گی۔ چنانچہ عسکری کو حکم دیا گیا کہ وہ بنگالیوں پر نظر رکھے لیکن اس وقت تک معاملات خود ہی سنبھالے جب تک کہ ان کی طرف سے شرارت کے آثار نظر نہ آئیں —— اگر ایسا ہو تو اس صورت میں اسے فوراً اپنے باپ کو مطلع کرنا ہوگا۔

اس دوران بابر آگرہ میں ایک مختصر آرام کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اُس نے اپنا کچھ وقت اس عظیم اور جنگی اہمیت کی سڑک کا منصوبہ تیار کرنے میں گزارا جو کہ آگرہ اور کابل کے درمیان مواصلات کا تحفظ کرسکے اور اس سڑک کی پوری لمبائی میں پہرے کے مینار، (دیدبان)، گھوڑے بدلنے کی چوکیاں اور راحت خانے تعمیر کرنے کے متعلق احکام صادر کرتا رہا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر اس نے ایک شاندار ضیافت کا بھی اہتمام کیا جس میں ایران اور ازبکوں کے سفیر نیز مختلف ہندو ریاستوں

---

[1] پیدائش ۱۵۱۶ء

کے ایلچی اور ماوراالنہر کے واجب التعظیم خواجہ شریک تھے۔ سفیروں کو تحفوں اور خلعتِ فاخرہ سے خوب نوازا گیا۔ اپنے اس دورِ خوش حالی میں بابر ان دوستوں کو بھی نہ بھولا جنھوں نے ایامِ بدحالی میں اس کا ہر طریقے سے ساتھ دیا تھا ــــ وہ خود کہتا ہے :

" جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو کہ اندجان سے میرے ہمراہ آئے تھے ــــ اپنے گھر بار سے دور ــــ جو ہر کہیں میرے ساتھ رہے تھے ــــ تسکہ اور ہوشیار سے میرے ساتھ آئے تھے، اُنھیں میں نے خلعتِ فاخرہ ــــ بیش قیمت ملبوسات ــ سیم و زر ــ ہر نوع کے کپڑے تحائف کے طور پر دیے۔"

بابر کی فتح یابی کی تکمیل کے طور پر بنگال سے ایک ایلچی اطاعت کا پیغام لے کر آ پہنچا جس سے کہ صاف باطن بادشاہ کے دل میں بنگالیوں کے امن پسندانہ ارادوں کے متعلق کوئی بھی شبہ نہ رہا۔ یہ یکم جنوری ۱۵۲۹ء کا واقعہ ہے۔

لیکن یہ اظہارِ اطاعت محض دھوکے کی ٹٹی تھا۔ چند ہفتے بعد جب بابر بلوچیوں کے خلاف ایک تعزیری مہم کا انتظام کر رہا تھا جو اُس کے علاقوں پر دھاوے مارتے رہتے تھے تو خبر پہنچی کہ سکندر لودی کے بیٹے محمود نے بہار پر قبضہ کر لیا ہے۔ بابر اپنی مغربی صوبوں والی مجوزہ مہم کو چھوڑ کر خطرے میں گھرے مشرقی اضلاع کی جانب آہستہ آہستہ بڑھا اور راستے میں سفیروں سے ملتا، کابل اپنے نائبوں کو خط لکھتا اور بہت سے امورِ سلطنت کو سرانجام دیتا رہا۔ اُس کا یہ بااطمینان سفر تین مہینے یعنی ۱۰ جنوری سے ۱۰ اپریل تک جاری رہا اور موخرالذکر تاریخ پر اس کے ہراول دستے چنار کے مقام پر دشمنوں سے متصادم ہوئے۔ محمود اور اُس کی فوج اُس کے سامنے سے بھاگ کھڑی ہوئی اور بالآخر سرحد پار کر کے اور بنگال کے حکّام سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بنگالی سفیر کے از سرِ نو اظہارِ وفاداری کے باوجود اُس کے آقاؤں کا انداز بابر کو غیر اطمینان بخش معلوم ہوا۔ اس وجہ سے بادشاہ نے مشرقی سمت کوچ جاری رکھا ــــ یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا بنگالیوں کو یہ شبہ تھا کہ بابر کی نیت مشرقی اضلاع پر حملہ کرنے کی ہے یا یہ کہ وہ شروع ہی سے باغی افغانوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ بہرصورت بنگالی فوج کی چوبیس جمعیتوں نے گنڈک کو پار کر لیا اور اس کے کناروں

پر ایک مستحکم مورچہ جمالیا۔ بابر لڑائی کا خواہش مند نہ تھا اور جب بنگالی ٹھیک اس کی راہ میں گنڈک اور گھاگرہ کے سنگم پر مقابلے کے لیے آ کھڑے ہوئے تو اُس نے جنگ سے بچنے کی ایک آخری کوشش کرتے ہوئے شاہ بنگال سے بہت شائستگی سے درخواست کی کہ اپنی فوج کو اپنے علاقے میں واپس جانے کا حکم دے اور اس بات کی ضمانت دی کہ بنگال یا اہلِ بنگال کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہے ــــــ لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے طاقت کے بل پر دریا پار کرنے کا عزم کرلیا۔

گھاگرہ کی لڑائی گنگا کی لڑائی سے مختلف نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ اس مرتبہ دشمن کے عزائم زیادہ پختہ تھے اور وہ بہتر طور پر توپ خانے سے لیس تھا۔ اس کی زبردست گولہ باری کے باوجود بابر نے نہایت ماہرانہ و شاندار انداز سے زبردستی دریا پار کرلیا اور عسکری کے تحت ایک جماعت جس نے دریا ایک مختلف جگہ سے پار کیا تھا، بنگالی فوج کے پہلو پر حملہ آور ہوئی۔ ۶ مئی ۱۵۲۹ء کو دشمن ایک غضب ناک کش مکش کے بعد فرار ہوگیا۔ اس فتح سے بنگال کا خطرہ ختم ہوجانے کے علاوہ ایک اور اہم نتیجہ برآمد ہوا۔ محمد معروف جسے بنگالیوں نے زبردستی اپنے ساتھ ملالیا تھا، فوراً بابر سے آملا اور اس طرح بابر کو اپنے سب سے زبردست حریف کی مخالفت سے نجات مل گئی۔

لیکن بایزید اور بیبن زیادہ سخت خمیر کے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے سرو پار کرکے لکھنؤ کا محاصرہ کرلیا۔ قلعے میں اتفاقیہ آگ لگ جانے کی وجہ سے اس پر قبضہ ہوگیا۔ اس کامیابی کے بعد باغیوں نے گنگا کو پار کیا اور چنار اور جونپور کی طرف بڑھے۔ لیکن بابر کے آنے کی خبر سنتے ہی ان کی فوج ٹوٹ کر منتشر ہوگئی ــــــ اس پر بابر آگرہ لوٹ گیا۔ یہ اُس کی آخری مہم تھی۔ اب ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ازبکوں کے خلاف مہم میں ہمایوں کی ناکامی سے بابر کو مایوسی ہوئی تھی اور جس طریقے سے اس کا اہتمام ہوا تھا اس سے وہ غیر مطمئن تھا ــــــ اُس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے اور اپنے بڑھاپے کے منظورِ نظر ہندال کو کابل سے واپس بلالیا۔ اُس نے کہا کہ وہ بوڑھا ہورہا ہے اور ایک بیٹے کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے ــــــ لیکن اُسی پیغام میں اس نے اس ارادے کا اظہار کیا کہ اپنی مملکت کے شمالی علاقوں کا بذاتِ خود دورہ کرے گا اور یہ تجویز پیش کی کہ جب تک وہ خود وہاں

نہ پہنچ جائے صلح نہ کی جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز اتنی دیر میں پہنچی کہ اس پر عمل نہ ہوسکا۔ شمال میں لاہور تک تو بادشاہ پہنچ گیا جہاں کامران نے اُس سے ملاقات کی مگر کابل اور ماوراءالنہر جانے کے ارادوں میں نہ صرف معاملات بنگال کی پُر خطر کیفیت بلکہ اُس کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے بھی رُکاوٹ پڑگئی۔ اس زمانے میں معلوم ہوتا ہے اس پر کبھی کبھی شدید قنوطیت کے دورے بھی پڑتے تھے جس کی وجہ سے اُس نے اپنے خاندان والوں کے سامنے تارک الدُّنیا ہونے اور زندگی کے بقیہ سال درویشانہ تنہائی میں گزارنے کا ارادہ ظاہر کیا ـــــ وہ بابر جو پہلے اتنا مضبوط اور پختہ عزائم کا مالک تھا اب ضعیف الارادہ اور متلون مزاج ہوگیا اور حیرت ناک طور پر اپنی سابقہ پاکیزگی حیات کے متضاد عامیانہ قسم کی دُخترانِ فلسطینیہ کے لیے ایک حد سے زیادہ بڑھی ہوئی رغبت و طلب کا اظہار کرنے لگا جس کی مثال وہ دو قافیشی لڑکیاں تھیں جن کو شاہ طہاسپ نے اُسے بطور تحفہ بھیجا تھا ـــــ اگر شیخ زین کی بات پر اعتماد کیا جائے تو بابر کو اُن لڑکیوں سے گہرا تعلق پیدا ہوگیا تھا[1] واقعی ان دو سال کے دوران بابر کی ذہنی توانائی یقینی طور پر سنگین حد تک متاثر ہو چکی تھی۔

غالباً اس غیر معمولی سازش کی شروعات کو اسی زمانے سے منسوب کرنا چاہیے جس کا مقصد بابر کے ورثا کو برطرف کرنا اور اُن کی جگہ میر محمد مہدی خواجہ نامی ایک شخص کو جو اس وقت اٹاوہ کا جاگیردار تھا تخت نشین کرنا تھا۔ اگرچہ یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن اس شخص کے متعلق یقینی معلومات بہت کم ہیں۔ وہ ایک اعلا امیر تھا جو کہ تقریباً دس سال سے بابر کی خدمت میں تھا اور حسب ونسب کے لحاظ سے اُس بلند ترین مذہبی طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس کی باہمی شادیاں اکثر و بیشتر سلطنت میں خالص ترین نسل شاہی کے ساتھ ہوتی رہتی تھیں۔ وہ بابر کی حقیقی بہن خانزادہ بیگم کا شوہر تھا اور 'تزک' کے آخری حصّے میں اُس کا تذکرہ ہمیشہ چوٹی کے امرا کے ساتھ کیا گیا ہے ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر کا تمام عمر کا ساتھی اور مشیر خلیفہ[2] جو کہ اب بادشاہ کی بڑھتی ہوئی ذہنی وجسمانی کمزوری کی

---

[1] تاریخ بابری (نسخہ رام پور)

[2] خواجہ نظام الدین علی برلاس، برادر سلطان جنید برلاس، بابر ہی کی طرح اس خاندان کا فرد تھا جس سے تیمور تعلق رکھتا تھا ـــ ملاحظہ ہو کہون ـــ "تاریخ ایشیا کا تعارف ـ ترک و منگول" ص ۴۴ اور بعدہٗ۔

وجہ سے غیر محدود طاقت حاصل کر چکا تھا' بابر کے تمام بیٹوں کو برطرف کر کے اُس شخص کو تخت نشین کرنے کی ترکیب کر رہا تھا۔

اس سازش کے سلسلے میں جس کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں، کچھ انتہائی دلچسپ مسائل سامنے آتے ہیں۔ خلیفہ کی ٹھیک ٹھیک غرض و غایت کا کہیں بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور قیاس آرائی کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نظام الدین احمد کے ان الفاظ کا مفہوم معلوم کرنے کے لیے نہیں رہ جاتا کہ "بعض ایسے امور کے باعث جو دُنیاوی معاملات کے سلسلے میں پیش آچکے تھے" یہ بوڑھا مشیر بابر کے بعد ہمایوں کی تخت نشینی سے "خوف اور شک وشبہ" محسوس کرتا تھا ـــــ خلیفہ اور اس کے آقا کا باہمی تعلق اس قدر قریبی رہا تھا کہ ابتدا میں ہم بے اختیار یہ سوچنے پر مائل ہوجاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے خود بابر نے ہی اس منصوبے کی ہمت افزائی کی ہو اس لیے کہ ہمایوں کے بہت سے افعال خصوصاً دہلی کے خزانوں کا لوٹنا، بدخشاں کے نظم ونسق میں تساہل اختیار کرنا بابر کے لیے آخری عمر میں شدید آزردگی کا باعث ہوئے تھے ـــ لیکن اپنے بسترِ مرگ سے اس نے جو اعلان کیا اس سے یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے کے علاوہ کسی اور جانشین کے متعلق کبھی بھی نہ سوچا تھا۔ اور غالباً گرتی ہوئی جسمانی اور ذہنی صحت کے باعث انتظام سلطنت سے اس کی معذوری ہی وہ چیز تھی جس نے سازشیوں کو کامیابی کی اُمید دلادی تھی۔ ہوسکتا ہے خلیفہ کو یہ یقین ہو کہ مہدی خواجہ ہمایوں سے بہتر بادشاہ ثابت ہوگا اور واقعی ہمایوں کے اطوار اور سلوک سے اُن سب لوگوں کو سخت تشویش ہوگی جن کو سلطنت کی بہبودی دل سے عزیز تھی۔ بہرحال اس منصوبے کا کسی بھی حد تک قابلِ عمل سمجھا جانا بابر کی ذہنی و جسمانی کمزوری کا واضح ثبوت ہے۔

یہ ۱۵۲۹ء کے موسم گرما کا واقعہ ہے کہ ہمایوں کو جو درباری سیاست سے بہت دُور بدخشاں میں تھا ایسی خبر ملی جس نے اُسے سخت ترین تشویش میں مبتلا کردیا۔ اس امر کی مستحکم قیاسی شہادت موجود ہے کہ یہ اس کی ماں ماہم ہی تھی جس نے اُسے واپس آنے کا حکم دیا تھا جو بذاتِ خود اس وقت ایک مطمئن انداز میں آہستہ آہستہ کابل سے اپنے شوہر کے پاس آگرہ جارہی تھی اور اس سے قدرتی طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ایسا صرف اس لیے کیا کیوں کہ اُسے کسی طرح سے ہمایوں کو تخت سے محروم کرنے

کی سازش کا علم ہوگیا تھا[1] لیکن ذریعۂ علم خواہ کچھ بھی ہو بہر حال یہ خبر جو ہمایوں کو ملی اپنے اندر اتنا کافی وزن رکھتی تھی کہ اس نے اس شہزادے کو جو اچانک فیصلوں اور پُرسرعت عمل کی عادت میں مبتلا نہ تھا ایک قوی اور فیصلہ کن قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ یعنی وہ اپنی حکومت کو چھوڑ کر احکام کا انتظار کیے بغیر مستقر میں حاضر ہوگیا[2]۔ خبر کی سنگین اہمیت کا ایک اور اشارہ اس کے اس طرزِ عمل سے بھی ملتا ہے جو اُس نے اپنی رعایا کے احتجاجات کو نظر انداز کرنے میں اختیار کیا۔ اہلِ بدخشاں نے اس سے التجا کی کہ اپنی حکومت کا سلسلہ جاری رکھے ورنہ ایسا نہ ہو کہ ازبک لوگ پورے مُلک پر قبضہ کر لیں۔ ہمایوں نے محض بہانہ بنا دیا کہ شہنشاہ کی طرف سے اُسے فوری واپسی کے احکام ملے ہیں۔ پھر اس نے ناعاقبت اندیشانہ جلدبازی میں ایسا نائب مقرر کیا جو کہ ہرگز اس کی جگہ پُر کرنے کا اہل نہ تھا اور سُرعت سے کابل روانہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۸ جون کو کابل پہنچا ہوگا[3] جہاں اُس کی ملاقات کامران و ہندال سے ہوئی۔ موخرالذکر چند ماہ پہلے اپنے والد سے مل کر لوٹا تھا لیکن اس وقت اُسے پھر آگرہ حاضر ہونے کا حکم ملا ہوا تھا، تینوں بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بظاہر اس بات پر سب متفق ہوگئے کہ معاملات سنگین شکل اختیار کر گئے ہیں ـــــ انھوں نے یقیناً محسوس کر لیا ہوگا کہ مستقبل میں

---

[1] کیا یہ ممکن ہے کہ ماہم کو جو کہ کابل میں ہونے کی وجہ سے آگرہ کی سیاست سے قریبی رابطہ نہیں رکھ سکتی تھی اپنے بیٹے کے خلاف سازش کی پہلی اطلاع (اس کے) حریف اُمیدوار کے علاقے ضلع اٹاوہ سے گزرتے ہوئے ملی ہو؟

[2] مرزا حیدر (تاریخ رشیدی، ص ۳۸۷) لکھتا ہے کہ درحقیقت ہمایوں کو بابر نے بُلایا تھا مگر اس بیان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ یہ شہزادے کا خود ساختہ عُذر تھا۔ کیوں کہ (ا) ہمایوں کے آگرہ میں وارد ہوتے ہی سب ہی حیران رہ گئے۔ (ب) بابر ہندال کا منتظر تھا اور ایک وقت میں دونوں لڑکوں کو ہرگز نہیں بُلایا ہوگا۔ (ج) بدخشاں کے والی کی حیثیت سے کوئی جانشین چُنا نہیں گیا تھا۔ (د) ہمایوں کو بابر نے اپنے علاقے پر واپس جانے کا حکم دیا۔

[3] اس تاریخ کے متعلق کچھ شبہ نہیں۔ ۸ جون کو تسلیم کرنے کے لیے میری وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

(باقی اگلے صفحے پر)

تینوں کے مقام و منصب کا انحصار ہمایوں اور اُس کی والدہ کی اس اہلیت پر ہے کہ وہ خلیفہ کو اس کے منصوبوں کی بساط پر کس طرح مات دیتے ہیں۔ آخر کار ایک عملی منصوبہ ان کے ذہن میں آیا۔ طے یہ کیا گیا کہ ہمایوں بسرعت تمام آگرہ جائے اور ہندال بدخشاں میں اُس کی جگہ لے۔ اس عرصے میں کامران کابل پر اپنی گرفت مضبوط رکھے۔ اس منصوبے پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا گیا۔

ہمایوں کی ماں ماہم کابل سے ایک بااطمینان و سست رفتار سفر کے بعد ۲۷ جون کو آگرہ پہنچ گئی اور قیاس ہے کہ اُس کا بیٹا بسُرعت سفر کر کے صرف چند گھنٹے بعد ہی آ پہنچا۔ ہمایوں نے دربار میں ٹھیک اس وقت خود کو پیش کیا جب ماہم بابر کو اُس کے متعلق شفقت و محبت سے بات چیت کرنے کی منزل تک لے آئی تھی۔

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

پاوے۔ ڈی۔ کورٹیل نے جو ناتمام تحریر چھوڑی ہے (دوم، ص ۴۵۷) اُس میں درج ہے کہ جب شہزادے ملے تو کابل میں "جشنِ بیرم" جاری تھا۔ یہ یا تو پہلی شوال (۸ جون) یا ۱۰ ذی الحجہ (۱۵ اگست) کو ہو سکتا ہے۔ اول الذکر تاریخ کے باب میں مندرجہ ذیل ثبوت ہیں۔ اگر دسمبر ۱۵۳۰ء سے حساب لگائیں تو ہمیں معلوم ہے کہ مرنے سے دو تین مہینے پہلے بابر صاحبِ فراش تھا (گلبدن بیگم ص ۱۰۵) اور جب ہمایوں کی بیماری نازک مرحلے پر تھی تو موسم بہت گرم تھا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ (ہمایوں کے بستر کا) طواف اگست یا ستمبر میں ہوا ہوگا۔ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ہمایوں کچھ عرصے سے بیمار تھا جبکہ بابر کو اُس کی اطلاع ملی۔ (کورٹیل۔ دوم، ص ۴۹۵) اور سنبھل اور متھرا سے دہلی کے راستے آگرہ کے سست رفتار سفر میں کوئی کم وقت نہ لگا ہوگا۔ یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کی بیماری ۱۵۳۰ء کے موسم بہار میں شروع ہوئی اور چھ مہینے جو اُس نے اپنی جاگیر پر گزارے ۱۵۲۹ء کے موسم خزاں سے پہلے نہ شروع ہوئے ہوں گے۔ یہ حقیقت کہ واپس جانے سے پہلے اُس نے کچھ وقت دربار میں گزارا ہمیں دو ممکن تاریخوں میں سے اول الذکر کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس ثبوت کے سلسلے کی مضبوطی کی خود 'تزک' سے آزادانہ تصدیق ہوتی ہے۔ یہ لکھا ہے (پاوے۔ ڈی۔ کورٹیل، دوم، ص ۴۳۹) کہ پہلی ذی قعدہ ۹۳۵ھ (۸ جولائی ۱۵۲۹ء) کو ہمایوں اور ماہم کو آگرہ کے دیوان میں تحفے پیش کیے گئے۔

اور بلاشبہ یہ اس زیرک خاتون کا ہی اثر تھا کہ شہزادہ بے عزت ہونے سے بچ گیا۔
بادشاہ اپنے بیٹے کے ترکِ فرائض سے بہت خفا تھا۔ لیکن آس نے اس خرابی سے
زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ بدخشاں کو اپنے قبضے میں رکھنے کا معاملہ کافی
اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ اس کو اب بھی یہ امید تھی کہ اگر صحت و طاقت بحال ہو گئی
تو اُس سلطنت (بدخشاں) کو وسط ایشیا میں اپنے مورثِ اعلا تیمور کے مقبوضات
کو دوبارہ حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کے لیے بطور مرکز استعمال کرے گا۔ چنانچہ
اُس نے خلیفہ کو حکم دیا کہ وہاں جاکر اس کا انتظام سنبھالے۔ بوڑھے وزیر نے جس کا
غالباً یہ خیال تھا کہ اس تجویز میں ماہم کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے بڑی سختی کے ساتھ ایسے
وقت دربار چھوڑنے پر اعتراض کیا جب کہ اس کی غیر موجودگی ہمایوں کی جماعت کی
کامیابی کے مترادف ہوتی۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس نے " تعمیل میں تاخیر کی "
تب بابر نے ہمایوں کو جانے کو کہا۔ شہزادے نے جواب دیا کہ اگر آسے ایسا حکم دیا
گیا تو وہ بے شک تعمیل کرے گا مگر وہ اپنی مرضی سے خود کو جلا وطن ہرگز نہیں کرے گا۔
آخری حل کے طور پر مرزا سلیمان ولی عہد کو اپنے والد کی سلطنت پر قبضہ کے لیے بھیجا گیا۔
بابر نے جوان تمام پریشانیوں سے پژمُردہ معلوم ہوتا تھا یہ اعلان کیا کہ وہ
باغ زرفشاں میں ایک حجرے میں عزلت گزیں ہونے اور سلطنت کو ہمایوں کے سپرد
کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے جو بدیہی طور پر اب پھر مراسمِ خسروانہ سے سرفراز ہو چکا تھا
—— لیکن شہنشاہ کو یہ ارادہ ترک کرنے پر راضی کر لیا گیا اور یہ ضمنی واقعہ صرف
دو باتوں کی وجہ سے اہم قرار دیا جا سکتا ہے —— اوّل تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ بابر کی
صحت اس وقت بہت کمزور تھی اور دوسرے یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمایوں نے بروقت
پہنچ کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا جو اس کو تخت سے محروم کرنے کے لیے کی جارہی تھی۔
اس کے ذاتی حسنِ اخلاق و اطوار نے نیز اپنے باپ کی اطاعت شعاری و فرماں برداری
نے جس کی ذہنی اور جسمانی توانائی تیزی کے ساتھ انحطاط پذیر تھی اس کی گرفت کو
بابر کی شفقتوں پر مکمل طور سے مضبوط کر دیا تھا۔ احمد یادگار ایک قصّہ بیان کرتا ہے جو کہ
اگر صحیح ہے جیسا کہ کافی قرینِ قیاس ہے تو اس سے شہنشاہ کی اس وقت کی حالت[54] کا

---

[54] اس سے ایک دل چسپ بات اور بھی ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ قصّہ ہی
(باقی اگلے صفحے پر)

بھی اندازہ ہوتا ہے اور شہزادے کے ان خدشات کا بھی اظہار ہوتا ہے جو اس کو اپنے باپ کے ارادوں سے لاحق تھے —— وہ ارادے جو شہزادے کے لیے یقیناً بہت کچھ ذہنی کرب و اذیت کا باعث ہوئے ہوں گے :

"ایک شام جب بادشاہ شراب نوشی میں مشغول تھا تو اُس نے محمد ہمایوں کو طلب کیا اور جب وہ نونہال بوستان خسروی حاضر ہوا تو شراب سے مغلوب ہو کر اعلیٰ حضرت تکیہ پر محوِ خواب ہو چکے تھے۔ شہزادہ دست بستہ بے حس و حرکت وہیں کھڑا رہا، جب نصف شب کو بادشاہ نیند سے بیدار ہوا تو اُسے کھڑا پایا۔ پوچھا 'تم کب آئے؟' اس نے جواب دیا 'جب مجھے آپ کے احکام ملے'۔ تب بادشاہ کو یاد آیا کہ اُسے طلب کیا تھا اور اُسے بڑی مسرت ہوئی اور کہا 'اگر خدا تمہیں تخت و تاج عطا کرے تو اپنے بھائیوں کو موت کے گھاٹ نہ اُتارنا بلکہ ہوشیاری سے ان کی نگہداشت کرنا'۔ شہزادے نے زمین پر سر جھکا دیا اور جو کچھ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا اس کو قبول کر لیا۔"

اس واقعے کے فوراً بعد ہمایوں نسبتاً زیادہ ذہنی سکون کے ساتھ اپنی جاگیر کا بندوبست مکمل کرنے کے لیے ایک بڑی فوج لے کر سنبھل چلا گیا۔ یہاں وہ بظاہر بڑی قناعت اور سکون کے ساتھ چھ مہینے رہا لیکن اس مدت کے اختتام پر جب کہ ۱۵۳۰ء کا موسم گرما شروع ہو رہا تھا وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کے باپ کو اس کی خبر ملی تو خاصا گھبرا کر حکم دیا کہ شہزادے کو دہلی لایا جائے اور پھر وہاں سے پانی

(بقیہ فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

اس بات کا واحد ثبوت ہے کہ بابر نے جنگ کنوہ کے وقت جو شراب سے پرہیز کا عہد کیا تھا وہ توڑ دیا۔ اس طرح کے معاملات میں احمد یادگار کی سند کافی اہم ہے۔ اس کا اپنا باپ مرزا عسکری کی خدمت میں تھا اور بابر کے عہدِ حکومت کے آخری چند سال کے متعلق وہ کئی خاص واقعات کی تفصیل دیتا ہے جو کہ کسی اور مصنف کے یہاں نہیں ملتیں۔ (ملاحظہ ہو ایلیٹ و ڈاؤسن، جلد پنجم۔ ہنری بیورج، جے، اے، ایس، بی ۱۹۱۶ء)

کے راستے آگرہ پہنچادیا جائے ـــــ لیکن جب ہمایوں دہلی پہنچا تو اس کی حالت اتنی نازک تھی کہ اس کے یار غار عیاش طبع مولانا محمد پرغری (؟ فرغری) نے ماہم کو جو اس وقت اپنے شوہر کے ساتھ دھولپور میں سیر و تفریح کر رہی تھی فوری پیغام بھیجا " ہمایوں مرزا بیمار ہیں اور حالت بہت غیر ہے۔ ملکہ عالیہ بیگم صاحبہ کو فوراً دہلی آجانا چاہیے کہ مرزا بہت ناتواں ہو چکے ہیں۔"[1] ماہم اپنے بیٹے سے ملنے روانہ ہوگئی اور اُسے متھرا میں پایا۔ آگرہ پہنچتے پہنچتے وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا اور جب گلبدن اور اس کی بہنیں دیکھنے گئیں تو انھوں نے اُسے سرسام میں مبتلا پایا۔ بابر نے جب اپنے بیٹے کی کیفیت دیکھی تو سخت مضطرب ہوگیا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا چھوٹا لڑکا الور جا تا رہا تھا یقیناً اب اُسے بدترین اندیشے لاحق تھے۔ ماہم نے اس کی دلدہی کی ایک درد انگیز کوشش کی:

> " میرے بیٹے کے لیے حضور پریشان نہ ہوں، آپ بادشاہ ہیں آپ کو کیا غم؟ آپ کے تو اور بھی بیٹے ہیں ـــ میں رنج کرتی ہوں کیوں کہ میرا صرف یہی ایک ہے۔"

بابر کے جواب سے ظاہر ہے کہ اس کا ذہن ہمایوں کو اپنا جانشین بنانے پر کس حد تک جم چکا تھا:

> " ماہم! اگرچہ میرے اور بھی بیٹے ہیں لیکن میں کسی سے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی تمھارے ہمایوں سے ـــ میری آرزو ہے کہ اس لاڈلے بچّے کی دلی مُراد بر آئے اور لمبی عُمر پائے۔ میں سلطنت اُسی کو دینا چاہتا ہوں اور دوسروں کو نہیں کیوں کہ قدر و امتیاز میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔"[2]

اپنے بیٹے کے لیے بابر کے ایثار کی کہانی مشہور ہے۔

دانش مندوں سے مشورہ کرنے کے بعد بابر نے طے کیا کہ بیمار کی ملکیت میں سے سب سے قیمتی چیز کی قربانی دے کر اس کی جان کا صدقہ ادا کیا جائے۔ کچھ نے تجویز پیش کی کہ بڑے ہیرے (کوہِ نور) کو خیرات کر دیا جائے لیکن بابر نے خود کو

---

[1] گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۰۴ [2] ایضاً، ص ۱۰۴، ۱۰۵

ہمایوں کی سب سے قیمتی ملکیت سمجھ کر اپنی زندگی کی قربانی دینے کا ارادہ کرلیا۔ مخصوص رسوم کے بعد اس نے مریض کی چارپائی کا تین مرتبہ طواف کیا اور پھر پکار کر کہا کہ اس نے ہمایوں کی بیماری اپنے اوپر لے لی ہے۔ کہانی کے مطابق اس وقت سے ہمایوں اچھا ہوتا گیا اور بابر کی طبیعت گرتی گئی۔ اس رسم کے ذریعے جس پر آج بھی اہلِ ایشیا اعتقاد رکھتے ہیں، بابر کو یقین تھا کہ اس نے جان دے کر اپنے بیٹے کو موت سے چھڑا لیا تھا۔ ہمایوں (واقعی) اچھا ہوگیا اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے شہنشاہ جو عرصے سے بیمار تھا یہ سمجھنے لگا کہ اب اس کی زندگی کا حق ضبط ہوچکا ہے۔

اس واقعے کے راویوں میں سے کچھ لوگ ایسا ظاہر کرتے ہیں گویا بابر فوراً ہی مرگیا۔ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ ہمایوں آگرہ چھوڑ کر بظاہر اپنی جاگیر پر واپس چلا گیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے والد کی صحت کی طرف سے تشویش کرنے کی کوئی سنگین وجہ نہیں پائی تھی اور ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں دیکھی تھی۔ شہنشاہ دو تین مہینے بیمار سا رہا مگر اس کی فوری موت کا کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن پھر یک لخت ہی اس کی حالت بگڑ گئی اور ہمایوں کو جو ایک فوج کے ساتھ کالنجر گیا ہوا تھا عجلت سے طلب کیا گیا۔ ان چند مہینوں کے عرصے میں اس کے والد میں جو تبدیلی ہوئی تھی اس کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اور ڈاکٹروں سے کہا "میں تو انھیں اچھا چھوڑ کر گیا تھا، یہ اچانک ہی کیا ہوگیا؟"

ہمایوں کے اپنی خطرناک بیماری سے سنبھلنے اور اپنے والد کے بسترِ مرگ پر بُلائے جانے کے درمیانی وقفے میں محل کے اس سازشی ڈرامے کے آخری مناظر گزر چکے تھے جس میں خلیفہ نے مدد کی تھی۔ اب بوڑھے وزیر کو یقین ہوچکا ہوگا کہ اس کی سازش بمشکل ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔ ہمایوں اپنے باپ کی عنایات میں بہت مضبوط و محفوظ مقام پاچکا تھا اور شاید کسی نہ کسی طریقے پر پہلے ہی تخت کا وارث تسلیم کیا جاچکا تھا[1] بایں ہمہ ہمایوں کے خلاف خلیفہ اس قدر ضدّی جذبات رکھتا تھا اور شہنشاہ کی صحت اتنی کمزور تھی کہ اگر محض ایک واحد رکاوٹ نہ ہوتی

---

[1] اکبرنامہ، مترجم ہنری بیوریج، ص ۲۶۹، ۲۰۰

تو اب بھی بابر کے بیٹوں کی جانشینی خطرے میں پڑ سکتی تھی اور یہ رکاوٹ تھی حریف امیدوار کی شخصیت ـــــ خلیفہ کی عنایات میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے اور یہ بخوبی جانتے ہوئے کہ اس مختارِ کل وزیر کا اثر اس کے مرتے ہوئے آقا پر کس قدر زیادہ ہے مہدی خواجہ نے ایک بادشاہ جیسے انداز اختیار کرنا شروع کر دیے اور اس طرح بہت سے ایسے لوگوں کو ناراض کر دیا جو بصورت دیگر بیش قیمت مددگار و حامی ثابت ہوتے۔ مگر صرف اتنا ہی نہ تھا۔ اس سازش کو انجام کار ترک کر دینے کی براہ راست وجہ مہدی خواجہ کی مغرورالمزاجی تھی۔ اور یہ کچھ بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ 'طبقات اکبری' کے مصنّف نے یہ قصّہ بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے:

"ایک دن ایسا ہوا کہ میر خلیفہ مہدی خواجہ سے ملنے گیا جو اپنے شہ نشین میں تھا۔ صرف میر خلیفہ اور مصنّف کے والد' دیوانِ بیوتات خواجہ مقیم ہراوی خواجہ کے پاس موجود تھے۔ ابھی میر خلیفہ کو بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شہنشاہ بابر نے اپنی بیماری کی تکلیف کے دوران اُسے طلب کیا۔ جب وہ چلا گیا تو مہدی خواجہ شہ نشین میں ٹھہرا رہا اور مصنّف کے والد باادب اس کے پیچھے کھڑے رہے۔ میرے والد کی موجودگی سے بے خبر مہدی نے خلیفہ کے جانے کے بعد داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا 'اے بوڑھے! میں انشاءاللہ تیری کھال کھنچواؤں گا' ـــــ جب وہ مڑا تو اس کی نظر میرے والد پر پڑی اور برافروختہ ہو کر کہا 'او تاجک! زبان سرخ سر سبز می دہد برباد'۔ ("اکثر سرخ زبان نے سبز سر کو ہوا میں اُڑا دیا ہے"[1]) میرے والد نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے۔ وہ بسرعت تمام میر خلیفہ کے پاس پہنچے اور کہا ـــــ 'محمد ہمایوں مرزا اور اس کے بھائیوں جیسے ذہین شہزادوں کی موجودگی میں تم نے وفاداری کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور بادشاہت دوسرے خاندان میں منتقل کرنے کی خواہش رکھتے ہو۔ اب دیکھو کہ اس کا کیا انجام ہوگا'؟"

---

[1] یعنی زبان کی بے لگامی نے قابلِ تکریم سبز عمامہ پوش پیروکارانِ رسولؐ کو گردن زدنی کی سزا دلوائی ہے۔

اور جو کچھ سُنا تھا خلیفہ کو بتادیا۔ میرخلیفہ فوراً شہزادہ ہمایوں کو تلاش کرنے کے لیے روانہ ہوگیا اور ایک افسر کو شہنشاہ کے نام سے یہ حکم دے کر مہدی خواجہ کے پاس بھیجا کہ وہ خانہ نشین رہے۔ اس طرح سے ہمایوں کو تخت سے محروم کرنے کی کوشش ختم ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے خلیفہ نے کبھی اپنے آقا کے انتخاب کی مخالفت نہ کی۔ لیکن یہ بات غیر معنی خیز نہیں کہ ہمایوں کی تخت نشینی کے بعد بوڑھا وزیر جو عرصے سے ہندوستان کی سیاسیات پر چھایا ہوا تھا تاریخ (کے صفحات) سے بالکل غائب ہوجاتا ہے۔ جہاں تک میں واقف ہوں دورِ ہمایوں سے متعلق کسی بھی تاریخ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

بوڑھے شہنشاہ کی حالت سُرعت سے خراب تر ہوتی گئی۔ آنتوں میں اچانک شدید خرابی آگئی جس کا ڈاکٹر کوئی علاج نہ کرسکے اور انھوں نے کہا کہ سلطان ابراہیم کی ماں بوا بیگم نے پہلے جس زہر سے بابر کی جان لینے کی کوشش کی تھی انھوں نے اس کی ہی علامات پائی ہیں۔

مرنے والا شدید تکلیف میں تھا اور اپنے محبوب فرزند ہندال کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا لیکن اس کے حواس آخر تک صحیح تھے۔ ہمایوں کے پہنچنے کے دوسرے دن بابر نے محسوس کیا کہ موت نزدیک آگئی ہے، اُس نے امرا کو جمع کیا اور اپنے الفاظ میں خطاب کیا:

> "برسوں سے میرے دل میں تھا کہ اپنا تخت ہمایوں کے سپرد کردوں اور زرافشاں باغ میں گوشہ نشین ہوجاؤں۔ خدا کی عنایت سے بہ حالتِ صحت بجز اس خواہش کی تکمیل کے اور سب کچھ پایا —— اب جب کہ علالت سے بستر پر دراز ہوں میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ ہمایوں کو میرا جانشین تسلیم کرو اور اس کے وفادار رہو۔ یک دلی و یکسوئی سے اس کی طرف رہو اور مجھے خدا سے امید ہے کہ ہمایوں بھی لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔"

اس کے بعد وہ ہمایوں کی طرف مُڑا اور اُسے پیغام دیا جو رازدارانہ طور پر صرف اسی کی سماعت کے لیے تھا:

" ہمایوں! میں تمھیں اور تمھارے بھائیوں کو اور اپنے تمام اہل خاندان اور اپنی رعایا اور تمھاری رعایا کو خدا کے سپرد کرتا ہوں اور ان سب کو تمھاری امانت میں دیتا ہوں[1] میری وصیتی ہدایات کا لب لباب یہ ہے: اپنے بھائیوں کے خلاف کوئی بھی کام نہ کرنا خواہ وہ اس کے مستحق ہی کیوں نہ ہوں"[2]

ہمایوں نے پوری وفاداری سے اور خود اپنی طبیعت پر اذیت انگیز جبر کر کے اپنے باپ کی آخری وصیت کو پورا کیا حالانکہ اس کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ تین دن بعد بروز دو شنبہ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء[3] بابر کا انتقال ہوگیا۔ اس کی موت کو راز میں رکھا گیا کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ تخت خالی رہنے کے درمیانی عرصے میں کہیں فسادات نہ پھوٹ پڑیں ــــ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد ایک ہندوستانی امیر آرائش خاں نے کہا کہ اس طریقے سے کہیں وہی نتیجہ برآمد نہ ہو جس سے بچنے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ اس نے کہا:

" یہ اچھی بات نہیں ہے کہ موت کو پوشیدہ رکھا جائے کیوں کہ ہندوستان میں جب اس طرح کی آفات بادشاہوں پر پڑتی ہیں تو بازاری لوگوں کا طریقہ ہے کہ لوٹ مار مچا دیتے ہیں ــــ خدا نخواستہ مغلوں کو پتہ بھی نہ چلے اور وہ آکر گھروں اور رہائش گاہوں کو لوٹنے لگیں۔ بہتر

---

[1] اے۔ ایس۔ بیورج، ص ۱۰۸ و ۱۰۹

[2] اکبر نامہ، ترجمہ ہنری بیورج۔ اول، ص ۲۷۷

[3] اس تاریخ کے متعلق کچھ الجھن ہے جس کا پہلا سبب تو میرے خیال میں ارسکن ہے جو یہ کہتا ہے کہ ۵ جمادی الاول کو ۲۶ دسمبر تھی جب کہ درحقیقت ۲۵ دسمبر تھی۔ گلبدن ۵ جمادی الاول کہتی ہے لیکن اس کو دوشنبہ کا روز بتاتی ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مہینے کی تاریخ وہ بھول گئی ہو جب کہ ہفتہ کا دن ٹھیک سے یاد رہا ہو۔ فرشتہ بھی تقلید میں پیر کا دن ۵ جمادی الاول بتاتا ہے۔ دوسری طرف ابوالفضل صحیح طور سے ۶ جمادی الاول کہتا ہے اور المنکی کے متفرقات سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ (پاوے، ڈی کورٹیل۔ دوم، ص ۴۶۱)

یہ ہے کہ کسی کو سُرخ لباس پہنا کر ہاتھی پر بٹھایا جائے اور یہ اعلان کرنے
کو کہا جائے کہ شہنشاہ بابر درویش ہوگیا ہے اور اُس نے شہنشاہ ہمایوں
کو تخت دے دیا ہے۔"

بہت مناسب رہے گا اگر ہم بابر کا کتبۂ مزار ایک پُرانے مصنّف کے حسبِ ذیل
الفاظ سے تیار کریں[1]:

"۶ جمادی الاول ۹۳۶ھ (مطابق ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) کو جب کہ شہنشاہ
اپنے تیار کردہ باغ چار باغ[2] میں تھا وہ ایک سنگین بیماری میں مبتلا
ہوگیا اور اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ آٹھ
بُنیادی اوصاف کا مالک تھا ــــ اعلا قوتِ فیصلہ ــــ شریفانہ
اولوالعزمی ــــ فنِ فتح یابی ــــ فنِ حکمرانی ــــ اپنی رعایا کو خوش حالی
عطا کرنے کا فن ــــ خلقِ خُدا پر نرمی سے حکومت کرنے کی صلاحیت ــــ
سپاہیوں کا دل جیت لینے کی اہلیت ــــ اور انصاف سے محبت ــــ"

اس طرح ایک شریف بہادر ختم ہوگیا۔ خود اس کی خواہش کے مطابق اُسے کابل کی پہاڑی کے پہلو میں دفن کیا گیا جس کے نیچے وہ مرغزار اور چشمہ تھا جن سے اس کو بڑی والہانہ محبت تھی۔ اس نے جو کام انجام دیا وہ طویل مدّت تک قائم رہا اور شہنشاہیت کا جو تصوّر اس کے دل و دماغ پر اس قدر شدّت سے طاری تھا وہ آج بھی اس ملک میں جس کو اس نے فتح کیا تھا ایک زندہ قوّت کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] پارہ۔ الفنسٹی

[2] آگرہ کے نزدیک یہ باغ اب رام باغ کے نام سے موسوم ہے۔